آئینہ کہا رُخ کو، تو کچھ بھی نہ ثنا کی — صنعت وہ سکندر کی، یہ صنعت ہے خدا کی
واں خاک پہ صیقل، یہاں قدرت نے جِلا کی — طالع نے، کس آئینے کو، خوبی یہ عطا کی؟

ہر آئینے میں، چہرۂ اِنساں نظر آیا
اِس رُخ میں، جمالِ شہِ مرداں نظر آیا

بے مثل جبیں ہے، نگہہِ اہل یقیں میں — بس ایک یہ خورشید ہے، افلاک و زمیں میں
جلوہ ہے عجب، ابروؤں کا، قربِ جبیں میں — دو مچھلیاں ہیں، چشمۂ خورشید مبیں میں

مردم کو اشارہ ہے یہ ابرو، کا جبیں پر
ہیں دو مہِ نو جلوہ نُما، چرخِ بریں پر

بینی کو کہوں شمع، تو لَو اس کی کہاں ہے؟ — پرنور، بھووں پر، مجھے شعلے کا گماں ہے
دو شعلے اور اک شمع، یہ حیرت کا مکاں ہے — ہاں، زلفوں کے کوچوں سے، ہَوا تند رواں ہے

سمجھوں نہ بھویں، بس کہ ہوا کا جو گذر ہے
یہ شمع کی لَو، گاہ ادھر، گاہ اُدھر ہے

گر آنکھ کو نرگس کہوں، ہے عین حقارت — نرگس میں نہ پلکیں ہیں، نہ پُتلی، نہ بصارت
چہرے پہ، مہہِ عید کی بے جا ہے اشارت — وہ عید کا مژدہ ہے، یہ حیدر کی بشارت

ابرو، کہ مہ نو میں، نہ جنبش ہے، نہ ضو ہے
اک شب وہ مہ نو ہے، یہ ہر شب مہ نو ہے

تسبیح کناں، منہ میں زباں، آٹھ پہر ہے — گویا دہن غنچہ میں، برگِ گل تر ہے
کب غُنچہ و گل برگ میں، یہ نور مگر ہے — یہ بُرج میں خورشید کے، ماہی کا گذر ہے

تعریف میں ہونٹوں کی، جو لب تر ہوا میرا
دنیا ہی میں قابو، لبِ کوثر ہوا میرا

دانتوں کی لڑی سے، یہ لڑی عقل خداداد — وہ بات ٹھکانے کی کہوں اب، کہ رہے یاد
یہ گوہرِ عباس ہیں، پاک ان کی ہے بنیاد — عباس و نجف ایک ہیں، گنیے اگر اعداد

معدن کے شرف ہیں، یہ جواہر کے شرف ہیں
دنداں، دُرِ عباس ہیں، تو دُرِّ نجف ہیں

مشتاق ہوں اب عالم بالا کی مدد کا — در پیش ہے مضمون، علمدار کے قد کا
یہ ہے قدِ بالا، پسرِ شیرِ صمد کا — یا سایہ مجسم ہوا، اللہ اُحد کا

اس قد پہ، دو ابرو کی کشش، کیا کوئی جانے
کھینچے ہیں دو مد، ایک الف پر، یہ خدا نے

نے چرخ کے سو دورے، نہ اک رخش کا کاوا — دیتا ہے سدا، عمر رواں کو یہ بھلاوا
یہ قسم ہے، ترکیبِ عناصر کے علاوا — اللہ کی قدرت ہے، نہ چھل بل، نہ چھلاوا

چلتا ہے غضب چال، قدم شل ہے قضا کا
تو سن نہ کہوں، رنگ اڑا ہے یہ ہوا کا

ٹھہرے' تو فلک سب کو زمین پر نظر آئے   دوڑے' تو زمیں چرخِ بریں پر نظر آئے
شہبازِ ہوا کا' نہ کہیں پرَ نظر آئے   راکب ہی فقط' دامنِ زیں پر نظر آئے
اس راکب و مرکب کی' برابر جو ثنا کی
یہ علمِ خدا کا' وہ مشیّت ہے خدا کی

شوخی میں پری' حُسن میں ہے حورِ بہشتی   طوفان میں راکب کے لیے' نوح کی کشتی
کب ابلق دوراں میں ہے' یہ نیک سرشتی   یہ خیر ہے' وہ شر ہے' یہ خوبی ہے وہ زشتی
صحرا میں چمن' فصل بہاری ہے چمن میں
رہوار اصطبل میں ہے تلوار ہے رن میں

اس رخش کو عباس' اڑاتے ہوے آئے   کوسِ "لمنِ المُلک" بجاتے ہوئے آئے
تکبیر سے' سوتوں کو جگاتے ہوئے آئے   اک تیغِ نگہہ' سب پہ لگاتے ہوئے آئے
بے چلے کے' کھینچے ہوئے ابرو کی کماں کو
بے ہاتھ کے تانے ہوئے پلکوں کی سِناں کو

لکھا ہے مورخ نے کہ اک گبرِ دِلاور   ہفتم سے فروکش تھا' میانِ صفِ لشکر
روئیں تن و سنگیں دل و بد باطن و بدبَر   سر کر کے مہم' نیزوں پہ لایا تھا کئی سر
ہم راہِ شقی' فوج تھی' ڈنکا تھا' نشاں کا
جاگیر کے لینے کو' سوے شام رواں تھا

تقدیر جو رن میں شبِ ہفتم' اسے لائی   خلوت میں اُسے' بات عمر نے یہ سنائی
در پیش ہے' سادات سے ہم کو بھی لڑائی   واں پنج تنی چند ہیں' یاں ساری خدائی
اکبر کا' نہ قاسم کا' نہ شبیر کا ڈر ہے
دو لاکھ کو' اللہ کی شمشیر کا ڈر ہے

بولا وہ لرز کر' کہ ہوا مجھ بھی وِسواس   شمشیر خدا کون؟ عمر بولا کہ عباس
اس نے کہا' پھر فتح کی کیوں کر ہے تجھے آس؟   بولا کہ کئی روز سے اس شیر کو ہے پیاس
ہم بھی ہیں بہادر' نہیں ڈرتے ہیں کسی سے
پر روح نکلتی ہے تو عباسِ علی سے

تشریف' علمدارِ جری' رن میں جولایا   اسس گبر کو' چپکے سے عُمر نے یہ سنایا
اندیشہ تھا جس شیر کے آنے کا' وہ آیا   سراس نے پرے سے سُوئے عباس اٹھایا
دیکھا تو کہا' کانپ کے یہ' فوجِ وَغا سے
روباہ ہو ! لڑاتے ہو مجھے شیر خدا سے؟

مانا کہ خدا یہ نہیں' قدرت ہے خدا کی   مجھے میں ہے نرا زور' یہ قوت ہے خدا کی
کی خوبِ ضیافت مری' رحمت ہے خدا کی   سب نے کہا' تجھ پر بھی عنایت ہے خدا کی
جا عذر نہ کر' نام ہے مردوں کا اسی سے
تو دبدبہ و زور میں' کیا کم ہے کسی سے؟

بادل کی طرح سے وہ گرجتا ہوا نکلا　　جلدی میں سلح جنگ کے بجتا ہوا نکلا
ہر گام ' رہِ عمر کو تجتا ہوا نکلا　　اور سامنے نقارہ بھی بجتا ہوا نکلا
غالب تھا تہمتن کی طرح اہل جہاں پر
دھنستی تھی زمیں' پاؤں وہ رکھتا تھا جہاں پر

تیار کمر کس کے ہوا جنگ پہ خوں خوار　　اور پیک اجل آیا ' کہ ہے قبر بھی تیار
خنجر لیا منہ دیکھنے کو اور کبھی تلوار　　مثل ورمِ مرگ' چڑھا گھوڑے پہ اک بار
وہ رخش پہ ' یا دیودنی تختِ زری پر
غُل رن میں اٹھا ' کوہ چڑھا کبکِ دری پر

اس ہیئت و ہیبت سے وہ نخوت بسیر آیا　　آسیب کو بھی سایے سے اس کے حذر آیا
میداں میں قیامت کو بھی محشر نظر آیا　　گرد اپنے' لیے نیزوں پہ کشتوں کے سر آیا
زندہ ہی پڑے سَیر ہر اک صف سے بڑھے تھے
سر مردوں کے' نیزوں پہ' تماشے کو چڑھے تھے

سیدھا کبھی نیزے کو ہلایا ' کبھی آڑا　　پڑھ پڑھ کے رجز ' باغِ فصاحت کو اجاڑا
ظالم نے ' کئی پُشت کے مُردوں کو اُکھاڑا　　بولا ' مری ہیبت نے جگر شیروں کا پھاڑا
ہم پنجہ نہ رستم ہے ' نہ سہراب ہے میرا
مرحب بن عبدالقمر ' القاب ہے میرا

فتراک میں سر باندھتا ہوں' پیلِ دماں کا　　پنجہ میں سدا پھیرتا ہوں ' شیر ژیاں کا
نظارہ ذرا کیجیے ' ہر شاخِ سناں کا　　اس نیزے پہ وہ سر ہے فُلاں ابن فُلاں کا
جو جو تھے یلان کہن ' اس دورۂ نو میں
تن ان کے تہ خاک ہیں سَر میرے جلو میں

یاں سیفِ زباں ' سیف الٰہی نے علَم کی　　فرمایا مرے آگے یہ تقریر ستم کی؟
اب منہ سے کہا کچھ' تو زباں میں نے قلم کی　　کونین نے' گردن مرے دروازے پہ خم کی
طاقت ہے ہماری ' اسداللہ کی طاقت
پنجے میں ہمارے ہے ' یداللہ کی طاقت

خورشید درخشاں میں' بتا نور ہے کس کا؟　　کلمہ ورقِ ماہ پہ ' مسطور ہے کس کا؟
اور سورۂ والشمس میں مذکور ہے کس کا؟　　ذرّے کو کرے مہر' یہ مقدور ہے کس کا؟
یہ صاحبِ مقدور ' نبی اور علی ہیں
یا ہم ' کہ غلامِ خلف الصِدقِ نبی ہیں

دو' چاند کو کرتی ہے' اک انگشت ہماری　　ہے مہر نبوت سے ملی ' پُشت ہماری
ہے تیغ ' ظفر ' وقتِ زدوکشت ہماری　　سو گرز قضا ' ضربت یک مُشت ہماری
قدرت کے نیستان کے ہم شیر ہیں ' ظالم!
ہم شیر ہیں اور صاحبِ شمشیر ہیں ' ظالم!

احمد ہے چچا میرا ' پدر حیدرِ صفدر وہ کل کا پیمبر ہے ' یہ کونین کا رہبر
اور مادرِ زینب کی ہے لونڈی ' مری مادر بھائی مرا اک عون ' دو عبداللہ و جعفر
اور شبّر و شبیّر ہیں سردار ہمارے
ہم ان کے غلام اور وہ مختار ہمارے

قاسم کا عزادار ہوں ' اکبر کا میں غم خوار لشکر کا علم دار ہوں ' سرور کا چلو دار
میں کرتا ہوں پردہ ' تو حرم ہوتے ہیں اسوار تھا شب کو نگہبانِ خیام شہِ ابرار
اب تازہ یہ بخشش ہے خدائے ازلی کی
سقا بھی بنا اس کا جو پوتی ہے علی کی

اس کے قدم پاک کا فِدیہ ہے ' سر اپنا قربان کیا جس پہ ' نبی نے پسر اپنا
نذرِ سرِ اکبر ہے دل اپنا جگر اپنا بیت الشرفِ شاہ پہ ' صدقے ہے گھر اپنا
مشہور جو عباس زمانے کا شرف ہے
شبیر کی نعلین اٹھانے کا شرف ہے

شاہوں کا چراغ ' آتے ہی گُل کردیا ہم نے ہر جا عمل ختمِ رُسُل کردیا ہم نے
خندق پہ درِ قلعہ کو پل کردیا ہم نے اک جزو تھا کلمہ! اسے کل کردیا ہم نے
دھوکا نہ ہو ' یہ سب شرفِ شیرِ خدا ہیں
پھر وہ ہیں جدا ہم سے ' نہ ہم ان سے جدا ہیں

ناری کو ' بہشتی کے رجز پر ' حسد آیا یوں جل کے ' پئے حملہ ' وہ ملعونِ بد آیا
گویا کہ سقر سے ' عُمرِ عبدود آیا اور لرزے میں مَرحَب بھی میانِ لحد آیا
نفریں کی خدا نے اُسے ' تحسیں کی عمر نے
مُجرا کیا عباس کو یاں فتح و ظفر نے

شبیر کو بڑھ بڑھ کے نقیبوں نے پکارا لو ٹوٹتا ہے دستِ زبردست تمہارا
ہے مرحَب عبدالقمر اب معرکہ آرا شبیر! یقیں جانو کہ عباس کو مارا
یہ گُرگ ' وہ یوسف ' یہ خزاں ہے وہ چمن ہے
وہ چاند ' یہ عقرب ہے ' وہ سورج ' یہ گہن ہے

اس شور نے تڑپا دیا حضرت کے جگر کو اکبر سے کہا ' جاؤ تو عمو کی خبر کو
اکبر بڑھے اور مڑ کے پکارے یہ پدر کو گھیرا ہے کئی نحس ستاروں نے قمر کو
اک فوج نئی گرد علمدار ہے رن میں
لو! ماہِ بنی ہاشمی آتا ہے گہن میں

غل ہے کہ دلِ آلِ عبا توڑے گا مَرحَب اب بازوے شاہِ شُہدا توڑے گا مَرحَب
بندِ کمرِ شیرِ خدا توڑے گا مَرحَب گوہر کو ' تہِ سنگِ جفا توڑے گا مَرحَب
مَرحَب کا ' نہ کچھ اس کی توانائی کا ڈر ہے
فدوی کو چچا جان کی تنہائی کا ڈر ہے

شہ نے کہا ' کیا روحِ علی آئی نہ ہوگی؟ نانا نے مرے ' کیا یہ خبر پائی نہ ہوگی؟
کیا فاطمہ فردوس میں گھبرائی نہ ہوگی؟ سر ننگے وہ تشریف یہاں لائی نہ ہوگی؟
بندوں پہ عیاں ' زورِ خدا کرتے ہیں عباس
پیارے مرے ' دیکھو تو کہ کیا کرتے ہیں عباس

اس عرصے میں حملے کیے مرحب نے وہاں چار پر ایک بھی اس پنج تنی پر نہ چلا وار
مانند دل و چشم ' ہر اک عضو تھا ' ہُشیار آری ہوئی تلوار ' مخالف ہوا ناچار
جب تیغ کو ' جھنجھلا کے رُخِ پاک سے کھینچا
تلوار نے ' انگلی سے الف خاک پہ کھینچا

غازی نے کہا بس! اسی فن پر تھا تجھے ناز! سیکھا نہ ید اللّٰہیوں سے ضرب کا انداز
پھر کھینچی اس انداز سے تیغِ شرر انداز جو میان کے بھی منہ سے ذرا نکلی نہ آواز
یاں خوف سے قالب کو کیا میان نے خالی
واں قالبِ اعدا کو کیا جان نے خالی

یہ تیغ سراپا جو برہنہ نظر آئی پھر جامۂ تن میں نہ کوئی روح سمائی
ہستی نے کیا توبہ ' قضا بولی دہائی انصاف پکارا ' کہ ہے قبضے میں خدائی
لو ' فتح مجسم کا وہ سر جیب سے نکلا
نصرت کے فلک کا مہِ نو غیب سے نکلا

بجلی گری بجلی پہ ' اجل ڈر کے اجل پر اک زلزلہ طاری ہوا ' گردوں کے محل پر
سیارے ہٹے ' کرکے نظر تیغ کے پھل پر خورشید تھا مریخ پہ ' مریخ زُحل پر
یہ ہَول دیا ' تیغِ درخشاں کی چمک نے
جو تاروں کے دانتوں سے زمیں پکڑی فلک نے

مَرحَب سے مخاطب ہوئے عباسِ دلاور شمشیر کے مانند ' سراپا ہوں میں جوہر
ممکن ہے کہ اک ضرب میں ' دو ہو تُو ' سراسر پر اس سے عیاں ہوں گے ' نہ جوہر مرے تجھ پر
لے ' روک مرے وار ' ترے پاس سپر ہے
زخمی نہ کروں گا ' ابھی اظہارِ ہنر ہے

کاندھے پہ سپر لے کے ' مقابل ہوا دشمن بتلانے لگے تیغ سے ' یہ ضرب کا ہر فن
یہ سینہ ' یہ بازو ' یہ کمر اور یہ گردن یہ خود ' یہ چار آئینہ ' یہ ڈھال ' یہ جوشن
کس وار کو وہ روکتا ' تلوار کہاں تھی!
آنکھوں میں تو پھرتی تھی ' نگاہوں سے نہاں تھی

مرحب نے نہ پھر ڈھال ' نہ تلوار سنبھالی اک ہاتھ سے سر ' ایک سے دستار سنبھالی
ظالم نے سناں ' غصے سے اک بار سنبھالی اس شیر نے شمشیرِ شرر بار سنبھالی
تانی جو سناں اس نے علمدار کے اوپر
نیزہ یہ اڑا لے گئے ' تلوار کے اوپر

اس تیغ نے سرکش کے جو ترکش میں کیا گھر — غُل تھا کہ نیستاں میں گری برق چمک کر
پر تیروں کے کٹ کٹ کے اڑے مثل کبوتر — مرحب ہوا مضطر، صفتِ طائرِ بے پر
بڑھ کر کہا غازی نے بتا کس کی ظفر ہے؟
اب مرگ ہے اور تو ہے، یہ تیغ اور یہ سر ہے

خنجر کو جو کاٹا تو وہ ٹھہری نہ سپر پر — ٹھہری نہ سپر پر، تو وہ سیدھی گئی سر پر
سیدھی گئی سر پر، تو وہ تھی صدر و کمر پر — تھی صدر و کمر پر، تو وہ تھی قلب و جگر پر
تھی قلب و جگر پر، تو وہ تھی دامنِ زیں پر
تھی دامنِ زیں پر، تو وہ راکب تھا زمیں پر

ایماں نے اُچھل کر کہا، وہ کُفر کو مارا — قدرت نے پکارا، کہ یہ ہے زور ہمارا
حیدر سے نبی بولے، یہ ہے فخر تمہارا — حیدر نے کہا، یہ مری پُتلی کا ہے تارا
پروانۂ شمعِ رُخِ تاباں ہوئیں زہرا
محسن کو لیے گود میں، قربان ہوئیں زہرا

ہنگامہ ہوا گرم، یہ ناری جو ہوا سرد — واں فوج نے لی باگ، بڑھا یاں یہ جواں مرد
ٹاپوں کی صدا سے، سرِ قاروں میں ہوا درد — رنگِ رخِ اعدا کی طرح اڑنے لگی گرد
قاروں کا زرِ گنجِ نہانی نکل آیا
یہ خاک اڑی رن سے کہ پانی نکل آیا

جو زندہ تھے، ''العظمۃ للّٰہ'' پکارے — سر مُردوں کے نیزوں پہ جو تھے، واہ پکارے
ڈر کر عمرِ سعد کو گمراہ پکارے — خوش ہو کے علمدار سوے شاہ پکارے
یاں تو ہوا یا حضرتِ شبیر کا نعرہ
شبیر نے ہنس کر کیا تکبیر کا نعرہ

پردے کے قریب آ کے بہن شہہ کی پکاری — دشمن پہ ہوئی فتح مبارک ہو، میں واری
اب کہتی ہوں، میں دیکھتی تھی جنگ یہ ساری — عباس کی اک ضرب میں ٹھنڈا ہوا ناری
مرحب کو تو خیبر میں یداللہ نے مارا
ہم نام کو ابن اسداللہ نے مارا

میداں میں علمدار کے جانے کے میں صدقے — اس فاقے میں تلوار لگانے کے میں صدقے
باہم علم و مشک اٹھانے کے میں صدقے — اس پیاس میں، اک بوند نہ پانے کے میں صدقے
سقّا بنا پیاسوں کا مروّت کے تصدّق
بے سر کیا شہہ زوروں کو، قوت کے تصدّق

تم دونوں کا، ہر وقت نگہبان خدا ہو — دیکھے جو بری آنکھ سے، غارت ہو، فنا ہو
دونوں کی بلا لے کے یہ ماں جائی فدا ہو — رو کر کہا حضرت نے بہن دیکھیے کیا ہو؟
منہ چاند سا مجھ کو جو دکھائیں تو میں جانوں
دریا سے سلامت جو پھر آئیں تو میں جانوں

زینب سے بہ حسرت یہ بیاں کرتے تھے مولا   ناگاہ سکینہ نے سنا فتح کا مُژدا
چلائی، میں صدقے ترے، اچھی مری فِضّہ   جا جلد بلائیں مرے عمو کی، تو لے آ!
دکھ پیاس کا کہہ کر، انہیں مدہوش نہ کرنا
پر یاد دلانا، کہ فراموش نہ کرنا

لینے کو بلا میں گئی فِضّہ سوے جنگاہ   عباس نے آتے ہوئے دیکھا اُسے ناگاہ
چلائے کہ پھر جا! میں ہُوا آنے سے آگاہ   کہہ دینا سکینہ سے، ہمیں یاد ہے واللہ!
دل پیاس سے بی بی کا ہوا جاتا ہے پانی
لے کر ترے بابا کا غلام آتا ہے پانی

دریا کو چلے ابر صفت، ساتھ لیے برق   مرحب کے شریکوں کا جدا کرتے ہوئے فرق
سردار میں اور فوج میں باقی نہ رہا فرق   مرحب کی طرح سب چہ ہب ہب میں ہوئے غرق
تلوار کی اک موج نے طوفان اٹھایا
طوفان نے سر پر وہ بیابان اٹھایا

پانی ہوئی ہر موج زرہ، فوج کے تن میں   ملبوس میں زندے تھے، کہ مردے تھے کفن میں
خنجر کی زبانوں کو قلم کرکے دہن میں   اک تیغ سے تلواروں کو آری کیا رن میں
حیدر کا اسد، قُلزم لشکر میں در آیا
اُمڈے ہوئے بادل کی طرح نہر پر آیا

دریا کے نگہبان بڑھے ہونے کو چَو رنگ   پہنے ہوئے کی مچھلی طرح بر میں زرہ تنگ
کھینچے ہوئے موجوں کی طرح خنجر بے رنگ   سقّے نے کہا، پانی پہ جائز ہے کہاں جنگ
دریا کے نگہبان ہو، پر غفلتِ دیں ہے
مانند حُباب، آنکھ میں بینائی نہیں ہے

پانی مجھے اک مشک ہے، اس نہر سے درکار   بھر لینے دو مجھے کو، نہ کرو حجّت و تکرار
چلّائے ستم گر، ہے گذر نہر پر دشوار   غازی نے کہا، ہاں یہ ارادہ ہے تو ہُشیار!
لو! سیل کو اور برقِ شرر بار کو روکو
رہوار کو روکو، مری تلوار کو روکو

یہ کہہ کے کیا، اسپ سُبک تاز کو مہمیز   بجلی کی طرح کوند کے چمکا فَرس تیز
اشرار کے سر پر ہوا نعلوں سے شرر ریز   سیلاب فنا تھا کہ وہ طوفان بلا خیز
جھپکی پلک، اس رخش کو جب قہر میں دیکھا
پھر آنکھ کھلی جب، تو رواں نہر میں دیکھا

دریا میں ہوا غل کہ وہ دُرِ نجف آیا   الیاس و خضر بولے، ہمارا شرف آیا
عباس، شہنشاہِ نجف کا خلف آیا   پابوسی کو، موتی لیے دستِ صدف آیا
یاد آگئی پیاسوں کی جو حیدر کے خلف کو
دل خون ہوا، دیکھ کے دریا کی طرف کو

سوکھے ہوئے مشکیزے کا پھر کھولا دہانہ   بھرنے لگا، خم ہو کے وہ سر تاجِ زمانہ
اعدا نے کیا دور سے تیروں کا نشانہ   اور چوم لیا روحِ یداللہ نے شانہ
فرمایا کہ کیا کیا مجھے خوش کرتے ہو بیٹا!
پانی مری پوتی کے لیے بھرتے ہو بیٹا!

دریا سے جو نکلا اسداللہ کا جانی   تھا شور کہ وہ شیر لیے جاتا تھا پانی
پھر راہ میں حائل ہوئے سب ظلم کے بانی   سقائے سکینہ کی یہ کی مرتبہ دانی
قبریں نبی و حیدر و زہرا کی ہلا دیں
برچھوں کی جو نوکیں تھیں کلیجے سے ملا دیں

وہ کون سا تھا تیر، جو دل پر نہ لگایا   مشکیزے کے پانی سے سوا خون بہایا
یہ نرغہ تھا جو شمر نے حیلے سے سنایا   عباس بچو! غول کمیں گاہ سے آیا
مُڑ کر جو نظر کی، خلفِ شیرِ خدا نے
شانوں کو تہِ تیغ کیا، اہلِ جفا نے

لکھا ہے کہ اک نخلِ رُطب تھا سر میداں   ابن وَرقہ زَید لعیں اس میں تھا پنہاں
پہنچا جو وہاں، سروِ روانِ شہ مرداں   جو شانہ تھا مشک و علم و تیغ کے شایاں
وار اس پہ کیا زید نے شمشیر اجل سے
یہ پھولی پھلی شاخ، کٹی تیغ کے پھل سے

مشک و علم و تیغ کو بائیں پہ سنبھالا   اور جلد چلا عاشقِ روئے شہ والا
پر ابن طفیل آگے بڑھا تان کے بھالا   برچھے کی انی سے تو کیا دل تہ و بالا
اور تیغ کی ضربت سے جگر، شاہ کا کاٹا
وہ ہاتھ بھی فرزندِ یداللہ کا کاٹا

سقّے نے کٹی بانہوں، پہ مشکیزے کو رکھ کر   مانند زباں منہ میں لیا تسمہ سراسر
ناگاہ کئی تیر لگے آکے برابر   اک مشک پہ، اک آنکھ پہ ایک اور دہن پر
مشکیزے سے پانی بہا اور خوں بہا تن سے
عباس گرے گھوڑے سے اور مشک دہن سے

گر کر، لبِ زخمی سے علمدار پکارا   کہہ دے کوئی پیاسوں سے کہ سقا گیا مارا
سن لی یہ صدا شاہ شہیداں نے قضارا   زینب سے کہا، لو! نہ رہا کوئی ہمارا
اصغر کا گلا چھد گیا، اکبر کا جگر بھی
بازو بھی مرے ٹوٹ گئے اور کمر بھی

زینب نے کہا، سچ ہے تمھیں مرگئے بھائی   سب کنبے کو عبّاس فنا کر گئے بھائی
آفاق سے اب حمزہ و حیدر گئے بھائی   ہم مجلسِ حاکم میں کھلے سر گئے بھائی
میں جان چکی، قید مصیبت میں پڑی ہوں
اب گھر میں نہیں بلوے میں سر ننگے کھڑی ہوں

ناگاہ صدا آئی ' کہ' اے فاطمہ کے لال!' جلد آؤ' کہ لاشہ مرا اب ہوتا ہے پامال
زینب نے کہا ' زندہ ہیں عباسِ خوش اقبال تم جاؤ' میں یاں بہر شفا کھولتی ہوں بال
شہ بولے ' لبِ گور سکینہ کا چچا ہے
اس فوج کا مارا ہوا ' کوئی بھی بچا ہے

اکبر کے سہارے سے ' چلے نہر پہ آقا گہ ہوش تھا ' گہ غش ' کبھی سکتہ ' کبھی نوحا
لکھا ہے کہ ٹکڑے ہوئے یوں سقّے کے اعضا اک ہاتھ تو مقتل میں ملا ' اک لبِ دریا
زہرا کا پسر ' رن میں جو زیرِ شجر آیا
اک ہاتھ تڑپتا ہوا شہ کو نظر آیا

گر کر شہِ والا نے یہ اکبر سے کہی بات اے لال! اٹھالو' مرے بازو کا ہے یہ ہاتھ
یہ ہاتھ رکھے سینے پہ' وہ وارثِ سادات پہنچا جو سرِ لاشۂ عباسِ خوش اوقات
ہیہات ' قلم تیغوں سے شانے نظر آئے
سر ننگے ' یداللہ سرہانے نظر آئے

بے ساختہ ' ماتھے پہ رکھا شاہ نے ماتھا لب رکھ کے لبوں پر کہا ' وا حسرت ودردا!
یہ تیر ' یہ آنکھ اور یہ نیزہ یہ کلیجا 'واقرۃ عینا' مرے 'وا بہجۃ قلبا!'
کچھ منہ سے تو بولو' مرے غم خوار برادر!
عباس ' ابوالفضل ' علم دار برادر!

اس جاں شکنی میں ' جو سنا شیونِ مولا تعظیم کی نیت میں کٹے شانوں کو ٹیکا
پھر پاؤں سمیٹے کہ نہ ہوں پائمتی آقا شہ بولے ' نہ تکلیف کروائے مرے شیدا!
کی عرض میں پھیلائے ہوئے پاؤں پڑا ہوں
حضرت نے یہ فرمایا ' سرہانے میں کھڑا ہوں

یاں تھی یہ قیامت ' وہاں خیمے میں یہ محشر دَر پر تھیں' نبی زادیاں سب کھولے ہوئے سر
تشویش تھی' کیوں لاش کو لے آئے نہ سرور عباس کا فرزند ' سراسیمہ تھا باہر
تن رعشے میں ' خورشید درخشاں کی طرح تھا
دل ٹکڑے' یتیموں کے گریباں کی طرح تھا

یہ غُل تھا ' جو مولا لیے مشک و علم آئے خیمے میں کمر پکڑے ' امام اُمم آئے
اور گردِ علم ' بال بکھیرے حرم آئے زینب سے کہا شہ نے بہن! لُٹ کے ہم آئے
بھائی کے یتیموں کی پرستار ہو زینب!
تم مہتمِ سوگِ علم دار ہو زینب!

زینب نے کہا ہیں مری قسمت کے یہی کام دینے لگی ماتم کے سیہ جوڑے وہ ناکام
فضّہ سے کہا ' سوگ کا کرتی ہوں سر انجام ٹھنڈا ہوا ہے ہے ! علم لشکرِ اسلام
زہرا کا لباس اپنے لیے چھانٹ رہی ہوں
عباس کا ملبوسِ عزا بانٹ رہی ہوں

پھر زیر علم فرش سیہ لا کے بچھایا　　اور بیوۂ عباس کو خود لاکے بٹھایا
جتنے تھے سیہ پوش ' انہیں روکے سنایا　　قسمت نے جواں بھائی کا بھی داغ دکھایا
ناسور نہ کس طرح سے ہو' دل میں جگر میں
ماتم ہے علم دار کا ' سردار کے گھر میں

خاموش دبیر اب کہ نہیں نظم کا یارا　　مدّاح کا دِل خنجر غم سے ہے دوپارا
کافی پئے بخشش ' یہ وسیلہ ہے ہمارا　　اک ہفتے میں تصنیف کیا مرثیہ سارا
تجھ پر کرمِ خاص ہے' یہ حق کے ولی کا
یہ فیض ہے سب مدح جگر بندِ علی کا

11.6 تجزیہ

دبیر کا شامل نصاب مرثیہ جس کا مطلع ہے

''کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے''

حضرت عباس کی شہادت کے بیان میں ہے ۔ عام مسلمان جانتے ہیں کہ حضرت عباس امام حسین کے مختلف البطن بھائی تھے ۔ نہایت جری' بے خوف اور امام حسین پر جان چھڑکنے والے تھے ۔ اسی سبب روز عاشور اس چھوٹے سے لشکر کی علم داری کا عہدہ انہیں کے تفویض ہوا تھا۔ واقعہ کربلا میں مذکور ہے کہ وہ جنگ کرنے کے ارادے سے دشمن کی طرف نہیں گئے تھے بلکہ اپنی پیاسی بھتیجی سکینہ کی پیاس بجھانے کے لیے فرات سے پانی لینے گئے تھے ۔ فرات پر یزیدی فوجوں کا سخت پہرہ تھا لیکن حضرت عباس نہ صرف فوجی صفوں کو توڑ کر فرات تک پہنچے بلکہ مشکیزہ میں پانی بھی بھر لیا ۔ لیکن واپسی میں فوجوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا ۔ پانی لانے کی تگ و دو میں جان کی پروا نہ کی ۔ نوفل بن ارزق نے پہلے دونوں بازو قلم کیے پھر سر پر گرز پڑا جس سے شہادت واقع ہوئی ۔ بازو قلم ہوئے تو انہوں نے مشک کو دانتوں میں دبالیا لیکن دشمن نے مشک کو بھی تیروں سے چھلنی کر کے سارا پانی بہادیا ۔

موضوع کی مناسبت سے اس مرثیے میں پانی اور پیاس کی شدت کا ذکر کئی طرح سے ہوا ہے۔ تمام مرثیہ نگاروں نے واقعے کو اسی ترتیب سے لکھا ہے مگر دبیر کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اس واقعے کی ایسی مرقع نگاری کی ہے کہ منظر آنکھوں میں گھومنے لگتا ہے ۔ تمہید یا چہرہ کا پہلا بند ہی یہ بتا رہا ہے کہ کسی جری یا شجاع شخص کا ذکر ہے :

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے　　رستم کا جگر زیرِ کفن کانپ رہا ہے
ہر قصر سلاطین زمن کانپ رہا ہے　　سب ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

چہرہ کے دس بند ہیں جن میں دبیر کا مخصوص رنگ صاف نظر آتا ہے۔ زورِ بیان کے ساتھ ساتھ صنعتوں کا حسن' زبان کے نکات اور تلمیحات کا تسلسل صاف نظر آتا ہے۔ جس طرح قصیدے میں تشبیب کے اشعار لکھنے میں قصیدہ گو پر کسی موضوع کی پابندی لازم نہیں' اسی طرح مرثیے میں چہرہ یا تمہید کے بند میں مرثیہ نگار کو اپنی جولانی طبع دکھانے کا پورا اختیار ہوتا ہے۔ اسی لیے چہرہ اور تشبیب کے اشعار زبان کے لحاظ سے بہت اہم ہوتے ہیں ۔ مرثیے کا موضوع چوں کہ حضرت عباس کی شہادت ہے اس لیے پورا مرثیہ جرأت اور شجاعت کا نمونہ ہے ۔ ان بندوں کو پڑھتے ہی یہ اندازہ جاتا ہے کہ یہ حضرت عباس کے حال کا مرثیہ ہے ۔

سراپا میں بھی ان کا نام لیے بغیر ایسی تصویر کھینچی گئی ہے کہ ذہن خود بخود حضرت عباس کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ یہاں بھی تشبیہ و استعارے کے نمونے کثرت سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بیسویں بند میں حضرت عباس کا ذکر کیا گیا ہے۔

دانتوں کی لڑی سے یہ لڑی اپنے خداداد — وہ بات ٹھکانے کی کہوں اب کہ رہے یاد
یہ گوہر عباس ہیں، بات ان کی ہے بنیاد — عباس و نجف ایک ہیں گنیے اگر اعداد
معدن کے شرف ہیں یہ جواہر کے شرف ہیں
دنداں، دُرِ عباس ہیں، تو درِّ نجف ہیں

اس کے بعد گھوڑے کی تعریف کے تین بند ہیں اور اسی رخش پر سوار ہوکر حضرت عباس میدان کی طرف جاتے ہیں۔

میدان جنگ میں ان کی آمد کے بھی وہی تیور ہیں جو ان کے چہرہ اور سراپا میں نظر آتے ہیں۔ مرثیہ کے مختلف اجزا میں اس کا لہجہ اور تیور ایک سا ہے۔ میدان میں ان کی آمد بھی باوقار اور پرشکوہ ہے:

اس رخش کو عباس اڑاتے ہوئے آئے — کوس لمنِ الملک بجاتے ہوئے آئے
تکبیر سے سوتوں کو جگاتے ہوئے آئے — اک تیغ نگہ سب پہ لگاتے ہوئے آئے
بے چلّے کے کھینچتے ہوئے ابرو کی کماں کو
بے ہاتھ کے تانے ہوئے پلکوں کی سناں کو

آمد پر ہیرو کی شان میں سات بند ہیں جس میں حضرت عباس کی پرشکوہ آمد، دشمن کا خوف زدہ ہونا اور فوجی تیاریوں کا ذکر ہے۔ رجز کے سات بند ہیں جو شجاعت، ہمت، جرأت اور بے خوفی کا آئینہ ہیں۔ حضرت علی کی جلالت ان کی زبان سے ادا ہورہی ہے۔

اب منہ سے کہا کچھ تو زباں میں نے قلم کی — کونین نے گردن مرے دروازے پہ خم کی
.....
دو چاند کو کرتی ہے اک انگشت ہماری — ہے مہر نبوت سے ملی پشت ہماری
.....
احمد ہے چچا میرا، پدر حیدر صفدر — وہ گل کا پیمبر ہے، یہ کونین کا رہبر
اور مادرِ زینب کی ہے لونڈی مری مادر — بھائی مرا اک عون دو عبداللہ و جعفر
اور شبّر و شبّیر ہیں سردار ہمارے
ہم ان کے غلام اور وہ مختار ہمارے

کربلا کی جنگ میں دشمنوں کی طرف سے ہر طرح کے مہلک ہتھیار استعمال ہوئے مگر حسینی فوج کا صرف ایک فرد جنگ کرنے جاتا تھا اور مرثیۂ شہادت پر فائز ہوتا تھا۔ اس چھوٹے سے گروہ نے ساری جنگ صرف تلوار سے لڑی اور مرثیہ نگاروں نے تلوار کی تعریف اور جنگ کی ہیبت میں بلا مبالغہ ہزاروں صفحات تحریر کیے۔ دبیر کے ہر مرثیے میں تلوار سے جنگ کا بیاں ہزار طرح سے ملتا ہے۔ مرثیے میں جس جری کا ذکر ہے ظاہر ہے اس کی جنگ بھی ویسی ہی شدید اور گھمسان ہوگی۔ جنگ کی ہیبت زمین ہی پر طاری نہیں تھی بلکہ آسمان بھی دہشت میں تھا:

بجلی گری بجلی پہ، اجل ڈر کے اجل پر — اک زلزلہ طاری ہوا گردوں کے محل پر
سیارے ہٹے، کرکے نظر تیغ کے پھل پر — خورشید تھا مریخ پر، مریخ زحل پر
.....
یہ تیغ، سراپا جو برہنہ نظر آئی — پھر جامۂ تن میں نہ کوئی روح سمائی
.....

کاندھے پہ سپر لے کے مقابل ہوا دشمن　　بتلانے لگے تیغ سے یہ ضرب کا ہر فن
یہ سینہ، یہ بازو، یہ کمر اور یہ گردن　　یہ خود، یہ چار آئینہ، یہ ڈھال، پہ جوشن
کس وار کو وہ روکتا، تلوار کہاں تھی
آنکھوں میں تو پھرتی تھی نگاہوں سے نہاں تھی

جنگ کی شدت نے دشمن کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا۔ حضرت عباس نے للکارا:

پانی مجھے اک مشک ہے اس نہر سے درکار　　بھر لینے دو مجھ کو نہ کرو حجت و تکرار

لیکن دشمن راضی نہ ہوا اور جنگ کی دعوت دے ڈالی۔ حضرت عباس فرماتے ہیں:

لو! سیل کو اور برق شرر بار کو روکو!　　رہوار کو روکو، مری تلوار کو روکو!

یہ کہتے ہوئے دشمنوں پر حملہ کردیا۔ جنگ کرتے ہوئے گھاٹ پر پہنچے اور مشکیزہ میں پانی بھرلیا۔ لیکن دشمن نے گھیر کر نہ صرف ان کے ہاتھ قلم کیے بلکہ تیروں کے وار سے مشکیزہ بھی چھلنی کردیا۔ جنگ کے 31 بند ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرثیہ نگاروں نے رزمیہ عناصر سے مرثیے کو مالا مال کیا ہے۔

شہادت کے صرف چار بند ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو:۔

سقے نے کئی بانہوں پہ مشکیزے کو رکھ کر　　مانند زباں منہ میں لیا تسمہ سراسر
ناگاہ کئی تیر لگے آکے برابر　　اک مشک پہ اک آنکھ پہ اور ایک دہن پر
مشکیزہ سے پانی بہا اور خوں بہا تن سے　　عباس گرے گھوڑے سے اور مشک دہن سے
.....
گر کر لب زخمی سے علمدار پکارا　　کہہ دے کوئی پیاسوں سے کہ سقا گیا مارا

اس کے بعد بین ہیں جس میں حضرت امام حسین کے علاوہ خواتین میں حضرت زینب کے بین شامل ہیں جنھوں نے ہر مرنے والے کو پُرسا دیا۔ اس موقع پر مرثیے کی زبان صاف اور سادہ ہے اور بین و بکا کے کلمات فطری ہیں مثلاً

تم مہتمم سوگِ علم دار ہو زینب!

زینب نے کہا ہیں مری قسمت کے یہی کام　　دینے لگی ماتم کے سیہ جوڑے وہ ناکام
فضہ سے کہا، سوگ کا کرتی ہوں سر انجام　　ٹھنڈا ہوا ہے ہے! علم لشکرِ اسلام
زہرا کا لباس اپنے لیے چھانٹ رہی ہوں
عباس کا ملبوس عزا بانٹ رہی ہوں

ایک بند تخلص کا ہے اور یہیں مرثیے کا اختتام ہوتا ہے۔

11.6.1 جذبات نگاری

دبیر کے مرثیے جذبات نگاری میں بھی کسی طرح کمتر نہیں۔ رخصت کا منظر ہو تو جذبات کا اظہار لازمی ہے۔ گود کے پالے میدان جنگ میں شہید ہوں تو جذبات کیسے نہ امڈ آئیں گے۔ جو جینے کا سہارا تھے ان کی لاشیں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر خون سے تر زمین پر پڑی ہوں تو بین کی

تڑپ کیا ہوگی ۔ ان موقعوں پر اظہار جذبات کی ایسی مثالیں ہزاروں بندوں کی تعداد میں بکھری پڑی ہیں ۔ جن کی مثال پورا اردو ادب نہیں پیش کرسکتا ۔ حضرت عباس کی لاش خیمے میں آتی ہے تو فرش عزا کا دل خراش منظر دبیر پیش کرتے ہیں :

پھر زیر علم فرشِ سیہ لا کے بچھایا　　اور بیوۂ عباس کو خود لا کے بٹھایا
جتنے تھے سیہ پوش انہیں رو کے سنایا　　قسمت نے جواں بھائی کا بھی داغ دکھایا
ناسور نہ کس طرح سے ہو، دل میں جگر میں
ماتم ہے علم دار کا ، سردار کے گھر میں

یہ صف ماتم صرف لکھنؤ کی نہیں بلکہ ہر قوم اور ہر گھر کا منظر پیش کرتی ہے ۔

11.6.2 کردار نگاری

مرثیے کے کردار خصوصاً حسینی فوج کے کردار ، کامل انسانوں کے کردار ہیں ، جن کی ذات ہر طرح کی کمزوریوں سے پاک صاف ہے ۔ اس کے برعکس یزیدی فوج کے کردار ، ظلم شعار ، بدکردار ، دہشت گرد ، اور کبر و نخوت کا نمونہ ہیں ۔ ان کرداروں کی پہچان میں کبھی دھوکہ نہیں ہوسکتا کیوں کہ یہ رات اور دن کی طرح تاریک اور روشن ہیں ۔ شاملِ نصاب مرثیے میں حضرت عباس کے علاوہ امام حسینؑ ، حضرت زینب ، حضرت سکینہ ، اور فضہ نمایاں کردار ہیں ۔ دشمن فوج کے کرداروں میں مرحب ، عمر ابن سعد ، ابن ورقہ کے کردار نمایاں ہیں ۔ ابن ورقہ زید ایک پیڑ کے پیچھے چھپ گیا تھا اور جب حضرت عباس وہاں پہنچے تو اس نے حملہ کردیا

وار اس پہ کیا زید نے شمشیر اجل سے　　یہ پھولی پھلی شاخ کٹی تیغ کے پھل سے

11.6.3 رزم نگاری

رزم نگاری مرثیے کا لازمی جز ہے ۔ دبیر نے مختلف مرثیوں میں رزم کو مختلف انداز سے پیش کیا ہے ۔ مرثیے میں سب سے زیادہ بند جنگ کے بیان میں نظم کیے جاتے ہیں ۔ مرثیے میں یہی وہ مقام ہے جس سے قوت ، ہمت ، جرأت ، شجاعت ، استقامت اور حق پرستی کے نمونے پیش کرنے کا موقع ملتا ہے ۔ حسینی فوج کے کردار اپنے اصولوں کی حفاظت کے لیے جان جیسی عزیز شے کو قربان کردینا بھی فخر و سعادت کی نشانی سمجھتے ہیں ۔ پیشِ نظر مرثیے میں بھی حضرت عباس کی جنگ سے متعلق سب سے زیادہ بند نظم کیے گئے ہیں ۔ جنگ میں ہیرو کی تعریف کے ساتھ ساتھ تلوار ، گھوڑے ، حملے اور دفاع وغیرہ کا بیان بھی تفصیل سے ملتا ہے ۔ شدید جنگ کا منظر دیکھیے :

ہنگامہ ہوا گرم یہ ، ناری جو ہوا سرد　　واں فوج نے لی باگ بڑھا ، یاں یہ جواں مرد
ٹاپوں کی صدا سے سرِ قاروں میں ہوا درد　　رنگِ رخِ اعدا کی طرح اڑنے لگی گرد
قاروں کا زر گنج نہانی نکل آیا
یہ خاک اڑی رن سے کہ پانی نکل آیا

پہلے مصرعے میں تضاد ، تیسرے مصرعے میں نزاکت خیال ، چوتھے مصرعے میں محاورہ اور تشبیہہ ، پانچویں میں استعارہ اور چھٹے مصرعے میں مبالغہ ہے ۔

11.6.4 مکالمہ نگاری

مرثیہ ایک بیانیہ اور طولانی صنف سخن ہے اور یہ تمام مرثیے بہترین کردار پیش کرتے ہیں ۔ اور کرداروں کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں کہ

مکالموں سے کام نہ لیا جائے۔ دوسرے کرداروں کا تعارف بھی ان کے مکالموں سے ہوتا ہے کہ وہ کس خاندان' کس عمر اور کس مزاج کے ہیں۔ پیشِ نظر مرثیے میں بھی بہت سے ایسے موقعے ہیں جہاں مکالموں سے کام لیا گیا ہے۔ دشمن کی فوج کے بہادر کی عمر ابن سعد کے ساتھ گفتگو کا ایک نمونہ دیکھیے۔

بولا وہ لرز کر کہ ہوا مجھ کو بھی وسواس　　شمشیر خدا کون؟ عمر بولا کہ عباس
اس نے کہا' پھر فتح کی کیوں کر ہے تجھے آس　　بولا کہ کئی روز سے اس شیر کو ہے پیاس
ہم بھی ہیں بہادر' نہیں ڈرتے ہیں کسی سے
پر روح نکلتی ہے تو عباس علی سے

حضرت عباس کی شہادت پر حضرت زینب ماتمی لباس سب کو دے رہی ہیں۔ گریہ کے ساتھ بین کرتی جارہی ہیں:

زینب نے کہا ہیں مری قسمت کے یہی کام　　دینے لگی ماتم کے سیہ جوڑے وہ ناکام
فضہ سے کہا سوگ کا کرتی ہوں سر انجام　　ٹھنڈا ہوا ہے ہے علمِ لشکرِ اسلام
زہرا کا لباس اپنے لیے چھانٹ رہی ہوں
عباس کا ملبوسِ عزا بانٹ رہی ہوں

11.6.5 منظر نگاری

مناظر قدرت کے بغیر مرثیہ ادھورا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ دبیر کے کلام میں اعلیٰ درجے کی منظر نگاری کم ہے۔ منظر نگاری کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس پس منظر میں واقعے کا اثر کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ جیسے اسٹیج کا پس منظر' کرداروں کے حرکات وسکنات' اور مکالموں کے اثر کو بھی بڑھا دیتا ہے۔ پیش نظر مرثیے میں بھی منظر نگاری برائے نام ہے۔ حضرت عباس کے سراپا میں منظر نگاری کی جھلک دکھائی دیتی ہے:

صحرا میں گرا پرتو عارض جو قضارا　　سورج کی کرن نے کیا شرما کے کنارا
یوں دھوپ اڑی' آگ پر جس طرح سے پارا　　موسیٰ کی طرح غش ہوئے سب کیسا قضارا
جز مدح ' نہ دم روشنی طور نے مارا
شب خون عجب' دھوپ میں اس نور نے مارا

دبیر کا ایک مشہور مرثیہ ہے جس کا مطلع ہے:

'پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی'

اس مرثیے کی تمہید میں ایک خوبصورت صبح کی منظر نگاری کی گئی ہے اور تشبیہوں اور استعاروں کے پردے میں صبح کی آمد کا اعلان کیا گیا ہے مثلاً:

یوسف ' غریق چاہ سیہ ناگہاں ہوا　　یعنی غروب ' ماہ تجلی نشاں ہوا
یونس ' وہاں ماہی شب سے عیاں ہوا　　یعنی طلوع نیّر مشرق سناں ہوا
فرعون شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم اور ید بیضا تھا آفتاب

اس بند میں استعارے کے علاوہ تلمیحات سے بھی خوب کام لیا گیا ہے۔

11.6.6 لسانی خوبیاں

لسانی خوبیوں کا ذکر کیا جائے تو فصاحت کلام سب سے پہلی شرط ہے۔ پیش نظر مرثیے میں فصاحت کلام کے کئی مواقع ہیں۔ مرحب کو فُرات کے کنارے قتل کر کے جب حضرت عباس پانی لے کر چلے تو یہ خبر خیمے میں پہنچی۔ حضرت سکینہ نے یہ مژدہ سنا' تو بچی کی زبان سے دبیر نے کیسے فصیح مکالمے ادا کیے ہیں دیکھیے :

زینب سے بہ حسرت یہ بیاں کرتے تھے مولا ناگاہ سکینہ نے سنا فتح کا مژدہ
چلائی میں صدقے ترے' اچھی مری فضا جا جلد بلائیں مرے عمو کو تو لے آ
دکھ پیاس کا کہہ کر انہیں مدہوش نہ کرنا
پھر یاد دلانا کہ فراموش نہ کرنا

یہ خبر حضرت عباس نے سنی تو فرمایا:

دل پیاس سے بی بی کے ہوا جاتا ہے پانی لے کر ترے ابا کا غلام آتا ہے پانی

زبان میں دبیر نے بڑے اجتہاد دکھائے ہیں یعنی نئے مضامین' نئی تشبیہیں' نئے استعارے' زورِ بیان' مشکل پسندی اور تخیل کی بلندی سے کام لیا ہے۔ اس ایک مرثیہ میں صنعتوں کا جتنا استعمال دبیر نے کیا ہے شاید ہی کسی اور شاعر نے اپنے کسی بھی مرثیہ میں کیا ہوگا۔ تلمیحات کا تو ایک سلسلہ ہے کہ ٹوٹتا ہی نہیں ایک بند جس کے ہر مصرعے میں تلمیح ہے۔ دیکھیے۔

یوسف ہے یہ کنعاں میں سلیمان ہے سبا میں عیسیٰ ہے مسیحائی میں موسیٰ ہے دعا میں
ایوب ہے یہ صبر میں یحییٰ ہے بکا میں شبیر ہے مظلومی میں حیدر ہے وغا میں
کیا غم جو نہ مادر نہ پدر رکھتے ہیں آدم
عباس سا دنیا میں پسر رکھتے ہیں آدم

صنعت تضاد کے لیے ایک بند کا شعر پیش ہے :۔

راحت کے محلوں کو بلا پوچھ رہی ہے ہستی کے مکانوں کو فنا پوچھ رہی ہے

صنعت تکرار:

خورشیدِ فلک ' پر تو عارض کا لقب ہے یہ قدرت رب' قدرت رب' قدرت رب ہے

صنعت ترصیع میں دونوں مصرعوں کے الفاظ علی الترتیب ایک دوسرے کے ہم وزن ہوتے ہیں جیسے دبیر کے اس مرثیہ کے اس شعر میں ہے:

گھر لوٹ لے بغض و حسد و کذب و ریا کا
سر کاٹ لے حرص و طمع و مکر و دغا کا

تجاہل عارفانہ کی مثال میں زیرِ نظر مرثیہ کا مطلع کافی ہے:

مُوعاۃ النظیر ایسی صنعت معنوی ہے جس میں کئی چیزوں کو لانا جو باہم مناسبت رکھتے ہوں جیسے اس شعر میں خود' چار آئینہ' ڈھال اور جوشن آئے ہیں۔ تجنیس زمانہ و ناقص کی مثال دیکھیے :

یہ خود' یہ چار آئینہ' یہ ڈھال' یہ جوشن — یہ سینہ' یہ بازو' یہ کمر اور یہ گردن

ع جاں غیر ہے تن غیر مکیں غیر مکاں غیر

اپنی معلومات کی جانچ :

1. دبیر کی جذبات نگاری کا جائزہ لیجیے۔
2. شامل نصاب مرثیہ میں کون سے کردار نمایاں مقام رکھتے ہیں؟

11.7 تشریح

''شاہوں کا چراغ آتے ہی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نہ ہم ان سے جدا ہیں''

یہ بند دبیر کے شاملِ نصاب مرثیے : ''کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے'' سے اخذ ہے۔ یہ مرثیہ حضرت عباس کی شہادت کے بیان میں ہے جو حضرت علی کے بیٹے' حضرت امام حسین کے چھوٹے بھائی اور حضرت علی اکبر کے چچا تھے۔ نہایت جری' شجاع' فنون جنگ کے ماہر اور امام حسین کے جاں نثاروں میں تھے۔ اکثر مرثیوں میں انہیں رعب' دبدبہ اور وقار کا مالک بتایا گیا ہے۔ مرثیوں میں انہیں ابوالفضل' سقائے حرم' سقائے سکینہ' قمر بنی ہاشم' علم دارِ لشکر حسینی' پیکرِ وفا جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ بند مرثیے کے رجز کے حصے سے لیا گیا ہے جس میں حضرت عباس دشمن کی فوج کے سامنے اپنا تعارف کرواتے ہیں اور اپنے حسب و نسب اور رزمیہ کارناموں کا بیان کرتے ہیں کیوں کہ یہ تمام چیزیں رجز کا لازمی حصہ ہیں۔

پیش نظر بند میں عباس علمدار اپنے اب و جد کے شرف پر فخر کیا ہے جن میں جد حضرت خاتم النبیین اور باپ حضرت علی اسلامی جنگوں کے فاتح ہیں۔ حضرت عباس فرماتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں کی آمد سے زمین پر عدل و مساوات قائم ہوئے۔ اور ہم نے بادشاہوں کے رعب و جلال کا خاتمہ کردیا۔ اور زمین پر پیغمبر آخرالزماں کی حکومت قائم کی۔ ہمارے باپ نے جنگ خیبر میں تنِ تنہا قلعے کے دروازے کو اکھاڑ کر خندق کے اوپر رکھ دیا جس نے پُل کا کام کیا اور تمام فوج قلعے میں داخل ہوگئی۔ کلمے میں صرف **لا اله الا الله** تھا **محمد الرسول الله** کہہ کر اسے ہم نے مکمل کیا۔ یعنی اللہ کے بعد ہمارے نانا کا نام آتا ہے۔ یہ تمام مرتبے ہمارے خاندان کو اللہ نے بخشے ہیں' اور ہم اسی خاندان کے فرد ہیں تو ظاہر ہے کہ ہم ان ہی کی ذات والا صفات کا حصہ ہیں۔ نہ ہمارے آبا واجداد کو ہم سے جدا کیا جاسکتا ہے اور نہ ہماری ذات سے انھیں الگ کیا جاسکتا ہے۔

اپنے حسب ونسب پر فخر کرنا عربوں کے لیے نہایت مسرت کی بات تھی۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی یہ بند کچھ خوبصورت نکات پیش کرتا ہے۔ پہلے مصرعے میں ''چراغ گل کرنا'' محاورہ ہے۔ تیسرے مصرعے میں تلمیح ہے۔ خیبر کا قلعہ نہایت مضبوط اور ناقابلِ تسخیر تھا۔ اس کے چاروں طرف گہری خندق تھی جسے پار کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کا دروازہ بھی بہت بڑا اور نہایت مضبوط تھا اور خندق پار کرنے والوں پر قلعے کی فصیلوں سے تیروں کی بوچھار کردی جاتی تھی۔ حضرت علی نے اپنی حکمت عملی سے نہ صرف خندق کو پار کیا بلکہ تن تنہا اس دروازے کو اکھاڑ دیا' اور اس کا ایک پلّہ خندق پر اس طرح رکھ دیا کہ ایک پُل سا بن گیا اور اسلامی فوج آسانی سے قلعے میں داخل ہوگئی۔ چوتھے مصرعے میں جزو اور کل میں صنعت تضاد کی اچھی مثال ہے۔ مجموعی طور پر یہ بند رجز خوانی کی اچھی مثال پیش کرتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. دبیر کا یہ مرثیہ کس کی شہادت کے بیان میں ہے؟
2. اس بند میں کون کون سی فنی خوبیاں ملتی ہیں؟

11.8 خلاصہ

یہ عجیب اتفاق ہے کہ مرثیہ نگاری کے دو بے مثال مرثیہ نگار ایک ہی سنہ میں پیدا ہوئے اور ایک ہی سنہ میں انتقال کیا۔ مرزا سلامت علی دبیر نے ایک محتاط اندازے کے مطابق دو ہزار سے زیادہ مرثیے کہے۔ ان کے مرثیوں میں ان کا علمی تبحر، فن عروض کی شیوہ طرازیاں جلوہ فرما ہیں۔ میر انیس کے مرثیوں میں بہتے دریا کی روانی ہے تو دبیر کے مرثیوں میں آبشاروں کا جلال ہے' زبان و بیان پر انھیں بے پناہ قدرت حاصل تھی ۔ انھوں نے قرآنی آیات' احادیث اور تاریخی' تہذیبی اور مذہبی حوالوں سے تلمیحات کا خوب استعمال کیا ہے۔ منظر نگاری' جذبات نگاری' کردار نگاری' مکالمہ نویسی' رزم نگاری میں بھی انیس کو کمال حاصل ہے۔ دبیر نے اپنے مرثیوں میں لفظی اور معنوی صنعتوں کو نگینوں کی طرح جڑ دیا ہے۔ بعض بعض مرثیوں میں تو انہوں نے باالالتزام صنعتوں کا استعمال کیا ہے ۔

11.9 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے :

1. مراثی دبیر کی خصوصیات بیان کیجیے ۔
2. مرثیہ ''کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے'' پر ایک مضمون لکھیے ۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے :

1. دبیر کی حیات پر مختصر نوٹ لکھیے ۔
2. مراثی دبیر کی لسانی خصوصیات اختصار کے ساتھ لکھیے ۔
3. شاملِ نصاب مرثیے کے رزمیہ عناصر کا جائزہ لیجیے ۔
4. دبیر کی کردار نگاری اور مکالمہ نگاری پر اظہار خیال کیجیے ۔
5. مثالیں پیش کرتے ہوئے دبیر کی منظر نگاری پر ایک نوٹ لکھیے ۔
6. مراثی دبیر میں صنعتوں کے استعمال پر مختصر نوٹ لکھیے ۔

11.10 فرہنگ

ایوب = ایک پیغمبر' خدا نے جنہیں کئی آزمایشوں میں ڈالا تھا اور وہ صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہے

کاوا = گھوڑے کو اس طرح چکر دیا جاتا ہے کہ اس کے سموں کے نشان سے زمین پر ایک دائرہ بن جاتا ہے

عون و محمد = امام حسین کے کمسن بھانجے' حضرت زینب کے صاحبزادے

محسن = حضرت بی بی فاطمہ کے چھوٹے صاحب زادے

جوزا = ایک سیارے کا نام جسے منشی فلک بھی کہتے ہیں

نہ قلعہ افلاک = سات آسمان' آٹھویں کرسی نواں عرش

سبا = ایک ملک نام بلقیس جس کی ملکہ تھیں

فتراک = شکار کا تھیلا جو زین میں لگا ہوتا ہے

حضرت عباس = حضرت حسین کے بھائی

بلق = سفید و سیاہ رنگ کا گھوڑا

تہمتن = ایک ایرانی پہلوان

جلادِ فلک = مریخ

قصر = محل

عیسیٰ = ایک پیغمبر

صیقل کرنا = چمکانا

چھل بل = شوخی

راکب = گھوڑا سوار (گھڑ سوار)

وسواس = وہم، وسوسہ

حذر = خوف

پیل دماں = مست ہاتھی

سیف = تلوار

سقر = دوزخ

صدر = سینہ

ہب ہب = جہنم کی ایک وادی

ابن ورقہ = یزیدی لشکریوں میں سے تھا جس نے حضرت عباس پر چھپ کر حملہ کیا تھا۔

جنگاہ = میدانِ جنگ

قرۃ عینا = ہماری آنکھ کی پتلی

شیون = نوحہ و ماتم

یحییٰ = حضرت زکریا کے صاحبزادے پیغمبر

دُرِّ نجف = ایک پتھر جو نجف میں پایا جاتا ہے

شبّیر = حضرت امام حسین کا نام

موسیٰ = پیغمبر موسیٰ کلیم اللہ

صاعقہ = بجلی (جو گرتی ہے)

رن = میدان جنگ

کہن = پرانا

لاریب = بے شک

معدن = کان، کھان

توسن = گھوڑا

رخش = گھوڑا

مسلح = ہتھیاروں سے لیس

دیودنی = پاجی ۔ برا آدمی

پلان = پہلوان

رویہ = صدقہ

جَیب = گریباں

فِضّہ = بی بی فاطمہ کی کنیز

رہوار = گھوڑا

چورنگ = چار ٹکڑوں میں کٹ جانا

بہجۃ قلبا = دل کا قرار

یداللہیوں = حضرت علی کے گھرانے کے لوگ

11.11 سفارش کردہ کتب

1. حیات مرزا دبیر : خبیر لکھنوی
2. مرزا سلامت علی دبیر : حیات اور کارنامے ۔ مرزا محمد زماں آزردہ
3. اردو مرثیے کا ارتقا : مسیح الزماں
4. موازنۂ انیس و دبیر : علامہ شبلی نعمانی
5. مرثیہ خوانی کا فن : نیّر مسعود
6. اردو مرثیہ اور مرزا دبیر : کاظم علی خاں

اکائی: 12 وحید اختر کی مرثیہ نگاری

ساخت

12.1 تمہید

12.2 عہد

12.3 حیات

12.3.1 علمی وادبی خدمات

12.3.2 شخصیت

12.4 وحید اختر کی شاعری کی خصوصیات

12.4.1 اسلوب

12.4.2 غزل

12.5 وحید اختر کی مرثیہ نگاری (مجموعی جائزہ)

12.6 مرثیہ شہید عطش

12.7 مرثیے کا تجزیہ

12.7.1 مرثیہ شہید عطش کی لسانی خصوصیات

12.7.2 فصاحت

12.7.3 کردار نگاری

12.7.4 مکالمہ نگاری

12.7.5 مرقع نگاری

12.7.6 منظر نگاری

12.8 تشریح (ایک بند)

12.9 خلاصہ

12.10 نمونہ امتحانی سوالات

12.11 فرہنگ

12.12 سفارش کردہ کتابیں

12.1 تمہید

بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک کے ساتھ ادب کے ہر میدان میں کئی اہم تبدیلیاں آئیں۔ مرثیے کے معنی ومفہوم میں بھی وسعت پیدا ہوئی اور اس تاریخی واقعہ کو حالات زمانہ اور بین الاقوامی مسائل کی روشنی میں خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ آج مرثیہ شعری استعارے کے طور پر بھی استعمال ہو رہا ہے۔ مرثیوں کے فروغ میں عزاداری نے بڑا رول ادا کیا ہے۔ آج بھی ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں مرثیے لکھے جا رہے ہیں۔

جدید مرثیہ نگاروں نے جو سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا' وہ یہ کہ واقعہ کربلا کو زمان ومکان کے قیود سے آزاد کر کے اسے عالمی تناظر میں پیش کیا۔ دنیا کی سب سے بڑی قربانی صرف بقائے اسلام کے لیے نہیں بلکہ اعلا انسانی اقدار کی بقا' حق طلبی' حق پرستی اور تحفظ انسانیت کے لیے بھی دی گئی ہے۔ ایک

اور کارنامہ جو جدید مرثیہ گویوں نے انجام دیا' وہ یہ ہے کہ انہوں نے واقعے کو زیادہ موثر بنانے کے لیے مرثیہ کو اپنے ملک کے تاریخی تناظر میں پیش کیا۔ مرثیے پر ہوا اعتراض اب بہت پرانا ہو گیا کہ واقعہ عرب میں پیش آیا اور کردار ہندوستانی بلکہ مرثیہ گویوں کی مقامی تہذیبوں کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے اپنی تاریخی اور تہذیبی پیش کش میں ہی یہ مرثیے تاثر میں بہت زیادہ کامیاب رہے۔ جدید دور کے مرثیہ نگاروں میں جوش ملیح آبادی' جمیل مظہری' شاد عظیم آبادی' اثر لکھنوی اور آل رضا نے کامیاب اور پُر اثر مرثیے لکھے۔ ان ہی مرثیہ نگاروں کے ساتھ وحید اختر کا نام بھی لیا جاتا ہے جن کے مرثیوں کا مجموعہ ''کربلا تا کربلا'' منظر عام پر آ چکا ہے۔

12.2 عہد

بیسویں صدی بدامنی اور انتشار کا شکار رہی۔ خصوصاً نصف اول میں دو عالمی جنگوں نے تمام دنیا کو زیروزبر کر دیا۔ ہندوستان میں یہ آدھی صدی عالمی جنگوں کے علاوہ خود اپنی آزادی کے لیے لڑتے لڑتے گزر گئی۔ مہنگائی' افلاس' قحط سالی اور جنگوں نے آفات ارضی وسماوی کا ایسا وحشت ناک ماحول بنا دیا تھا کہ دنیا کا کوئی ملک خوش حال اور پرسکون نہیں تھا۔ یہی وہ دور تھا جب ادب میں بھی لوگوں نے اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی کہ اس کا احوال واقعی جائزہ لیا جائے کہ کیا وہ ہماری زندگی اور حالات زمانہ کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اسی ضرورت کے تحت ترقی پسند تحریک وجود میں آئی اور اس نے نہ صرف تمام اصناف میں تبدیلیاں اور اضافے کیے بلکہ ادب کی کئی اصناف کا خون بھی ہوا۔ لیکن مرثیہ اپنی عظمت اور ہر زمانے میں حالات سے جدوجہد کے پیغام کے سبب محفوظ رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ انیس و دبیر کا دور' مرثیہ نگاری کے عروج کا دور تھا۔ اور اس کے بعد اس پائے کے مرثیے تصنیف نہیں کیے جا سکے۔ لیکن ہندوستانی میں عزاداری کے رواج نے مرثیے کے وجود کو ختم نہیں ہونے دیا۔ ہاں ترقی پسندی کا رجحان جو دوسری اصناف میں نظر آتا ہے مرثیے میں بھی اس کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ کئی شاعروں نے ترقی پسندی کے جوش میں مرثیے کی روح کو بھی متاثر کرنے کی کوشش کی اور واقعہ کربلا سے زیادہ حوادث زمانہ کو موضوع بنایا۔ لیکن ایسے مرثیے عوام نے قبول نہیں کیے بلکہ ناقدین نے بھی انہیں شہر آشوب یا مسدس کا نام دے دیا۔ اس زمرے میں جوش کا نام سب سے نمایاں ہے۔ ان کا مشہور مرثیہ ''حسین اور انقلاب' جدت کی قینچی سے بچ گیا اور اسے قبول عام حاصل ہوا۔ جدت فکر کے باوجود اس میں روایتی مرثیے کی خوبیاں موجود ہیں۔ لیکن بعد کے مرثیہ نگاروں نے احتیاط سے کام لیا اور واقعہ کربلا کی عظمت کو کم کرنے کے بجائے آج کے حالات میں اس کی زیادہ ضرورت پر زور دیا۔ اپنے موضوع' ہیئت اور اجزائے ترکیبی میں کسی تبدیلی کے بغیر بھی مرثیے میں جدت کی بڑی گنجائش تھی اور آج تو واقعہ کربلا ایک بہت بڑے شعری استعارے کے طور پر شاعری میں چھایا ہوا ہے۔ جدید مرثیہ نگاری میں جوش ملیح آبادی' جمیل مظہری' شاد عظیم آبادی' اثر لکھنوی اور آل رضا کے ساتھ ساتھ یقیناً وحید اختر کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مرثیہ نگار ہیں لیکن طوالت کے پیش نظر ان سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔ اب عزاداری میں نثری مجلسوں کے رواج نے بھی مرثیہ نگاروں کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ لیکن آج بھی خاصی تعداد میں مرثیے کہے اور پڑھے جا رہے ہیں کیوں کہ ان مرثیوں سے اخلاقی درس اور اصلاح زمانہ کا بھی کام لیا جا رہا ہے۔ اس لیے ان کا رواج کبھی ختم نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ اردو شاعری میں رزمیہ کا بیان جس طرح مرثیوں میں ملتا ہے اس طرح نظم و نثر کی کسی اور صنف میں نہیں ملتا۔ آج مرثیہ واقعہ کربلا کی صرف ایک بازگشت نہیں بلکہ نئی معنویت اور علامت و استعارے کا ایک ایسا خوبصورت مجموعہ ہے جسے صرف 1400 سال پہلے پیش آنے والا ایک واقعہ سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ واقعہ رہتی دنیا تک ہمارے لیے مشعل راہ بنا رہے گا۔

اپنی معلومات کی جانچ : 1

1. کن مرثیوں کو ناقدین نے شہر آشوب یا مسدس کا نام دیا؟
2. جدید مرثیہ نگاروں میں سے کسی تین کے نام بتائیے۔

12.3 حیات

وحید اختر کے اجداد کا تعلق یوپی کے قصبہ جائس سے تھا۔ جائس سے دو کوس کی دوری پر نصیر آباد ان کا آبائی وطن تھا۔ ان کے دادا اکبر حسین نابینا

تھے۔ والد نذر عباس تعلیم یافتہ تھے۔ مگر فکر معاش میں تعلیم ادھوری چھوڑ کر دکن کو سدھارے۔ یہیں ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ دوسری شادی علیہ بیگم سے ہوئی جن سے نذر عباس سات بیٹوں کے باپ بنے۔ تین بیٹیوں کا بھی ذکر ملتا ہے مگر کوئی بیٹی زندہ نہ رہی۔ حالات کے شدائد نے انھیں پھر ایک بار جائس کی طرف پلٹنے پر مجبور کیا لیکن تنگ دستی اور فاقہ کشی نے انہیں اورنگ آباد پہنچا دیا۔ یہیں وحید اختر کے سارے بھائی بہن پیدا ہوئے۔ 12 اگست 1935ء کو اورنگ آباد کے قصبہ مومن پورہ میں وحید اختر کی ولادت ہوئی۔ مفلسی اور بیماریوں سے گھرا ہوا یہ کنبہ زندہ رہنے کی جدوجہد کرتا رہا اور پشتم پشتم وحید اختر کا تعلیمی سلسلہ بھی جاری رہا۔ خود وحید اختر دو تین روپے مہینے پر ٹیوشن پڑھانے کے ساتھ ساتھ ذاکری کر کے بھی کچھ رقم پیدا کر لیتے تھے۔ اتنی شدید محنت اور خداداد ذہانت کی بدولت جماعت میں ہمیشہ اول آتے رہے۔ اسی ذہانت کی بدولت انہیں ریڈیو پر بچوں کے پروگرام میں جگہ مل گئی اور ہفتہ وار پانچ روپیہ ملنے لگے۔ جس سے بیس روپے مہینہ کا انتظام ہوگیا۔ جو اس زمانے میں بڑی رقم تھی۔ والد کی آنکھوں کی بینائی بھی رخصت ہو چکی تھی اور گھر میں مستقل آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی۔ وہ خود بھی مستقل بیمار رہتے تھے پے بہ پے صدمات نے انہیں جسمانی طور پر بہت کمزور کر دیا تھا' مگر دماغی طور پر وہ بہت مضبوط اور ذہین تھے' شاعری کا چسکا بھی لگ چکا تھا۔ ''وحید'' تخلص اختیار کیا اور ذاکری نے مذہب سے لگاؤ بھی پیدا کر دیا تھا۔ مجلسیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ نوحے اور سلام بھی کہنے لگے۔ مگر یکسوئی ان کے مقدر میں نہ تھی۔ تنگ دستی اور فاقہ کشی نے انہیں اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیا تھا۔ 1952ء میں جب وہ بی۔ اے میں داخلہ لینے کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی پہنچے تو انھیں اپنی والدہ کی وفات کی خبر ملی۔ اس حادثۂ جانکاہ کے ایک سال بعد 1953 میں نابینا نذر عباس بھی جنت کو سدھارے۔ اب گھر کی تمام ذمہ داری وحید اختر کے کاندھوں پر آ پڑی' اس وقت تک وہ ادبی دنیا سے متعارف ہو چکے تھے اور بغیر کسی ملازمت کے گھر والوں کی کفالت کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں شاذ تمکنت نے سری نگر ریڈیو اسٹیشن آنے کا دعوت نامہ بھیجا۔ اسی دوران قیام انہیں اطلاع ملی کہ ان کے بھائی حمید اختر نے خودکشی کر لی۔ وحید کے لیے یہ صدمۂ جاں کاہ' قوتِ برداشت کا امتحان بن گیا۔ لیکن یہ تمام حالات ان کے دل سے طلب علم کا حوصلہ نہ چھین سکے۔ اس کے علاوہ ان دردناک اور غیر متوقع حملوں نے ان کی شاعری میں درد اور اظہار درد کے وہ پیمانے وضع کیے جو قاری کے ساتھ ان کے رشتوں کی استواری کا ذریعہ بن گئے۔ 1962ء میں ایک ایرانی نژاد خاتون ''مہ لقا قرائی'' سے ان کی شادی ہوگئی جن سے چار بیٹے پیدا ہوئے۔ اپنی بیوی کے ساتھ کچھ عرصہ ایران میں بھی گزارا جہاں انگریزی اخبار ''التوحید'' کی ادارت بھی سنبھالی۔

12.3.1 علمی و ادبی خدمات

اردو ادب میں ان کی شہرت کا خاص سبب ان کی شاعری کو قرار دیا جاتا ہے۔ یوں تو انہوں نے غزلیں بھی لکھیں مرثیے بھی لکھے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ بحیثیت نظم نگار اور نقاد انھیں زیادہ شہرت ملی۔ وحید اختر نے اپنی شاعری کا آغاز نوحوں اور سلاموں سے کیا۔ ہائی اسکول (1948) کے ہی زمانے میں ان کی ایک نظم شائع ہو چکی تھی۔ 1950ء میں ایک نظم ''آنسو'' کے عنوان سے ادب لطیف' لاہور میں شائع ہوی۔ ابھی ان کی عمر اکتیس بتیس سال کی تھی کہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''پتھروں کا مغنی'' 1966ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ مجموعہ (248) صفحات پر مشتمل ہے۔ 1967ء میں اردو اکیڈمی نے اس مجموعے پر غالب انعام سے سرفراز کیا۔ ''شب کا رزمیہ'' وحید اختر کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ جو 176 صفحات پر محیط ہے۔ اس مجموعے میں 1961 تا 1967ء کے درمیان کہی گئی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ ''زنجیر کا نغمہ'' تیسرا مجموعہ ہے جس میں 58 غزلیں اور 34 نظمیں شامل ہیں۔ 1990ء میں مرثیوں کا مجموعہ ''کربلا تا کربلا'' پر دہلی سے مہدی نظمی ایوارڈ ملا۔ 1983ء میں آندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے بہ حیثیت شاعر مخدوم ایوارڈ سے نوازا۔ اپنی پچاسویں سالگرہ پر ''نصف صدی کی بوڑھی دنیا'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔

وحید اختر کی تنقید' دراصل ماہنامہ ''صبا'' حیدرآباد کے مستقل فیچر ''سخن گسترانہ بات'' کے کالم سے شروع ہوتی ہے۔ ان کالموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وحید اختر ایک اچھے شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک اچھے نقاد بھی تھے۔ ان کا تحقیقی مقالہ ''خواجہ میر درد'' پر بڑے معرکے کا مقالہ ہے۔ یہ مقالہ ضروری ترمیم و اضافے کے بعد انجمن ترقی اردو ہند نے مارچ 1971ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب 583 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مقالہ پر انہیں انیس علی گڑھ یونیورسٹی سے فلسفہ میں پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری عطا ہوئی۔ ساتھ ہی فلسفے کے شعبے میں بہ حیثیت استاد ان کا تقرر عمل میں آیا۔

ان کے بہت سارے تنقیدی مضامین ملک اور بیرون ملک کے موقر جرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔ انگریزی میں ان کے کئی مضامین فلسفہ' سیاست' اسلامیات اور ادب کے موضوعات پر ان کے افراد خاندان کے پاس موجود ہیں۔ اقبال کے فلسفے سے متعلق بھی کئی مضامین انہوں نے اردو اور انگریزی میں لکھے۔

12.3.2 شخصیت

وحید اختر دبلے پتلے اوسط قد کے آدمی تھے۔ طبیعت میں خودداری خود پرستی اور انانیت تھی۔ دوستوں کی محفل میں بھی ان کی گفتگو میں خودستائی کا پہلو غالب رہتا تھا۔ لمحہ لمحہ سسکتی زندگی اور حادثات' بچپن کی محرومیوں نے ان کے اندر ایک جارحانہ رویہ پیدا کر دیا تھا۔ وہ کسی شخص کو خاطر میں نہ لاتے تھے اسی سبب سے ان کے کئی اچھے دوست اور بہی خواہ ان سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ طبیعت میں تساہل اور لاپرواہی تھی۔ کبھی اپنا کلام سنبھال کر رکھنا نہ مضامین کی حفاظت کی۔ اقبال پر ان کے انگریزی مضامین کی ترتیب کی جانب جاوید اقبال نے توجہ دلائی اور اشاعت کا وعدہ کیا مگر انہوں نے ان مضامین کی ترتیب میں دلچسپی نہیں لی۔ قلم برداشتہ لکھتے تھے مگر پوری ذمہ داری سے لکھتے تھے۔ اچھے مقرر تھے' بولنے پر آتے تو زبان و بیان کے دریا بہا دیتے تھے۔ ریڈیو پر اکثر ان کی تقریریں زبانی ہوتی تھیں کاغذ سامنے ضرور ہوتا تھا روانی سے بولتے بھی جاتے تھے۔ جب ریڈیو والے حسب قاعدہ مضمون مانگتے تو سادہ کاغذ ہاتھ میں تھما دیتے تھے۔ تقریر کا یہ مادہ انہیں ذاکری سے حاصل ہوا۔

اپنی معلومات کی جانچ : 2

1. وحید اختر کہاں پیدا ہوئے؟
2. وحید اختر کی پہلی نظم کا عنوان کیا تھا؟
3. وحید اختر کے دوسرے شعری مجموعے کا نام کیا تھا؟
4. وحید اختر کے مرثیوں کے مجموعے کا نام بتایئے۔
5. وحید اختر کی شخصیت کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالیے۔

12.4 وحید اختر کی شاعری کی خصوصیات

وحید اختر کا مطالعہ خاصا وسیع رہا ہے۔ مالی مشکلات کے باوجود کبھی اپنے اس شوق میں کمی نہیں آنے دی۔ شاعری کی طرف بھی ان کا میلان بچپن ہی سے تھا۔ نوحوں اور سلاموں سے شاعری کا آغاز ہوا۔ ان کی عمر سولہ سترہ برس کی رہی ہوگی جب سے ان کی نظمیں' غزلیں' نوحے اور سلام ملک کے اہم جرائد اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ وحید اختر کو مختلف اصناف سخن پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ان کی شاعری کی سب سے بڑی طاقت شعری روایت کا شعور اور کلاسیکی رچاؤ ہے۔ وحید اختر کے سرمایۂ شاعری میں تجربے کی مختلف سطحیں ہیں۔ سوز و گداز نے ان کے اسلوب کو اثر آفرینی دی ہے۔ ان کی شاعری کا مرکز عموماً خود ان کی محرومیاں' ناکامیاں اور زندگی کے تلخ تجربات ہیں۔ نظم ہو کہ غزل' وحید اختر کے تجربے کی سچائی ان سب میں ایک روح پھونک دیتی تھی۔ ان کی شاعری میں فلسفیانہ شعور ملتا ہے۔

وحید اختر کی ابتدائی نظمیں جو ان کے پہلے مجموعے ''پتھروں کا مغنی'' میں شامل ہیں رومانی آہنگ کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان نظموں پر جوشؔ کے لہجے کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ وحید اختر کی عشقیہ شاعری ان کی شادی کے بعد 1962ء میں شروع ہوتی ہے۔

12.4.1 اسلوب

وحید اختر کے یہاں عموماً زبان و بیان کی کئی خوبیاں ملتی ہیں۔ انہوں نے مترنم بحروں کا انتخاب کیا ہے۔ اور لفظوں کی داخلی موسیقیت پر خاص توجہ دی ہے۔ یہ نغمگی ایک خوش گوار فضا تعمیر کرتی ہے۔ زبان کے سلسلے میں وحید اختر نے فارسی اسالیب سے زیادہ کام لیا ہے۔ بعض نظموں کی زبان بہت زیادہ فارسی آمیز ہو گئی ہے لیکن وحید اختر کو سلاست زبان اور سادگی بیان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ جس کی اچھی مثال ان کی نظم ''بن باس'' ہے۔ ان کے یہاں غزل ہو کہ نظم' اختصار' کفایت اور ارتکاز کے بجائے طوالت' پھیلاؤ اور خطیبانہ آہنگ بھی ملتا ہے۔ ان کا مجموعی اسلوب بلند آہنگ ہے۔ انہوں نے طویل نظمیں بھی کثرت سے لکھی ہیں' ایسی نظمیں مکمل اور بامقصد ہوتی ہیں۔ ان کی طویل نظمیں عموماً عالمی سطح کے موضوعات پر ہیں' جنہیں انہوں نے ''عالم آشوب'' کا نام دیا ہے۔ ایسی نظموں میں گہری علمی بصیرت اور انسان دوستی کی خصوصیات موجود ہیں۔

12.4.2 غزل

وحیداختر نے روایتی غزل سے اپنی شاعری کا آغاز کیا لیکن بہت جلد جدیدیت کی طرف مائل ہوگئے۔ان کی غزل میں روایت اور جدیدیت کا خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے۔وحیداختر نے اپنی نظموں میں جس طرح اپنے محبوب کو واضح انداز میں پیش کیا ہے، وہی احساس ان کی غزلیہ شاعری میں بھی دکھائی دیتا ہے نمونتاً چند شعر پیش ہیں:

تمہیں چاہیں کہ تم کو بھول جائیں ..... تمہاری یاد ہے غم بھی سکوں بھی

ہزاروں میل کی دوری سے اتنا یاد مت آؤ ..... بہت دل ہو چکے ہیں راکھ اس دوری کی قربت سے

ہم اس کو بھول جائیں تو دنیا میں کیا کریں اور یاد بھی رکھیں تو قیامت ہے زندگی

اپنی معلومات کی جانچ:

۱۔ وحیداختر کی شاعرانہ خصوصیات بیان کیجیے۔

۲۔ ان کی شاعری کے اسلوب کی نشاندہی کیجیے۔

12.5 وحیداختر کی مرثیہ نگاری (مجموعی جائزہ)

وحیداختر نے مرثیہ نگاری کی ابتدا 1961 میں کی۔اسی سال ان کا پہلا مرتبہ حضرت علی اصغرؑ کے حال میں لکھا گیا ہے۔دوسرا مرثیہ حضرت عباس کے حال میں ہے۔ان کے مراثی کا مجموعہ 1991 میں ''کربلا تا کربلا'' کے نام سے شائع ہوا جو 264 صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں آٹھ مرثیے شامل ہیں۔یہ مراثی مسدس کے مقبول فارم میں ہیں۔اس مجموعہ کا تیسرا مرثیہ اصغر کی پیاس اور شیر خوارگی کی خونی داستان ہے، جس کا عنوان ''شہید عطش'' ہے۔ وحیداختر نے اسی مرثیہ سے اپنی مرثیہ گوئی کا آغاز کیا تھا مگر اپنے مجموعے میں اسے تیسرے نمبر پر رکھا ہے۔علی اصغر کی پیاس جدید شاعری میں استعارے کے طور پر رائج ہے۔اس مرثیہ کا چہرہ عہد آشوب ہے۔حالات حاضرہ ہی کے پس منظر میں کربلا کی قربانیوں کی اہمیت و معنویت کو اس مرثیہ میں اجاگر کیا گیا ہے۔اس مرثیہ میں شاعر نے غم حیات کی تلخیوں کو کرداروں کے ذریعہ تاریخ کی روشنی میں پیش کیا ہے۔رام کا بن باس، گوتم کا غم دہر، عیسیٰ کی صلیب، سقراط کا زہر کا پیالہ اور اس کا تسلسل کربلا تک ان بندوں میں موجود ہے۔بعض ترکیبیں ایسی ہیں جو واقعہ کربلا کو ذہن پر چسپاں کر دیتی ہیں۔اس مرثیہ میں شاعرانہ صناعی، کلاسیکی رچاؤ اور الفاظ کے انتخاب کی آرائش ہے۔

اس مجموعہ کا چوتھا مرثیہ علمدار لشکر حسینی حضرت عباسؑ کی پیکر ایثار شخصیت کے حال میں لکھا گیا ہے۔ چہرے کا موضوع امن کا نشان ہے جس میں جنگ عظیم کی تباہ کاریاں خصوصاً نیوکلیر ہتھیاروں کی وجہ سے انسانیت کو جو خطرہ لاحق ہے اسے پیش کیا گیا ہے۔اسی تناظر میں حضرت عباسؑ کی بے مثال علمداری کا ذکر آیا ہے۔ایک مرثیہ سید الشہدا حضرت امام حسین کے سفر کربلا اور شہادت پر محیط ہے۔یہ مرثیہ 144 بندوں کا ہے۔اس میں سفر کا استعارہ نہایت معنی خیز ہے۔اس مرثیہ میں شب عاشور اور امام حسینؑ کا خطبہ اہمیت کا حامل ہے۔

ایک مرثیہ ثانی زہرا حضرت زینب کبریٰ کے حال میں ہے۔اس مرثیہ کے تین بند ایک ہی قافیے میں ہیں۔اس میں نام نہاد مذہبی لوگوں کی منافقت پر طنز ہے۔حضرت زینب کے صبر، قربانی اور جہاد کی بے سروسامانی کا ذکر ہے۔اس مرثیہ کا اختتام زندان شام میں حضرت سکینہ کی وفات پر ہوتا ہے۔اس مجموعہ کا پہلا مرثیہ حضرت فاطمہ زہرا کے حال میں لکھا گیا ہے۔اپنے دوسرے مرثیوں کے برخلاف وحیداختر نے اس مرثیہ کو براہ راست جناب فاطمہ کی مدح سے شروع کیا ہے۔اس مرثیہ میں ایک مثالی ماں، بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے خاتون جنت کی عظمت بیان کی گئی۔جناب زہرا کے سامان جہیز، ردا، چکی کو نئی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔اس مرثیہ کا خاتمہ ظلم و جبر کی ہٹ دھرم سیاست اور اہل حق کی خاموش شہادت کے بیان پر ہوتا ہے۔

کربلا تا کربلا کا دوسرا مرثیہ حضرت علی ابن علی طالب کے بیان میں ہے۔اس کا مرکزی خیال انسان کی ہوس پرستی ہے۔جس کے مقابل ان قلعہ

کشاؤں اور بت شکنوں کی زندگیاں ہیں جنھوں نے انسان کو ہوس کی امت بننے سے بچالیا۔ حضرت علیؑ نہ صرف اسلام کی تاریخ میں بلکہ تاریخ عالم میں قلعہ کشائی کی علامت بن گئے ہیں۔ حضرت علیؑ کے کردار کی خوبیاں جیسے علم دیانت' شجاعت' خطابت' حق پسندی' جہاد سیف اور جہاد نفس کو نئے شعری محاورے میں زندہ علامت واستعارے کے ساتھ اُجاگر کیا ہے۔ کربلا اس مرثیہ میں ایک زیریں لہر کی صورت میں موجود ہے۔

ایک اور مرثیہ حضرت امام حسین کے جواں سال بیٹے حضرت علی اکبر کے بیان میں ہے۔ اس مرثیہ میں نطق کو خدا کی صفت' انبیا کا کلام اور ائمہ کے استعارے بطور پیش کیا ہے۔ خاموشی کو بتوں کی بے زبانی کا استعارہ قرار دیا ہے۔ موجودہ دور میں دانشوروں' سیاست دانوں' مذہبی رہنماؤں کے سکوت مصلحت آمیز پر تنقید کی ہے۔

ایک اور مرثیہ انصار حسین کی شہادت کے حال میں ہے۔ مرثیہ کا اصل موضوع خیر وشر میں فرق اور شوق صادق ہے۔ اس مرثیے میں ڈرامائی کیفیت ہے۔ پورے مرثیہ میں رمز واشارے سے کام لیا گیا ہے۔ اس مرثیے میں الفاظ کا سیل رواں ہے۔ بلاغت وفصاحت کا ایک دلکش مجموعہ اس مرثیے میں ملتا ہے۔

وحید اختر نے اپنے مرثیوں میں بین سے زیادہ مسائل حیات کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنی فنی مہارت اور کلاسیکی رچاؤ سے اردو مرثیے کو ایک نئی جہت عطا کی۔

وحید اختر چونکہ کم عمری سے ذاکری کرتے رہے ہیں اس لیے انہیں زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل رہی ہے۔ وہ صنعتوں' تشبیہات واستعارات کی تلاش میں نہیں رہے۔ انہوں نے فکر کی بلندی پر زور دیا ہے اور مرثیہ کی مقصدیت میں غیر معمولی اور مجتہدانہ اضافہ کیا ہے۔

وحید اختر ترقی پسند شاعر تھے۔ ساتھ ہی انہوں نے ترقی پسند نظریات اور اہل قلم کی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر سخت تنقید کی ہے۔ مذہبی معاملے میں وحید اختر نے ترقی پسندوں کی آزادانہ روش سے مفاہمت نہیں کی۔ انہوں نے مرثیے لکھے اور خوب لکھے۔ انہوں نے مرثیے کو صرف رونے رُلانے کی صنف کی حدوں سے نکال کر زندگی کے حقائق سے قریب تر کر دیا۔

وحید اختر نے امام حسینؑ کو صرف عقیدت مندی کے دائرے سے نکال کر اقبال کے مرد مومن اور مرد کامل کی شکل میں پیش کیا۔ وحید اختر کا دور ساری دنیا میں دہشت گردی اور بے اطمینانی کا دور ہے۔ اس دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے وحید اختر واقعہ کربلا کو پیغام عمل بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کے مرثیوں کی تمہید میں بین الاقوامی مسائل اور ہمارے دور کے فاشزم کا ذکر ملتا ہے۔ وہ ذاکری بھی کرتے تھے اور مرثیہ نگاری میں بھی انہوں نے نام پیدا کیا لیکن وہ گریہ وبکا کو عزاداری کا مقصد نہیں بنانا چاہتے بلکہ اس بے مثل قربانی پر نہ صرف اپنی زندگی میں عمل کرتے ہیں بلکہ اپنے سامعین وقارئین میں بھی وہ جوش وولولہ پیدا کرتے ہیں جو انسانی کردار کو سنوارنے کا کام کرتا ہے۔ اسی بنا پر 'گاندھی جی' نے امام حسینؑ کو ''دنیا کا سب سے بڑا ستیہ گرہی'' کہا تھا۔

زبان وبیان کے لحاظ سے یہ مرثیے کسی بھی اچھے مرثیہ نگار کے مرثیوں سے کمتر نہیں۔ بعض مقامات پر وہ دوسرے مرثیہ نگاروں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ مثلاً جوش فرماتے ہیں:

ہر سانس ہے نوید عذاب عظیم کی　　　گھبرا کے دو دہائی خدائے کریم کی

وحید کہتے ہیں:

ہر اک نفسِ عمر، عذابِ دو جہاں ہے　　　دھڑکن بھی مزاجِ دلِ نازک پہ گراں ہے

امام حسینؑ، حضرت علی اکبرؑ کی لاش پر جاتے ہیں۔ حضرت عباس کی شہادت نے کمر توڑ دی اور جوان بیٹا آنکھوں کی بینائی لے گیا۔ اس موقعے پر ضمیر فرماتے ہیں:

لو پاس کا انسان دکھائی نہیں دیتا　　　اب کچھ مجھے آنکھوں سے سجھائی نہیں دیتا

وحید کہتے ہیں:

آنکھوں سے سوجھتا نہ تھا دنیا تباہ تھی　　غم میں جوان بیٹے کی حالت تباہ تھی

انیس فرماتے ہیں:

وہ دشت اور وہ خیمۂ زنگار گوں کی شان　　گویا زمیں پہ نصب تھا اک تازہ آسماں

وحید کہتے ہیں:

دریا کے کنارے پہ جو خیمے ہوئے برپا　　معلوم ہوا عرش، زمیں پر اتر آیا

حضرت علی اکبر کی لاش تک پہنچنے کے لیے امام حسینؑ دشمنوں سے مدد چاہتے ہیں۔ میر ضمیر کہتے ہیں:

یاں متصل فوج جو پہنچے شہ ذی جاہ　　ہر ایک سے کہتے تھے بتاؤ مجھے لِلّٰہ
جس خاک پہ تم سب نے گرایا ہے مرا ماہ　　گم ہوگیا بیٹا مرا ' روکو نہ مری راہ

اس موقع کو وحید نے یوں نظم کیا ہے:

کہتے تھے دشمنوں سے بصد درد کچھ بتاؤ　　کس جا ہے میرا نور نظر راستہ دکھاؤ
گم ہوگیا ہے لعل مرا کوئی ڈھونڈ لاؤ　　چپ تھے شقی تو بولے کہ بیٹا صدا سناؤ

وحید اختر کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ انہوں نے مرثیے کو شیعت کے دائرے سے نکال کر ہندوستانی رواداری اور مشترکہ تہذیب کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مراثی میں دوسرے مذاہب اور ہندو دیومالا کے اثرات صاف دکھائی دیتے ہیں۔ یزید اپنا نام اور شکل بدل کر ہر دور میں زمین پر شر اور فساد پیدا کرتا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نیکی و خیر کی قوتیں بھی عام انسانوں کی شکل میں زمین پر پیدا ہوتی رہی ہیں، جو اپنے دور کے یزیدوں کا سر کچلنے میں کامیاب رہیں۔ وحید اس یزید کو کئی صورتوں میں دیکھتے ہیں۔ مثلاً

لیکن وہ علم وقت کے ہاتھوں میں نگوں سر　　چنگیز و ہلاکو ہو ' کہ ہوں سیزر و ہٹلر
تاریخ کی میزان میں تُلتے ہیں برابر　　ہر لمحہ حساب اپنا طلب کرتا ہے آکر

ہر قطرہ خون اٹھ کے پکڑ لیتا ہے ان کو
خود اپنا ہر اک ظلم جکڑ لیتا ہے ان کو

.....

لازم ہے کہ اس دور کے فرعونوں سے ٹکرائیں　　واجب ہے کہ نمردوں کے دوزخ سے گزر جائیں
مل جائے جو شدّادوں کی جنت بھی تو ٹھکرائیں　　تخریب کو تعمیر کے آداب سکھلائیں
ہر رنگ میں موجود یزیدانِ زماں ہیں　　دنیا متلاشی ہے کہ شبیر کہاں ہیں

حضرت عباس کی رخصت پر کسی ہندوستانی سورما کی روانگی کا احساس ہوتا ہے:

پھر آرتی عباس کی سورج نے اتاری

وہ ہندوستان کی تہذیبی وراثت میں اپنے مذہب کی نمائندگی کرتے ہیں:

احرام، تاج، اجنتا کی پائندگی ہے امن

توریت ' وید ' اوستا کا انعام ہے یہی　　گیتا زبور و زند کا الہام ہے یہی
گوتم ' کرشن ' رام کا پیغام ہے یہی　　عیسیٰ کی ہے دعا یہی اسلام ہے یہی

یہ صرف چند مثالیں ہیں' ورنہ ان کے کلام میں ہندوستانی عناصر وتہذیب سے خوب کام لیا گیا ہے۔انہوں نے بین کے اشعار کم کر کے مرثیوں کو فکری عنصر سے توانائی بخشی ہے۔

ان کی ذاتی زندگی کے مسائل ومصائب کا پرتو نہ صرف ان کی شاعری میں ملتا ہے بلکہ مرثیوں میں بھی اس کی جھلک نظر آجاتی ہے:

اک عمر سے ہوں مورد بیداری جاں کاہ　　جھپکی ہو گر آنکھ تو شاہد ہے خود اللہ
اس دشت سیہ بخت میں سایہ نہ کہیں چاہ　　بچھڑے ہوئے خوابوں کو جو ڈھونڈوں تو نہیں راہ

بے مونس غم شام بلا کاٹ رہا ہوں
تنہائی کی سفاک سزا کاٹ رہا ہوں

اپنی معلومات کی جانچ :

1. کربلا تا کربلا کا پہلا مرثیہ کس ہستی کے بیان میں ہے؟
2. مرثیہ ''شہید عطش'' کس کے حال میں ہے؟
3. وحید اختر کن کن شعرا سے متاثر معلوم ہوتے ہیں؟

12.6 مرثیہ شہید عطش

برسی نہیں نغموں کی گھٹائیں کئی دن سے　　سنکی نہیں مدھ ماتی ہوائیں کئی دن سے
لب بستہ ہیں جینے کی دعائیں کئی دن سے　　ناکردہ ہیں معصوم خطائیں کئی دن سے
وہ حبس ہے ' آواز کا دم ٹوٹ رہا ہے
ہر گیت کا ' ہر ساز کا دم ٹوٹ رہا ہے

اے خالقِ الفاظ ' مسیحائے معانی　　اے صانعِ لوح و قلم و سحربیانی
اے صاحبِ کن سازِ سکوتِ ہمہ دانی　　اے نغمہ گل ' صوتِ لبِ غنچہ دہانی
زاغ و زغن و بوم نواسنج ہیں کب سے
لب بستہ ہیں مرغانِ خوش الحان ادب سے

تو نے ہی زباں بخشی ہے پتھر کے دہن میں　　کانٹوں کو کیا خستبِ غنچہ چمن میں
بُو جہل کیے پیدا رسولوں کے وطن میں　　پھر حکم دیا صبر کا ہر رنج و محن میں
جس سینے کو عرفان کے بخشے ہیں سمندر
اس سینے پہ رکھوا دیے خاموشی کے پتھر

مدت ہوئی معنی نے نہ کی چہرہ نمائی　　الفاظ لیے پھرتے ہیں کشکولِ گدائی
تخئیل نے پرواز کی مہلت نہیں پائی　　بے رنگ ہیں نظریں کہ دھنک ہاتھ نہ آئی
کیا شعر و ادب ' گردِ لطافت نہیں ملتی
یوں زندہ ہیں جینے کی اجازت نہیں ملتی

یہ عہد پُر آشوب کہ ھم کو جو ملا ہے — اس بانیِ بیداد کا انداز نیا ہے
دن نکلے تو معلوم ہو دل ڈوب رہا ہے — شام آئے تو بجھتا ہوا مرقد کا دیا ہے
ہر ایک نفس عمرِ عذاب دو جہاں ہے
دھڑکن بھی مزاجِ دلِ نازک پہ گراں ہے

ہے قافلۂ وقتِ رواں سیلِ فنا کا — اڑتے ہوئے لمحات کا رکتا نہیں دریا
امید کا ہر لمحہ ہے اک خوابِ رمیدہ — ڈھونڈو تو نشانِ کفِ پا بھی نہیں ملتا
اس راہ میں ہر موڑ کمیں گاہِ اجل ہے
جو ہاتھ ہے مجروح ہے، جو پاؤں ہے شل ہے

اک سمت یہ پروازِ ترقی ہے بشر کی — ہے قبضۂ قدرت میں عناں شمس و قمر کی
افلاک میں ہے دھوم زمیں زاد نظر کی — منّت نہیں درکار دعاؤں کو اثر کی
ہر عقدۂ تقدیرِ جہاں کھلنے لگا ہے
خورشید بھی ہم وزنِ خزف تلنے لگا ہے

اور دوسری جانب ہیں غمِ زیست کے سائے — اندیشۂ جاں سے نہ یہاں نیند بھی آئے
اس آگ کے طوفاں میں کوئی چین نہ پائے — آنکھوں کے لیے خواب بھی اپنے ہیں پرائے
ذرّے کا بھی دل ٹوٹے تو ہل جاتی ہے دنیا
پرساں نہیں کوئی دلِ انساں کی تڑپ کا

انسان ہے انسان کی صحبت سے گریزاں — نے پاسِ مروّت ہے، نہ ہے عشق پہ ایماں
اخلاص کے پھولوں سے بھی خوشبو ہے پرافشاں — ہر نقش تعلق کا ہے خود آپ سے نالاں
اسرار زماں اور مکاں کے تو ہیں روشن
کھلتا نہیں کون اپنا ہے اور کون ہے دشمن

دل محض ہے اک آلۂ خوں فیضِ مشیں سے — دنیا سے تعلق، نہ علاقہ کوئی دیں سے
ہے علم کا سینہ بھی تہی سوزِ یقیں سے — احساس کا رشتہ ہے زماں سے نہ زمیں سے
ہیں جسم کہ مرغولے بھٹکتے ہیں ہوا میں
ہیں ذہن کہ شعلے سے بھڑکتے ہیں خلا میں

ہے شعبدۂ فکر فنِ اہلِ سیاست — بک جاتی ہے، لُٹ جاتی ہے افکار کی عصمت
ممنوع ہے، معتوب ہے ذہنوں کی دیانت — ممدوح ہے، مرغوب ہے ایماں کی تجارت
یہ طرفہ ستم وقت نے ایجاد کیا ہے
ویران ہیں گھر، روضوں کو آباد کیا ہے

گر کوئی کرے عظمتِ انساں کا سبق یاد — آوارہ وطن ہوتا ہے وہ خانماں برباد
ہے فکرِ معاش اُس کے لیے روز کی بیداد — آئینِ فقیہانِ ہوس کرتا ہے ارشاد
تقدیسِ محبت کا بھی ذکر آنے نہ پائے
یہ شمع تہہِ دامنِ فکر آنے نہ پائے

بیدار نگاہوں پہ ہے نظاروں کی قدغن — حسّاس دلوں کے لیے ہر بات ہے الجھن
تابندہ دماغوں میں ہیں افکار کے مدفن — فرخندہ جبینوں کا ہر اک سنگ ہے دشمن
اے بے ہنری! پاؤں اماں جاں کی تو بولوں
میزانِ مژہ پر غمِ کونین کو تولوں

بازارِ زر و سیم میں کھولی ہے وہ دکاں — جس جنس کی قیمت نہیں جز نالۂ حیراں
در در پہ گیا لے کے میں شمعِ دلِ سوزاں — ہے کون خریدارِ دُرِ اشکِ غریباں
جو آنکھ بھی چھلکے، وہ مرا دیدۂ تر ہے
جو قلب ہو صد چاک، مرا لختِ جگر ہے

اس طور سے مضمون سخن جمع کیا ہے — ہر دامنِ گل بن کے صبا میں نے سیا ہے
شبنم میں تھا جو زہر، کرن بن کے پیا ہے — ہر ایک صدف کو دُرِ نایاب دیا ہے
تب فن نے بھی یوں میری مسیحائی ہے مانی
گر لفظ کو چھولوں تو پُکار اُٹھیں معانی

اک عمر میں عقدہ یہ کھلا طبعِ رواں پر — سودائے سخن کی ہے بنا صرف زیاں پر
نغمہ جو کوئی چھیڑیں تو بن جاتی ہے جاں پر — دانش کے گہر رولیں تو بندش ہے زباں پر
پتھر سے جو سر پھوڑیں تو نغمات کا خوں ہو
سورج سے اگر رشتہ ہے، ذرّات کا خوں ہو

اک عمر سے ہوں موردِ بیداریِ جاں کاہ — جھپکی بھی ہو گر آنکھ تو شاہد ہے خود اللہ
اس دشتِ سیہ بخت میں سایہ نہ کہیں چاہ — بچھڑے ہوئے خوابوں کو جو ڈھونڈوں تو نہیں راہ
بے مونسِ غم شامِ بلا کاٹ رہا ہوں
تنہائی کی سفاک سزا کاٹ رہا ہوں

جو خواب بھی دیکھا، وہ پریشاں نظر آیا — اپنا جسے سمجھا، وہ گریزاں نظر آیا
جس باغ کو سینچا، وہی ویراں نظر آیا — پوچھا جسے وہ چاک گریباں نظر آیا
جو ہے ستم دہر سے فریاد بہ لب ہے
کلیوں سے سبب چپ کا جو پوچھیں تو غضب ہے

شمعِ سرِ رہ بن کے میں صدیوں سے ہوں بیدار — انداز سے ہر موجِ ہوا کے ہوں خبردار
ان آنکھوں نے دیکھی ہے زمانے کی بھی رفتار — محفوظ تصور میں ہیں ہر عہد کے آثار
آدم ہوں، سفر میرا ازل تا بہ ابد ہے
عیسیٰ ہوں، مرا گھر ہے، پتہ ہے نہ لحد ہے

تاریخ کے ہر صفحے پہ ٹوٹا ہے نیا قہر — بن باس ملے رام کو، گوتم کو غمِ دہر
عیسیٰ تو چڑھے دار پہ، سقراط پیے زہر — پیاسا پسرِ ساقیِ کوثر ہو لبِ نہر
مہتابِ شبِ چار دہم چاندنی مانگے
چوکھٹ پہ اندھیروں کی سحر روشنی مانگے

خسرو کا محل دولتِ شیریں سے غنی ہو — فرہاد کے تیشے کو غمِ خود شکنی ہو
جو شخص سرافراز ہے گردن زدنی ہو — بوئے گلِ تر وقفِ غریب الوطنی ہو
کانٹے تو لہو پی کے ہوں سیراب و سرافراز
شاہین فلک سیر ہو صیدِ غمِ پرواز

ہر عہد میں بو جہل رہے صاحبِ دولت — پائی ہے تہی ذہنوں نے وسعت پہ حکومت
اندھوں ہی کو مانا گیا اربابِ بصیرت — کم ظرفوں سے منسوب ہے حاتم کی سخاوت
کیوں اس کو ستم گارِ دنیا نہ کہیں ہم
جلا دوں کے آگے ہیں نبیوں کے بھی سر خم

جو بھی سگِ دنیا کی پرستش نہیں کرتا — گھر اس کا زر و مال سے ہرگز نہیں بھرتا
جو حق کے لیے قیدِ ستم سے نہیں ڈرتا — ہر سانس پہ جینے کے لیے ہے وہی مرتا
کٹ جاتی ہیں اظہارِ صداقت میں زبانیں
دب جاتی ہیں بے معنی صداؤں میں اذانیں

کِس مُنہ سے کہیں ہم کہ غلط بخش ہے فطرت — کافی ہے ہمارے لیے افکار کی دولت
ہے روشنیِ ذہن ہی شاعر کی وراثت — ہیں کون و مکاں اپنے اگر دل میں ہے وسعت
بادہ طلبی شوق کی دریوزہ گری ہے
صد شکر کہ تقدیر ہی یاں تشنہ لبی ہے

ہر دور میں ہم لوگ رہے غم کے نگہباں — دل تنگ نہ کر پائی ہمیں تنگیِ دوراں
ہمت ہی سے آباد رہا عرصۂ امکاں — ہیں دل زدگاں آبروئے عصمتِ جاناں
نقشِ قدم اپنے ہیں بیابانوں میں روشن
خونِ رگِ مظلوم ہے ایوانوں میں روشن

ہر چند کہ کر پایا ہمیں کوئی نگوں سار — لیکن ہیں ابھی راہ میں حائل کئی کُہسار
طوفانوں سے لڑنا ہے برائے دُرِ شہوار — دے دیں نہ رہِ حق میں تو سرتن پہ گراں بار
انصاف سے معمور زمیں گر نہیں ہوگی
تسخیر دو عالم کی مہم سر نہیں ہوگی

لازم ہے کہ اس دور کے فرعونوں سے ٹکرائیں — واجب ہے کہ نمرودوں کے دوزخ سے گزر جائیں
مل جائے جو شدادوں کی جنت بھی تو ٹھکرائیں — تخریب کو تعمیر کے آداب بھی سکھلائیں
ہر رنگ میں موجود یزیدانِ زماں ہیں
دنیا متلاشی ہے کہ شبیرؑ کہاں ہیں

آوارگیِ کوچۂ جاناں اِدھر آنا — آشفتگیِ چشمِ نگاراں اِدھر آنا
وارفتگیٔ دشتِ غزالاں اِدھر آنا — تابندگیِ دیدۂ گریاں اِدھر آنا
گنجینۂ صاحب نظراں تم کو دکھائیں
تدبیرِ علاجِ غمِ جاں تم کو سکھائیں

اک مشہد خونین جگراں دور سے دیکھو — اک دولتِ بیدار و جواں دور سے دیکھو
اک گنجِ شہیداں ہے عیاں دور سے دیکھو — اک شامِ غریباں کا دھواں دور سے دیکھو
اس دشت میں ہر غم کے لیے خاکِ شفا ہے
ہر ذرّے پہ اک سجدۂ اربابِ وفا ہے

مرہم کی ہے گر فکرِ تو زخمی اِدھر آئیں — چاہیں جو مداوائے الم چارہ گر آئیں
کشکول لیے اشکوں کے چشمانِ تر آئیں — حسرت ہے تجلی کی تو صاحب نظر آئیں
موسیٰ کو ملا ہے یدبیضا اسی در سے
اعجاز اثر ہے دمِ عیسیٰ اسی در سے

افسردہ ہو جو شورشِ دنیائے دنی سے — دل تنگ ہو جو نیزۂ غربت کی اَنی سے
پامال ہو جو گردِ غریب الوطنی سے — نالاں ہو جو آلام کی ناوک فگنی سے
ہم اس کو دکھائیں کہ ستم سہتے ہیں ایسے
مر کر بھی رہ حق میں امر رہتے ہیں ایسے

اس دشت کو بھولا ہے' نہ بھولے گا وہ منظر   جب اُترے تھے اربابِ شہادت یہاں آ کر
کچھ طفل تھے' کچھ عورتیں اور مرد بہتر   نرغے کے لیے جمع ہوئے لاکھوں کے لشکر
ان لاکھوں کے نام آج نہیں یاد کسی کو
کرتا ہے ہر اک یاد حسینؑ ابنِ علیؑ کو

وہ لشکرِ اشرار ہے گُم سیلِ فنا میں   اب خاک بھی اس کی نہیں دامانِ ہوا میں
آوازِ ستم کی نہیں لہریں بھی فضا میں   شمشیر وسناں غرق ہیں دریائے جفا میں
آوازۂ حق پھر بھی جہاں گیر ہے اب تک
ہر سینے میں روشن غمِ شبیرؑ ہے اب تک

اس دشت میں گونجی ہوئی اب تک وہ صدا ہے   جو مرہمِ دل سوزیِ اربابِ وفا ہے
جو چارۂ بے چارگیِ دستِ دُعا ہے   جو گوہرِ دامانِ ساعت کی ضیا ہے
دیکھے تو کوئی وسعتِ آوازِ صداقت
ہر دور کو سکھلا گئی اندازِ صداقت

آزادیٔ افکار مئے قند نہیں ہے   جو لب ہے حق آگاہ' وہ خورسند نہیں ہے
سن لے کوئی اُمید یہ ہر چند نہیں ہے   پھر بھی تو زبانِ شہدا بند نہیں ہے
کٹ جائے زبان ہر بُنِ مو بول رہا ہے
سر تن سے جدا ہیں تو لہو بول رہا ہے

اس دشت میں وہ قافلہ اترا تھا بہ مشکل   جس کو نہ اماں بیتِ اماں میں ہوئی حاصل
جس کے نہ قدم روک سکی کوئی بھی منزل   تھا دشتِ بلا لیلیِ مقصود کی محمل
اترے جو یہاں عرشِ منوّر ہی پہ اترے
یاں سے جب اٹھے چشمۂ کوثر ہی پہ اترے

اس قافلۂ امن کا انداز نیا تھا   اس لشکرِ بے تیغ کا آئین وفا تھا
اس فوج کا سالار امامِ شہدا تھا   اس کعبۂ ایماں میں ہر اک قبلہ نما تھا
ماتھا جہاں ٹیکا وہیں کعبہ سمٹ آیا
وہ شانِ عبادت تھی کہ سورج پلٹ آیا

کتنے ہی علَم دیکھ چکی ایسے بھی دنیا   اقلیموں پہ تھا سایہ فگن جن کا پھریرا
تھا جن کا نشاں اوج میں ہم دوشِ ثریا   کھل جائیں پھریرے تو ہو دن میں بھی اندھیرا
حرکت میں جو آئیں تو چلے موت جلو میں
بہہ جاتے تھے تنکوں کی طرح ملک بھی رو میں

لیکن وہ علَم وقت کے ہاتھوں میں نگوں سر   چنگیز و ہلاکو ہو کہ ہوں سیزر و ہٹلر
تاریخ کی میزان میں تُلتے ہیں برابر   ہر لمحہ حساب اپنا طلب کرتا ہے آ کر
ہر قطرۂ خوں اٹھ کے پکڑ لیتا ہے ان کو
خود اپنا ہر اک ظلم جکڑ لیتا ہے ان کو

فوجوں کے سمندر میں ہیں کچھ ایسے نشاں بھی   جو روحِ لطافت بھی ہیں اور کوہِ گراں بھی
جو دست بہ شمشیر بھی ہیں جائے اماں بھی   جن کے لیے رک جاتا ہے خود سیلِ زماں بھی
بڑھ کر جنھیں سینے سے لگا لیتی ہے تاریخ
یہ ہیں وہ علَم' جن کو اٹھا لیتی ہے تاریخ

شبیرؑ کے لشکر کا علم بھی ہے نرالا　　خورشید بھی اک ذرّہ ہے' اس کا ہے وہ ہالا
ظلمات سے کونین کو اس نے ہی نکالا　　گرتے ہوئے انسانوں کو اِس نے ہی سنبھالا
یہ بارِ امانت جو اُٹھالے وہ علم دار
یہ رایتِ حق بھی جو سنبھالے وہ علم دار

یہ رایتِ حق عظمتِ انساں کا ستارا　　قرآنِ صداقت کا ہے یہ آخری پارا
کمزوروں کی آواز غریبوں کا سہارا　　ظالم کے لیے موت کا رقصندہ شرارا
جذب اس میں رسالت کی' امامت کی نگاہیں
جھک جاتی ہیں اربابِ حکومت کی نگاہیں

آغاز کیا مقصدِ بعثت کو اسی نے　　تکمیل کیا کارِ نبوت کو اسی نے
پورا کیا انسان پہ نعمت کو اسی نے　　پھیلایا ہے پیغامِ شہادت کو اسی نے
حاملِ ہے جو اس کا' وہ رسالت کا امیں ہے
عصمت کا نگہباں ہے' امامت کا امیں ہے

اس قافلۂ امن کے افرادِ دلاور　　کس شان سے آئے تھے ہتھیلی پہ لیے سر
ہاتھوں میں نہ تیر و تبر و تیغ و خنجر　　حق دل میں تھا' پیغام محبت تھا زباں پر
تلوار بھی تھا' کلمۂ حق ان کی سپر بھی
منزل بھی تھا حق ان کے لیے' راہ گزر بھی

دریا کے کنارے پہ جو خیمے ہوئے برپا　　معلوم ہوا عرش زمیں پر اُتر آیا
اک قطعۂ فردوسِ بریں بن گیا صحرا　　بڑھ بڑھ کر قدم لیتا تھا امڈا ہوا دریا
دل سیر تھے ایسے کہ ترائی کو بھی چھوڑا
کیا سلطنتِ شام' خدائی کو بھی چھوڑا

دشمن کو بھی دکھلایا کہ ہیں ساقیِ کوثر　　غیروں نے بھی دیکھا کہ ہیں یہ شافع محشر
جنگجویوں نے بھی مانا کہ ہیں امن کے پیکر　　سجدہ کیا شکرانے کا آکر تہہِ خنجر
قاتل نے بھی اظہار عقیدت کا کیا ہے
تلواروں میں بھی درس محبت کا دیا ہے

وہ دشت' وہ موسم کی تمازت' وہ ہوا گرم　　اک آتشِ سیال سے تھے ارض و سما گرم
تھی ریگ تپاں صورتِ میدانِ قضا گرم　　خیمے تھے حبابوں کے بھی سورج سے سوا گرم
تھا شعلوں کے دامن میں رسولوں کا سفینہ
یا آگ کے طوفان میں تھا پھولوں کا سفینہ

اصحابِ حسینی میں ہر اک سرو سمن تھا　　تھا شیرِ وغا' بزم میں جو غنچہ دہن تھا
رم کرتا تھا باطل سے جو آہوئے ختن تھا　　نرمی میں صبا' جوش میں کہسار شکن تھا
ہر اک تھا شہنشاہ غریب الوطنی میں
کوثر کو بھی دیکھا نہیں تشنہ دہنی میں

دکھلا دیا کونین کو کرتے ہیں وفا یوں　　کرتے ہیں حقِ زیست جواں مرد ادا یوں
اڑ جاتے ہیں حق بات پر مردانِ وغا یوں　　عزت کے لیے دیتے ہیں جاں نامِ خدا یوں
کم جمع ہوئے ہوں گے کہیں ایسے مجاہد
خود جن کی شرافت پہ شرافت بھی ہو شاید

یہ لوگ ہی انسان کی عظمت کے امیں تھے — یہ پیکر انوار محبت کے امیں تھے
یہ صادق الاقوال صداقت کے امیں تھے — یہ غازیِ کردار امامت کے امیں تھے
جب تک رہے شبیرؑ پہ آنچ آنے نہ پائی
انسان کی توقیر پہ آنچ آنے نہ پائی

یہ لوگ تھے پروانۂ شمعِ دلِ ایماں — یہ لوگ تھے خورشید بکف صبحِ درخشاں
یہ لوگ تھے پیغمبرِ اخلاص کے قرآں — یہ لوگ تھے آئندہ زمانوں کے نگہباں
ہم آج جو ہر ظلم سے ہوتے ہیں صف آرا
یہ بھی انہی لوگوں کا دَر پردہ اشارہ

ان لوگوں نے قاتل سے بھی کی مٹ کے بھلائی — ان لوگوں نے خود ہار کے جیتی ہے لڑائی
قیمت گہرِ جاں کی جو ظالم سے نہ پائی — لی مول حیاتِ ابدی دے کے خدائی
برجِ فلکِ زیست کا مہتاب ہے ہر ایک
شہرِ ابدیّت کا نیا باب ہے ہر ایک

یہ لوگ خداوندِ خدایانِ جہاں تھے — میدانِ شجاعت میں ہمالہ سے گراں تھے
تاریکیِ نفرت کے لیے برق بہ جاں تھے — انسانوں کا ہو قحط تو یہ آبِ رواں تھے
خود چشمۂ حیواں سے تو اک بوند نہ پائی
ہر خارِ رہِ غم کی مگر پیاس بجھائی

پیری تھی ضعیفوں کی ارادے کی جوانی — بچوں کے لیے شہد تھا تلوار کا پانی
سیلاب تھی پیاسوں کی طبیعت کی روانی — سلطانوں کی شرط ان کے غلاموں نے نہ مانی
بک جائیں کئی یوسفِ کنعاں وہ جواں تھے
پابوسی کریں قیصر و خاقاں، وہ جواں تھے

ان پھولوں کے داغ ابن محمدؐ نے اٹھائے — یہ لعل و گہر بندگیِ حق میں لٹائے
وہ صابر و شاکر کہ گِلہ لب پہ نہ لائے — خوں ہو کے بہا دل، مگر آنسو نہ بہائے
ہوتے جو محمدؐ انھیں قرآن سمجھتے
ہر پیاسے کو اللہ کا احسان سمجھتے

اصحاب سدھارے تو اعزّا کی تھی باری — مسلم کے پسر، عون و محمد ہوئے واری
قاسم کو دلہن بن کے شہادت ہوئی پیاری — پھر آرتی عباسؑ کی سورج نے اتاری
گر کر بھی علم خاک پہ خورشید نشاں تھا
مولا کے ارادے کی طرح درد جواں تھا

ہم شکلِ نبیؐ تھے گلِ گلزارِ محمدؐ — رفتار میں گفتار میں آثارِ محمدؐ
تابانیِ رخ مطلعِ انوارِ محمدؐ — وہ لحن کہ تھا گرمیِ بازارِ محمدؐ
نعمت کی تھی تکمیل یہ تفسیر نبیؐ کی
ایک ایک ادا ان کی تھی تصویر نبیؐ کی

جس منزلِ دشوار میں رہ جاتے پیمبر — جس موجۂ گرداب سے تھا نوحؑ کو بھی ڈر
یعقوبؑ و براہیمؑ بھی کھاتے ہیں جہاں ٹھوکر — جو صدمہ ہوا رحمتِ عالم کو بھی دو بھر
اس عہدۂ مشکل سے بھی شبیرؑ بر آئے
نعشِ گلِ رعنا پہ سنبھالے جگر آئے

تاریخ میں بے مثل ہے صبرِ شہ والا — عیسیٰ نے تن تنہا لہو ' اپنا اچھالا
سقراط نے بھی خود ہی پیا زہر کا پیالا — شانِ پسرِ فاطمہؑ ہے سب سے دو بالا
ہر کشتے کے ساتھ آپ ہوئے کشتۂ داور
پیتا نہ کوئی جام شہادت کے بہتر

سب کچھ بھی لٹا کر یہ لٹانے کی تھی حسرت — جیسے کہ خداوند سے ہو اب بھی ندامت
یوں دل سے لگا لیتے تھے ایک ایک کی میت — جیسے کہ ہر اک داغ تھا انعام مشیّت
اک لاش اٹھی ' دوسری تیار دھری تھی
کٹتی گئی جتنی بھی یہ شاخ اور ہری تھی

کوئی نہ ہو' پر کلمۂ حق ساتھ تھا ہر آن — ایقان صداقت سے قوی تھے جگر و جان
دل سرد تھا جینے سے مگر رخ پہ وہی شان — وہ رعب نظر تھا کہ لرز جاتا تھا میدان
آواز میں دنیا کے شہیدوں کی تھی آواز
ہر عشق کے نغمے سے ہم آہنگ تھا یہ ساز

اس دشت سے اٹھی تھی جو آوازِ جہاں گیر — اعدا نے کیا اپنے تئیں کشتۂ شمشیر
کب قتل ہوئی ظلم سے سچائی کی تاثیر — پہنا نہیں سکتا کوئی آواز کی زنجیر
شامل اس اک آواز میں آوازِ خدا تھی
ساتھ اس کے ازل اور ابد کی بھی صدا تھی

صدیاں متوجہ تھیں کہ حق بول رہا ہے — انسان کی قسمت کی گرہ کھول رہا ہے
وہ حق جو خدا کی طرح انمول رہا ہے — پیاسا ہے مگر کانوں میں رس گھول رہا ہے
ساکت ہے جہاں' عقدہ کشا بول رہا ہے
انسان کے ہونٹوں سے خدا بول رہا ہے

شبیرؑ کی آواز محمدؐ کا تھا پیغام — وہ طرزِ ملامت تھی کہ بے طعنۂ و دشنام
وہ لہجہ کہ ہر لفظ تھا اک مصحفِ الہام — وہ نرمی کی نکہت بھی ہو کم جس سے سبک گام
وہ پھول کی پتی کہ رگِ سنگ بھی کٹ جائے
وہ بارِ لطافت ' طبقِ ارض الٹ جائے

فرماتے تھے کس دبدبۂ و جاہ سے سرکار — ہیں ' ہیچ نظر میں مری فرعونوں کے دربار
جانو ہوسِ مال کو رسوائیِ بازار — سمجھو سپہِ ظلم کو ٹوٹی ہوئی تلوار
یہ سلطنت شام تو خاک کف پا ہے
ہے گردِ قدم ' وسعت کونین بھی کیا ہے

منظور ہم انسان کی ذلت نہیں کرتے — مومن کبھی ایماں کی تجارت نہیں کرتے
آزاد غلاموں کی اطاعت نہیں کرتے — نیلام شریف اپنی شرافت نہیں کرتے
اے خالقِ کُل ! تیری دُہائی ہے دُہائی
زیست اور کرے موت کی چوکھٹ پہ گدائی

انسان سے بیعت کا طلب گار ہو حیواں — مُردے کو ہو دعوائے مسیحائی دوراں
بندہ سگِ دنیا کا ہو کعبے کا نگہباں — بوجہل محمدؐ سے اطاعت کا ہو خواہاں
ذرّے کو ہے یہ زعم ہمالا پہ ہے بھاری
قطرے کو ہے یہ وہم کہ دریا پہ ہے بھاری

ہے جھوٹ کی خواہش کہ صداقت کو خریدے　　کم ظرف کو ارماں کہ سخاوت کو خریدے
زر کو ہوس ایمان کی دولت کو خریدے　　غاصب کو یہ امید دیانت کو خریدے
ہم وہ کہ بکیں گر تو بکے مرضی حق بھی
افلاک بھی بک جائیں زمینوں کے طبق بھی

ہم تشنگیِ روحِ تمنائے صداقت　　ہم عزمِ سرفرازیِ پروازِ شجاعت
ہم باعثِ تخلیق جہاں ' خاتمِ نعمت　　ہم صاحبِ لولاک کی ہیں زندہ امانت
ہم صاحب تطہیر ہیں ' ہم رحمتِ عالم
ہم آیت تکمیلِ عروج بنِ آدم

تم بندۂ ظلمات ' خداوندِ سحر ہم　　تم ظلم کی تلوار ' محبت کی سپر ہم
تم ابن زمانہ ہو تو فردا کی خبر ہم　　تم جہل کی آواز ہو ' عالم کی نظر ہم
ہے خون اُدھر ' اشک کی سوغات ادھر ہے
ہے ظلم اُدھر ' دل کی مناجات ادھر ہے

تم آج سرافرازوں کے سر چھین رہے ہو　　تابندگی دیدۂ تر چھین رہے ہو
معصوم دعاؤں سے اثر چھین رہے ہو　　تم اہلِ بصارت سے نظر چھین رہے ہو
ہم یورش باطل سے اماں دیتے ہیں تم کو
اک دولتِ بیدار و جواں دیتے ہیں تم کو

جاں دے کہ ہم انسانوں کو جاں بخش رہے ہیں　　مظلوموں کے اشکوں کو زباں بخش رہے ہیں
ہم لٹ کے تمہیں گنجِ گراں بخش رہے ہیں　　ہمت ہوتو لو ' کون و مکاں بخش رہے ہیں
کل یہ نہیں کہنا کہ زیاں کار رہے تم
ظلماتِ جہالت میں گرفتار رہے تم

حق ساتھ ہو جس کے اسے کچھ بھی نہیں درکار　　تیغ و تبر و تیر تو غاصب کے ہیں ہتھیار
ظلم اپنی لحد آپ کیا کرتا ہے تیار　　ہم موت میں بھی دیکھے ہیں فتح کے آثار
ہم آج رہے چپ تو ہے قرآن کا نقصان
سو گند زمانے کی ' ہے انسان کا نقصان

ہم رات کو دیں حکم تو سورج نکل آئے　　ہم ماریں جو ٹھوکر ' ابھی دریا اُبل آئے
ہم تیغ اٹھالیں تو تمہاری اجل آئے　　ہم جب بھی کہیں نظمِ جہاں میں خلل آئے
مختار ادارے کے ہیں ' مجبور نہیں ہم
تم کیا ہو خدائی سے بھی معذور نہیں ہم

مقصود ہے تم قعرِ ضلالت سے ابھر آؤ　　منظور ہے ' کوہ ہوس زر سے اُتر آؤ
مطلوب ہے عزت تو غلامی سے گزر آؤ　　مرغوب ہے گر جام شہادت تو اِدھر آؤ
ہے ذلتِ جاوید یزیدوں کے حشم میں
تاجِ ابدیت ہے شہیدوں کے قدم میں

ہے کون معین دلِ بے چارہ و بے یار　　ہے کون رفیق شہہ بے یاور و انصار
ہے کون محمدؐ کی امانت کا نگہدار　　ہے کون بن فاطمہؑ زہرا کا مددگار
کیا بولتے پتھر ' نہ سماعت نہ زبان تھی
کہنے کو تو لبیک بس اک ننھی سی جاں تھی

اک دن میں جو شبیرؑ نے صدمات اٹھائے — اک صدمہ بھی ان میں کا کوئی جھیل نہ پائے
اک نیش اَلم بھی جو کسی دل میں در آئے — اک عمر خلش اس کی رگ جس سے نہ جائے
یوں قطع رہِ درد کوئی کر نہیں سکتا
زندہ کوئی ہر سانس پہ یوں مر نہیں سکتا

قاسمؑ تھے نہ اکبرؑ تھے، نہ عباسؑ دلاور — جاں پہلے ہی قربان کیے سوتے تھے صفدر
لیکن شہِ مظلوم کی آواز کو سُن کر — اک بار لرز اٹھا تھا ہر اک تن بے سر
ہر لاش پکاری کہ نثار آپ پہ ہے جان
سو بار ملے زیست تو سو بار ہوں قربان

فرمایا پلٹ کر سوئے اصحاب گرامی — تم میں سے ہر اک عشق کے میداں میں ہے نامی
دیتے ہیں تمہیں جھک کے پیمبر بھی سلامی — زیبا ہے شہنشاہوں کو ایسوں کی غلامی
ہوتے ہیں شہیدانِ رہِ حق کے یہی طور
جو تم نے وفا کی ہے، کرے گا کوئی کیا اور

یاں گنجِ شہیداں میں ہوئی لاشوں میں ہلچل — واں سن کے صدا باپ کے اصغرؑ ہوئے بے کل
آمادۂ نصرت ہوئے، کی دیر نہ اک پل — چھوٹے تھے بہت جا نہ سکے خود سوئے مقتل
یوں تڑپے کہ گہوارے سے باہر اچھل آئے
خشک آنکھوں کے صحرا سے بھی آنسو نکل آئے

اہلِ حرم پاک میں برپا ہوا کہرام — معلوم یہ ہوتا تھا قیامت کا ہے ہنگام
سجادؑ بھی چونک اٹھے غشی سے بصد آلام — آوازِ فغاں پہنچی جو تا شاہِ خوش انجام
دل دھڑکا کہ کوئی حادثہ خیمے میں ہوا ہے
یا پیاس کی شدت سے کوئی طفل موا ہے

خیمے سے اٹھا شور تو شبیرؑ پلٹ آئے — محرومیِ امت سے غمیں، فرق کو نیوڑھائے
خیمے کے قریب آن کے لب پر یہ سخن لائے — کیا حادثہ گزرا ہے کوئی مجھ کو تو بتلائے
گریہ تھا گلوگیر، کوئی بول نہ پایا
ہلتا ہوا گہوارۂ اصغر نظر آیا

معلوم ہوا پیاس کی شدت سے ہیں بے ہوش — چھ ماہ کا سن، نے غم فردانہ غم دوش
معصوم کا گہوارہ ہے ماں بہنوں کی آغوش — پھر بھی اثر خون حسینی کا ہے یہ جوش
پیغامِ طلب سنتے ہی یوں چونک پڑے ہیں
گویا کہ علیؑ تیغ بکف رن میں کھڑے ہیں

فرمایا کہ اس ہدیۂ آخر کو بھی لاؤ — چہرہ علی اصغرؑ کا مجھے لاکے دکھاؤ
پیاس ان کی بجھانی ہے، نئے کپڑے پنھاؤ — جاگے ہیں تو اب لوریاں دے کر نہ سلاؤ
اس چاند سے چہرے پہ گھٹا چھا نہیں سکتی
بے پانی پیے نیند انھیں آ نہیں سکتی

زینبؑ نے کہا، چاہیے سورج سے حفاظت — لو تند، ہوا گرم، فضا مصدرِ حدت
بھوکے بھی ہیں پیاسے بھی ہیں کچھ کچھ ہے حرارت — مرجھائے نہ اس دھوپ میں یہ چاندسی صورت
آپ اپنی عبا ان کو اڑھا دیجئے بھائی
گھبرائیں تو دامن کی ہوا دیجئے بھائی

اصغر کے لیے روتی ہے رہ رہ کے سکینہ   سمجھائیے اس کو بھی ذرا شاہِ مدینہ
خشک اتنے میں اصغرؑ کا بھی ہوجائے پسینہ   طوفان قیامت کا ہے، نازک ہے سفینہ
یہ گرم ہواؤں کا ستم سہہ نہ سکیں گے
اس پیاس میں لو دھوپ کا غم سہہ نہ سکیں گے

شبیر تھے ہر ایک سے آنکھ اپنی چرائے   مقصد تھا کوئی ہدیۂ حق بچنے نہ پائے
پانی کے بہانے سے تھے لینے انہیں آئے   کیا کہتے کہ اب بچے سے ماں ہاتھ اٹھائے
انجام جو ہونا تھا وہ سب جان رہے تھے
اصغرؑ کو لیے گود میں چپ چاپ کھڑے تھے

اے کاش کوئی کہتا کہ اے سرورِ عالم   لے جائیے ان کو نہ خدا کے لیے اس دم
ہیں سنگ دل و سنگ نظر شام کے اظلم   ان کے لیے اک عمر اٹھائیں گے حرم غم
یہ داغ ہر اک قلب میں تا عمر رہے گا
ہر آنکھ سے ہو ہو کے لہو قلب بہے گا

[illegible] ہوئے دامن میں شہِ دیں   تھا خشک لب و خشک دہن یہ گل بے کیں
[illegible] یہ ہے کون سا آئیں   قربانیاں اس شان کی دنیا نے نہ دیکھیں
جس وقت کہ دامن رُخِ زیبا سے ہٹا ہے
تھا سب کو گماں رحل پہ قرآن کھلا ہے

یہ [illegible] آں تھا کہ حجت آخر   مظلومیت آلِ عبا ہوگئی ظاہر
رو[illegible] تھا جگر شام کے ہر خون کا تاجر   کانپ اٹھا تھا اس دار سے ہر جابر و قاہر
عباسؑ کے حملے سے تو بچ جانا تھا آساں
پر ضربت اصغرؑ کا نہیں تھا کوئی درماں

منہ [illegible] لگے دشمن کے سپاہی   وہ نور تھا، شرما گئی خود تیرہ نگاہی
اک [illegible] دینے لگی دل کی سیاہی   دینے لگے قاتل بھی صداقت کی گواہی
اعجاز تھا یہ ساقیِ کوثر کے خلف کا
ذلت کو خیال آگیا انساں کے شرف کا

بے [illegible] تھے بے بس تھے جفاکار   خوشبوئے صداقت سے تھے عاجز رسن و دار
موم[illegible] یہ اٹھتی نہیں تلوار   پیغامِ خموشی کو دباتی نہیں للکار
[illegible] میں یہ جرات کو وہ شمشیر پکڑتا
کٹ جاتے تھے دل، تیرِ نظر جس پہ بھی پڑتا

ہاں ایک کماں ایسی تھی، جیسے ہو کڑا دل   جو تیر بھی اس کا تھا، وہ تھا زہر سے قاتل
مرجاتے جو کھاتے بھی ہوا اس کی [illegible]   ہو پاتا دل کوہ بھی اس کے نہ مقابل
اس تیر کو چھ ماہ کے معصوم نے روکا
شبیر کے دل، بچے کے حلقوم نے روکا

عباسؑ کے صدمے سے خم آیا تھا کمر میں   اکبرؑ کے بچھڑنے سے کمی آئی نظر میں
قاسمؑ کی جواں مرگی کا تھا زخم جگر میں   تھے داغ بھتیجوں کے دل خاک بسر میں
ظالم نے جو یہ پیک اجل جوڑ کے چھوڑا
قلبِ شہہِ مظلوم کو بھی توڑ کے چھوڑا

اک دن میں بڑے صدمۂ جاں کاہ سہے تھے ہر پیارے کی رخصت کا سماں دیکھ چکے تھے
ہر لاش اٹھالینے کے لیے آپ گئے تھے پر آنکھوں کے سوگند کہ آنسو نہ بہے تھے
خاموشی اصغرؑ نے وہ روداد سنائی
اس طرح سے دل ٹوٹا کہ آواز نہ آئی

اصغرؑ نے بڑے چاؤ سے دیکھا رخِ شبیرؑ ہو داد طلب جیسے شجاعت کا وہ بے شیر
تھی خون میں ڈوبی ہوئی وہ چاندسی تصویر ہونٹوں پہ تبسم کی چمکتی ہوئی تحریر
وہ شوق شہادت کہ شہادت کو بھی پیار آئے
پیروں سے نہ چل سکتے تھے گودی میں سوار آئے

شبیرؑ وہیں بیٹھ گئے تھام کے پہلو ہر چند کیا ضبط مگر امڈے تھے آنسو
سلجھانے لگے بیٹے کے الجھے ہوئے گیسو سونگھا کیے پیرابن خوں بار کی خوشبو
یاں ابن محمدؐ پہ قیامت کی گھڑی تھی
دروازے پہ ماں ہاتھوں کو پھیلائے کھڑی تھی

کیا ظلم ہے اس بحرِ سخاوت کا شناور قاتل کو بھی جو دیتا تھا چھلکا ہوا ساغر
اک بوند کا طالب ہو برائے علی اصغرؑ اور تیر کے ہونٹوں سے جواب آئے پلٹ کر
لوٹانے کے وعدے سے انہیں لائے تھے گھر سے
نظریں نہ ملا سکتے تھے اب ماں کی نظر سے

اک گام بھی شہ نے سوئے خیمہ نہ بڑھایا ایسے تھے حیادار کہ پھر منہ نہ دکھایا
میت پہ وہیں دامنِ خوں گشتہ اڑھایا پانی تھا چھڑکنے کے لیے منہ پہ نہ سایا
منہ رکھے ہوئے منہ پہ کھڑے روتے تھے شبیرؑ
اصغرؑ کا لہو اشکوں سے یوں دھوتے تھے شبیرؑ

معلوم تھا اسوارِ اجل کی تگ و دو میں لاشوں کی بھی حرمت نہیں کرنے کی یہ قومیں
یہ لاش بھی پامال نہ ہو ظلم کی رو میں گہنائے تو فرق آئے گا اس چاند کی ضو میں
یہ سوچ کے شبیرؑ نے خود قبر بنائی
اور صورتِ گل خاک کے پردے میں چھپائی

فرمایا کہ اے روٹھ کے جاتے ہوئے راہی ہے تیری شہادت مری حجت کی گواہی
غیرت نے تری بوند بھی پانی کی نہ چاہی تو ہار کے جیتا مرے ننھے سے سپاہی
جو قلب ہے صد چاک، وہ گہوارہ ہے تیرا
جو چشم ہے نم، ساغرِ صد پارہ ہے تیرا

اب ماں کی ہے آغوش یہی گوشۂ تربت یہ سچ ہے کہ تنہائی میں بڑھ جاتی ہے وحشت
یاد آتی ہے ہر چاہنے والے کی محبت راس آئے مرے چاند تجھے قبر کی ظلمت
مادر کے لیے جان کو ہلکان نہ کرنا
تم فاطمہؑ کو روکے پریشان نہ کرنا

نادم ہوں کفن بھی تمہیں میں دینے نہ پایا آغوش سے ماں بہنوں کی بے مہر چھڑایا
مرتے ہوئے دو بوند بھی پانی نہ پلایا اس دھوپ میں مرقد کو میسر نہیں سایا
نانا سے گلہ میرا نہ تم کیجیو اصغرؑ
پوچھیں جو علی ہونٹوں کو سی لیجیو اصغرؑ

ماں تک جو شہادت کی خبر جائے گی بیٹا　　اس پر تو قیامت ہی گزر جائے گی بیٹا
بن تیرے وہ کس طرح سے گھر جائے گی بیٹا　　ڈرتا ہوں کہ اس غم سے وہ مرجائے گی بیٹا
اک پل تری تصویر نہ آنکھوں سے ہٹے گی
ماں ٹھیرے ہوئے جھولے کے اطراف پھرے گی

ماں سے کوئی کہدے کہ نہ اب آئیں گے اصغرؑ　　اب دودھ کی ضد کرکے نہ تڑپائیں گے اصغرؑ
کپڑے بھی نہ اب ماں سے بدلوائیں گے اصغرؑ　　آرام سے اب قبر میں سوجائیں گے اصغرؑ
روتی رہو تا عمر یہ گوہر نہ ملے گا
صغرا سے تو مل لوگی پر اصغرؑ نہ ملے گا

اصغرؑ کی شہادت ہے شہ دیں کی شہادت　　یہ فوج ستم کے لیے تھی آخری حجت
کیا ان سے لڑیں جن میں سماعت نہ بصارت　　جو کھودیں گے چھ ماہ کے بچے کی بھی تربت
پانی کے لیے بیٹے سے شرمندہ ہیں شبیرؑ
وہ مرگیا ' مرنے پہ کمربستہ ہیں شبیرؑ

شبیرؑ کا یہ چاند نہ ظلمت میں چھپے گا　　یہ حق ہے دبانے سے کبھی دب نہ سکے گا
شبیرؑ کے پیغام کو یوں عام کرے گا　　کٹ کر بھی سرِ نیزہ سرافراز رہے گا
باطل کو ہر اک گام پہ جھٹلائیں گے اصغرؑ
حق جب بھی پکارے گا تو کام آئیں گے اصغرؑ

12.7 مرثیے کا تجزیہ

وحید اختر کا شامل نصاب مرثیہ ''برسی نہیں نغموں کی گھٹائیں کئی دن سے'' حضرت علی اصغرؑ کی شہادت کے بیان میں ہے۔ اس مرثیے کا عنوان ''شہید عطش'' ہے۔ اس مرثیے میں 107 بند ہیں۔

حضرت قاسمؑ کی شادی اور شہادت اور حضرت علی اصغرؑ کی شہادت مرثیہ نگاروں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ خصوصاً حضرت علی اصغرؑ جنگ میں براہ راست شامل نہ ہوکر بھی شہادت کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں۔ مختلف روایتوں سے ثابت ہے کہ روز عاشور جب حضرت امام حسینؑ اپنے اعزا و اقربا اور انصار کی قربانیاں دے چکے تو آواز استغاثہ بلند کی **''ھل من ناصر ینصرنا''** (ہے کوئی مددگار جو میری نصرت کو آئے) اس آواز کے ساتھ خیمے سے شور گریہ بلند ہوا۔ حضرت امام حسینؑ دریافت حال کے لیے خیمے میں تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ امام کی آواز سن کر حضرت علی اصغرؑ نے خود کو گہوارے سے گرادیا ہے۔ امام حسینؑ مشیت ایزدی کو سمجھ گئے اور انہیں گود میں اٹھالیا۔ قیامت کی گرمی اور شدت کی دھوپ اور تپش سے بچانے کے لیے ان کے اوپر اپنی عبا کا سایہ کیا اور دشمن کی فوج کے سامنے' بچے کو ہاتھوں پر بلند کرکے اس کے لیے پانی طلب کیا۔ یہ دردناک منظر شقی القلب انسان کا بھی دل دہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ فوج کے سپاہی منھ پھیر کر رونے لگے۔ فوج کے سردار نے جیتی ہوئی بازی ہاتھ سے جاتے دیکھ کر ایک شقی' حرملہ بن کاہل کو جو تیر اندازی میں بے مثل تھا' اشارہ کیا کہ کلام حسین کو قطع کردے۔ حرملہ نے سہ شعبہ تیر سے گردن معصوم کو نشانہ کیا اور چھ ماہ کا بچہ تڑپ کر باپ کے ہاتھوں پر سرد ہوگیا۔ امام حسینؑ بچے کی ماں ربابؑ کو کیا جواب دیتے اور شہید بچے کی لاش ماں کی آغوش میں کیسے ڈالتے یہ سوچ کر تلوار سے ریت میں ایک قبر کھودی اور بچے کو سپرد خاک کیا تاکہ دشمن لاش کی بے حرمتی نہ کرسکیں۔

بظاہر یہ واقعہ شہادتوں کے سلسلے کی ایک چھوٹی سی کڑی ہے مگر انسانی تاریخ' معصومیت اور بے زبانی کی ایسی جنگ کی کوئی نظیر پیش نہیں کرسکتی اور اسی لیے یہ واقعہ حق وصداقت کی حمایت میں سب سے مضبوط کڑی اور لازوال عظمت کا گواہ بن گیا۔

۱۹۹۱ء میں وحید اختر اپنے وطن رائے بریلی گئے ہوئے تھے۔ وہاں مولانا سید کلب عباس نے ماتمی عباس کے مرثیہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اب کوئی کیا مرثیہ لکھے گا۔ اس چیلنج نے وحید اختر کے شوق مرثیہ گوئی کو مہمیز کیا اور رات بھر میں 107 بندوں پر مشتمل یہ مرثیہ کہہ کر اگلے روز مجلس میں پڑھا اور خوب خوب داد حاصل کی۔ چونکہ یہ مرثیہ ایک خاص مجلس کے لیے لکھا گیا تھا اس لیے اس میں زیادہ جدت کی گنجائش نہ تھی ورنہ مرثیہ کامیاب نہ ہوتا۔ نہ تو

ہئیت میں کوئی تبدیلی ممکن تھی نہ موضوع میں، پھر بھی ان کی فکر کی تازگی اور اظہار واقعات کا اسلوب ان کا اپنا ہے۔ ترقی پسندوں کے برعکس رثائیت کو وہ مرثیے کا لازمی جز قرار دیتے ہیں۔ رثائیت سے خالی مرثیے دوسرے نقادوں کے مطابق صرف مسدس میں کہے جاسکتے ہیں۔ وحید اختر بھی ان نقادوں کے ہم نوا ہیں۔

مرثیے کی ابتدا روایتی مرثیے کی طرح چہرہ یا تمہید سے ہوتی ہے۔ لیکن یہیں سے ان کی جدت فکر کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ وہ مرثیے کو کسی زمانے، کسی ملک یا کسی قوم سے مخصوص واقعہ نہیں سمجھتے بلکہ یہ حق و باطل، خیر و شر، نیکی اور بدی کی ایک ایسی ابدی جنگ ہے جو ازل سے ابد تک اس دنیا کا مقدر ہے۔ مگر واقعہ کربلا نے ان دونوں کے درمیان ایسی حد فاصل کھینچ دی ہے کہ تا قیامت یہ تمام عالم انسان کے لیے مشعل راہ بن گئی ہے اور جب بھی حق و باطل کی ٹکر ہوگی یہ واقعہ انسانی عظمت کی مثال بن کر ہمیں صبر، ہمت اور استقامت کا درس دیتا رہے گا۔

صوری لحاظ سے جدید مرثیوں کی طرز پر تمام مرثیوں کے عنوانات مقرر کیے گئے ہیں۔ ''شہید عطش'' میں 107 بند ہیں۔ یہ مرثیہ 1961 کی تصنیف ہے۔ مرثیے کے زیادہ تر اجزائے ترکیبی اس میں موجود ہیں، جن کی روشنی میں اس مرثیے کا تجزیہ کرنا مناسب ہوگا۔

تمہید یا چہرہ عالم آشوب سے عبارت ہے اور یہ جوش کے مرثیہ حسین اور انقلاب کی تمہید سے بہت قریب ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

> ''ہماری صدی نے جو مصائب اور جنگیں جھیلی ہیں، وہ پوری انسانی تاریخ میں اپنی طویل عمر میں کبھی تصور نہ کی تھیں..... مصائب کے سامنے صبر اور ظلم کے مقابل جہاد اگر سیکھنا ہو تو ہماری صدی کو بھی کئی سو سال پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھنا ہوگا۔''

مرثیے کی تمہید خاصی طویل ہے اور 31 بندوں پر مشتمل ہے۔ اس میں وہ نہ صرف واقعہ کربلا سے جدید دور کے انتشار کا موازنہ کرتے ہیں بلکہ اس میں ہمہ گیری اور آفاقیت پیدا کرنے کے لیے دوسرے مذاہب اور ملکوں کے بزرگوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ رام کے بن باس، گوتم کے ترک دنیا، حضرت عیسیٰؑ کی صلیب، سقراط کے زہر، عشق و محبت کی داستانیں، فرعون و نمرود کی خدائیاں اور شداد کی جنت تک دنیا کی تمام تاریخ انھیں تار تار دکھائی دیتی ہے۔ لیکن واقعہ کربلا ساری تاریخ پر حاوی نظر آتا ہے۔ جہاں تاریخ انسانی کی انفرادی کوششیں اجتماعیت کی شکل اختیار کرتی ہیں اور کربلا کے ہیرو اپنی جانوں کے عوض دائمی فتح کا پرچم بلند کرتے ہیں اور اس واقع کی عظمت کا تابناک پہلو یہ ہے کہ وہ ہر دور کے انسانوں کے لیے مشعل راہ کا کام کرتا رہے گا۔ اس حصے میں زبان کا حُسن بھی ہے اور بیان کا جادو بھی۔ صنعتوں سے بھی خوب کام لیا گیا ہے۔

تمہید کے بعد سراپا اور سیرت نگاری کا روایتی بیان ہے جس میں واقعۂ کربلا کے ان بہتر (72) نفوس کے مختصر لشکر کا بیان ہے جو دنیا میں ہونے والی تمام جنگوں کی افواج پر بھاری تھا۔

اس دشت کو بھولا ہے، نہ بھولے گا وہ منظر — جب اترے تھے ارباب شہادت یہاں آ کر
کچھ طفل تھے کچھ عورتیں اور مرد بہتّر ۷۲ — نرغے کے لیے جمع ہوئے لاکھوں کے لشکر

ان لاکھوں کے نام، آج نہیں یاد کسی کو
کرتا ہے ہر اک یاد حسینؑ ابن علیؑ کو

اصحاب حسینی میں ہر اک سرو و سمن تھا — تھا شیر وغا بزم میں، جو غنچہ دہن تھا
رم کرتا تھا باطل سے جو آہوئے ختن تھا — نرمی میں صبا، جوش میں کہسار شکن تھا

ہر اک تھا شہنشاہ، غریب الوطنی میں
کوثر کو بھی دیکھا نہیں تشنہ دہنی میں

سراپا اور سیرت کے 23 بندوں کے بعد روز عاشور، شہدائے کربلا میں حضرت قاسمؑ، حضرت عباسؑ، حضرت علی اکبرؑ، اور عون و جعفرؑ کی شہادتوں کا سرسری ذکر ہے۔ اس سلسلہ کلام میں حسینؑ کا صبر، ہر عزیز کی جدائی کا کرب اور میدان کربلا سے لاشوں کو خیمے تک لانے کے دردناک منظر کا بیان ہے۔ لیکن

ان سب کے درمیان حسینؑ کا وہ چٹان جیسا وجود ہے، جسے حوادث کی آندھیاں نہ توڑ سکیں اور نہ ہی کمزور کر سکیں۔ اسی بیان میں رجز کے گیارہ بند بھی نظم کیے گئے ہیں جن کا راست تعلق حضرت علی اصغرؑ کی شہادت سے نہیں ہے لیکن امام حسین کی زبانی رجز کے یہ بند زور بیان کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں:

فرماتے تھے کس دبدبہ و جاہ سے سرکار — ہیں ہیچ نظر میں مری فرعونوں کے دربار
جانوں ہوسِ مال کو رسوائی بازار — سمجھوں سپر ظلم کو ٹوٹی ہوئی تلوار

یہ سلطنت شام تو خاک کف پا ہے
ہے گرد قدم، وسعت کونین بھی کیا ہے

ہم رات کو دیں حکم تو سورج نکل آئے — ہم ماریں جو ٹھوکر ابھی دریا ابل آئے
ہم تیغ اٹھالیں تو تمھاری اجل آئے — ہم جب بھی کہیں، نظم جہاں میں خلل آئے

مختار ارادے کے ہیں، مجبور نہیں ہم
تم کیا ہو! خدائی سے بھی معذور نہیں ہم

رخصت کے پانچ پابند ہیں۔ جہاں کربلا کے دوسرے ہیرو کے برعکس ایک چھ ماہ کے معصوم بچے کو گود میں اٹھا کر لانے کا ذکر ہے، جس میں شہادت کا شائبہ بھی نہیں بلکہ بیبیاں انھیں بہ احتیاط، حفاظت کی تاکید کرتے ہوئے رخصت کرتی ہیں کہ یہ بچہ پانی سے سیراب ہو کر واپس آئے گا۔ مثلاً

زینب نے کہا چاہیے سورج سے حفاظت — لو، شدّ ہوا گرم فضا مصدر حدت
بھوکے بھی ہیں، پیاسے بھی ہیں، کچھ کچھ ہے حرارت — مرجھائے نہ اِس دھوپ میں، یہ چاند سی صورت

آپ اپنی عبا ان کو اڑھا دیجیے بھائی
گھبرائیں تو دامن کی ہوا دیجیے بھائی

آمد کا صرف ایک بند ہے کیونکہ چھ ماہ کا معصوم بچہ جنگ کرنے نہیں بلکہ باپ کی گود میں پانی مانگنے آ رہا تھا۔

لے آئے چھپائے ہوئے دامن میں شہہ دیں — تھا خشک لب و خشک دہن یہ گُل بے کیں
شش ماہہ سزا پائے یہ ہے کون سا آئیں — قربانیاں اس شان کی دنیا نے نہ دیکھیں

جس وقت کہ دامن، رخ زیبا سے ہٹا ہے
تھا سب کو گماں، رحل پہ قرآن کھلا ہے

اس کمسن ہیرو کی شہادت کے بیان میں رجز اور جنگ کا ذکر خلاف واقعہ ہے اس لیے پیش نظر مرثیہ ننھے ہیرو کے اس بیان سے خالی ہے۔ اک شیر خوار بچے کی جنگ، خلاف عقل و خلاف واقعہ ہے۔ مگر بے زبانی اور خاموشی کی جنگ زیادہ دردناک اور متاثر کن ہے جس نے دشمن کو بھی آنسو بہانے پر مجبور کر دیا۔ شہادت کے صرف چار بند ہیں کیونکہ یہاں ایک تیر نے سارا کام تمام کر دیا۔

ہاں ایک کماں ایسی تھی جیسے ہو کڑا دل — جو تیر بھی اس کا تھا وہ تھا زہر سے قاتل
مرجاتے، جو کھاتے بھی ہوا اس کی عنادل — ہو پاتا دل کوہ بھی اس کے نہ مقابل

اس تیر کو چھ ماہ کے معصوم نے روکا
شبیر کا دل بچے کے حلقوم نے روکا

چھوٹے سے بچے کی لاش کی بے حرمتی اور پامالی نہ ہو اس خیال سے امام حسینؑ نے کانپتے ہاتھوں سے ریت میں قبر کھودی اور بچے کو اس میں دفن کر کے بین کرنے لگے۔

اب ماں کی ہے آغوش یہی گوشۂ تربت — یہ سچ ہے کہ تنہائی میں بڑھ جاتی ہے وحشت
یاد آتی ہے ہر چاہنے والے کی محبت — راس آئے مرے چاند تجھے قبر کی ظلمت

مادر کے لیے جان کو ہلکان نہ کرنا
تم فاطمہ کو روکے پریشان نہ کرنا

بین کے صرف پانچ بند ہیں۔اس کے بعد دو بند مرثیے کے اختتام کے ہیں:

12.7.1 مرثیہ شہیدِ عطش کی لسانی خصوصیات

زبان و بیان کے اعتبار سے یہ مرثیہ اردو کے دوسرے مراثی سے کسی طرح کم تر نہیں' کیوں کہ یہ ایک چیلنج کے تحت تصنیف ہوا تھا۔اس لیے وحید اختر اس نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ یہ معیار سے ساقط نہ ہونے پائے۔

وہ صنعتوں کا استعمال بھی بے محابہ کرتے ہیں اور اس میں آورد کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔تمہید' چہرے اور سراپا کے اشعار ادبیت سے مملو ہیں۔لیکن بعد کے تمام اجزا مرثیہ نگاری کے تقاضوں کے تحت صاف' سادہ اور سلیس زبان میں لکھے گئے ہیں۔ان کا استعاراتی نظام بہت پختہ اور بالیدہ ہے۔اماموں کی ذاتی زندگی کے حالات و واقعات اور اشیا سے انہوں نے فرسودہ استعاروں کو چھوڑ کر نئے استعارے وضع کیے اور ان سے جدید دور کے حالات و واقعات سے مطابقت پیدا کی ہے۔مثلاً قلعہ' خندق' ردا' چکی' معراج' رجز' شام' کوفہ' یزید' حسین اور یہ فہرست بہت طویل ہے۔انہوں نے ان لفظوں سے نئے معنی و مفہوم ادا کیے اور انہیں نئے استعاروں میں برتا۔یہاں نہایت اختصار کے ساتھ ان کے کلام کی خوبیوں پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

12.7.2 فصاحت

فصاحت سے مراد یہ ہے کہ لفظ یا محاورے یا فقرے کو اس طرح بولا یا لکھا جائے جس طرح مستند اہل زبان لکھتے یا بولتے ہیں۔لہذا فصاحت کا تصور زیادہ تر سماعی ہے۔ان کی بنیاد' روزمرّہ اہل زبان پر ہے جو بدلتا بھی رہتا ہے..... فصاحت کا تصور بھی زمانہ کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور الفاظ بھی زمانے کے ساتھ فصیح یا غیر فصیح بنتے رہتے ہیں۔

وحید اختر نے کوشش کی ہے کہ فصیح تر الفاظ کا استعمال کیا جائے' جس سے کلام کی روانی میں فرق نہ آئے اور تاثیر بھی کم نہ ہو۔مثلاً آب اور پانی' تیغ اور تلوار' شب اور رات' شمس اور سورج' چادر اور ردا وغیرہ ہم معنی لفظ ہیں۔لیکن فصاحت کا تقاضہ یہ ہے فصیح تر الفاظ کا استعمال ہو۔مثلاً

تلوار کے طوفاں میں رہا تیغ خدا وہ — گرنے لگا اسلام تو نصرت کو اٹھا وہ

.....

بے تیغ' جائے رن میں علم دار' کب ہوا — پیغام امن دیتی ہو تلوار' کب ہوا

یہاں تیغ اور تلوار دونوں ہم معنی ہیں لیکن ان کا مقام بدل دینے سے فصاحت میں فرق آ جاتا ہے۔

12.7.3 کردار نگاری

کربلا کے بہتر نفوس جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں' مثالی کردار کے مالک تھے اور ان نفوس کا مقصد جنگ کرنا نہیں بلکہ حق کی بقا کے لیے اپنی قربانی پیش کرنا تھا۔مرثیہ نگاروں نے ان کرداروں میں اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار بھی کھل کر کیا ہے تا کہ سامعین کے دل میں کرداروں کی ایک تصویر بن جائے اور مرثیہ گو کے لیے آگے کا مرحلہ آسان ہو جائے۔یہ افراد حق پسند' حق پرست' حق گو اور حق آگاہ تھے۔موت ان کی زندگی کے لیے سب سے بڑی حقیقت تھی۔وحید اختر ان کا تعارف یوں پیش کرتے ہیں۔

اس قافلۂ امن کے افراد دلاور — کس شان سے آئے تھے ہتھیلی پہ لیے سر
ہاتھوں میں نہ تیر و تبر تیغ نہ خنجر — حق دل میں تھا ' پیغام محبت تھا زباں پر

تلوار بھی تھا کلمہ حق' ان کی سپر بھی
منزل بھی تھا حق ان کے لیے' راہ گزر بھی

اس مرثیے میں حضرت علی اصغر شہادت سے سرخ رو ہونے کے بعد صرف ایک نگاہ سے داد شجاعت چاہتے ہیں:

اصغر نے بڑے چاؤ سے دیکھا رُخِ شبیر — ہو داد طلب جیسے شجاعت کا وہ بے شیر
تھی خون میں ڈوبی ہوئی وہ چاندسی تصویر — ہونٹوں پہ تبسم کی چمکتی ہوئی تحریر

وہ شوق شہادت کہ شہادت کو بھی پیار آئے
پیروں سے نہ چل سکتے تھے گودی میں سوار آئے

12.7.4 مکالمہ نگاری

وحید اختر خوب جانتے تھے کہ مکالموں کی زبان سادہ اور گفتگو سے قریب ہونا چاہیے ورنہ مکالمہ زبان کے فطری حُسن کی ترسیل سے محروم ہو جاتا ہے۔ مکالموں میں حفظ مراتب' موقع محل' خوردی و بزرگی' وقت اور حالات کی نزاکت' عورت و مرد اور بچے ہر چیز کا احساس ضروری ہے' ورنہ مکالمہ اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔ وحید کو زبان پر ماہرانہ قدرت حاصل تھی۔ ان کے مکالمے انیسؔ کی طرح صاف' سادہ' سلیس اور گفتگو کی زبان سے زیادہ قریب تر ہیں۔ کہیں کہیں یہ مکالمے نثر کا لطف دیتے ہیں۔ مثلاً امام حسینؑ حضرت علی اصغر کو میدان جنگ کی طرف لے کر جاتے ہیں تو حضرت زینبؑ ان کی حفاظت کے لیے بھائی سے کہتی ہیں:

زینب نے کہا چاہیے سورج سے حفاظت — لُو تند ' ہوا گرم ' فضا مصدر حدت
بھوکے بھی ہیں' پیاسے بھی ہیں کچھ کچھ ہے حرارت — مرجھائے نہ اس دھوپ میں یہ چاندسی صورت

آپ اپنی عبا ان کو اڑھا دیجیے بھائی
گھبرائیں تو دامن کی ہوا دیجیے بھائی

علی اصغرؑ کی شہادت پر امام حسینؑ بین کر رہے ہیں۔ زبان میں کہیں تصنع' آورد' ادبیت' کچھ بھی نہیں کہ مرنے والے کا غم ہر چیز کو بھلا دیتا ہے۔ فرماتے ہیں:

اب ماں کی ہے آغوش یہی گوشۂ تربت — یہ سچ ہے کہ تنہائی میں بڑھ جاتی ہے وحشت
یاد آتی ہے ہر چاہنے والے کی محبت — راس آئے مرے چاند تجھے قبر کی ظلمت

مادر کے لیے جان کو ہلکان نہ کرنا
تم فاطمہ کو روکے پریشان نہ کرنا

12.7.5 مرقع نگاری

اردو مرثیے میں ڈرامائی عناصر کی کمی نہیں ہے۔ واقع کو اس ترتیب اور تسلسل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ پورا ماجرا آنکھوں کے سامنے منظر بن کر گھومنے لگتا ہے' اور یہی کیفیت گریہ کا سبب بنتی ہے۔ اکثر مرثیہ نگاروں نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ کلام میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے ان مرقعوں کو جیتا جاگتا پیکر دیا جائے۔ واقع کی ترتیب میں کہیں جھول نہ ہو۔ بقول انیسؔ:

''موقع ہو جہاں جس کا عبارت بھی وہی ہو''

وحید اختر نے بھی اس بات کا خیال رکھا ہے کہ واقعات کو اسی ترتیب سے بیان کیا جائے کہ ۔

وہ مرقع ہو کہ دیکھیں اسے گر اہل شعور ہر ورق پر کہیں سایہ نظر آئے کہیں نور

ظاہر ہے کہ انیسؔ کے مقام و مرثیے تک پہنچنے کے لیے جس علم اور زبان پر جس ماہرانہ گرفت کی ضرورت ہے وہ وحید کے پاس نہیں تھی لیکن مرقع نگاری میں انہوں نے خاصی کوشش کی ہے۔ مرقع نگاری کا کمال یہ ہے کہ واقع کو اس طرح پیش کیا جائے کہ لفظوں سے تصویر بن جائے۔ علی اصغرؑ کی شہادت کے بعد امام حسینؑ کے حرکات و سکنات نے بغیر ایک لفظ بولے پورا منظر آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا ہے۔:

شبیرؑ وہیں بیٹھ گئے تھام کے پہلو ہر چند کیا ضبط مگر اُمڈے تھے آنسو
سلجھانے لگے بیٹے کے الجھے ہوئے گیسو سونگھا کیے پیراہنِ خونبار کی خوشبو
یاں ابن محمد پہ قیامت کی گھڑی تھی
دروازے پہ ماں ہاتھوں کو پھیلائے کھڑی تھی

12.7.6 منظر نگاری

منظر نگاری کی جتنی کثرت سے مثالیں اردو مرثیے میں ملتی ہیں اس کی نظیر کوئی دوسری صنف پیش نہیں کر سکتی۔ کربلا کے بے آب و گیاہ میدان کے کنارے بہتا ہوا دریائے فرات، دور تک ریگ صحرا، سورج و ریت کی تپش، دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہیں۔ چاروں طرف ہتھیار بند فوجوں کا اجتماع، یہ سب چیزیں بجائے خود ایک ایسا وحشت ناک منظر پیش کرتی ہیں کہ واقعہ کربلا کے المیے کی شدت اور بڑھ جاتی ہے۔ ہر شہید کی قربانی پر یہ سارا پس منظر واقعہ کی شدت کو بڑھا دیتا ہے۔ حضرت علی اصغرؑ کو گود میں لے کر اسی جلتے تپتے صحرا میں جا رہے ہیں جہاں چاروں طرف آگ ہی آگ ہے:

وہ دشت، وہ موسم کی تمازت، و ہوا گرم اک آتش سیال سے تھے ارض و سما گرم
تھی ریگ تپاں صورتِ میدان قضا گرم خیمے تھے حبابوں کے بھی سورج سے سوا گرم
تھا شعلوں کے دامن میں رسولوں کا سفینہ
یا آگ کے طوفاں میں تھا پھولوں کا سفینہ

اپنی معلومات کی جانچ

1. حضرت علی اصغر کس کے صاحبزادے تھے؟ شہادت کے وقت آپ کی عمر کیا تھی؟
2. اس مرثیے کا عنوان ''شہید عطش'' کیوں رکھا گیا ہے؟

12.8 تشریح

سب کچھ بھی لٹا کر یہ لٹانے کی تھی حسرت جیسے کہ خداوند سے ہو اب بھی ندامت
یوں دل سے لگا لیتے تھے ایک ایک کی میت جیسے کہ ہر اک داغ تھا انعام مشیت
اک لاش اٹھی دوسری تیار دھری تھی
کٹتی گئی جتنی بھی یہ شاخ اور ہری تھی

یہ بند وحید اختر کے تصنیف کردہ مرثیہ ''شہید عطش'' سے ماخوذ ہے۔ یہ مرثیہ حضرت علی اصغر کی شہادت کے باب میں ہے۔ وحید اختر کا یہ پہلا مرثیہ ہے لیکن فنی لحاظ سے یہ ان کے دوسرے مراثی سے کم نہیں۔

پیش نظر بند شہادت کے جز سے تعلق رکھتا ہے اور کردار نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ حضرت علی اصغر اپنے پیروں سے میدان جنگ کو گئے نہ رجز پڑھی اور نہ جنگ کی۔ اس کے باوجود ان کی قربانی کا تاثر، شہدائے کربلا کے دوسرے کرداروں سے کم نہیں۔ وحید اختر نے اس مرثیے میں اعلیٰ کردار کے پیکر، انسانیت کے بہترین مرقعے اور اخلاقیات کی بلند ترین مثالیں پیش کی ہیں۔ یہ بند امام حسین کی استقامت، صبر و رضا اور راضی بہ رضا رہنے کی بہترین مثال ہے۔ انیس نے ایک جگہ اللہ کی زبانی فرمایا ہے۔

اس واسطے اس پر ہے مسلط کیا غم کو　　یہ صبر حسینؑ ابن علی بھاتا ہے ہم کو

یہی موقع ہے جہاں حد درجہ دباؤ سے پہاڑ بھی شق ہو جاتے ہیں اور سمندر بھی ابل کر اپنے کناروں سے باہر آ جاتے ہیں۔ لیکن امام حسین کا دل ان پہاڑوں سے زیادہ مضبوط اور سمندروں سے زیادہ گہرا ہے۔ مرثیہ گوئی کی پوری تاریخ خاموش ہے اور اللہ سے شکوے کا ایک بھی لفظ پیش نہیں کر سکتی۔ یہی صبر و استقامت اس مرثیے کا نمایاں عنصر ہے۔

اس بند میں وحید اختر کہتے ہیں کہ واقعہ کربلا میں قربانی کی اور کوئی صورت نہیں بچی تھی جو امام حسین نے نہ دی ہو۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اللہ سے شرمندہ ہیں کہ میرے پاس تجھے پیش کرنے کے لیے کوئی بھی ہدیہ نہیں بچا۔ انہوں نے اپنے اعزا، اقربا اور رفقا کی لاشوں کو اس طرح سینے سے لگایا گویا مشیت نے ان کی قربانیوں کو قبول کر کے بہت بڑے اعزاز و انعام سے نوازا ہے۔ یہ سبھی قربانیاں ایک ہی دن میں پیش کی گئی تھیں۔ صبر و رضا کا ایسا پیکر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتا۔

یہاں انہوں نے حقیقت نگاری کی ایک بہت عمدہ مثال پیش کی ہے یعنی پودوں کی پرداخت کے لیے انہیں تراشا جاتا ہے۔ یہاں انہوں نے اپنے گود کے پالوں کی قربانی پیش کر کے اپنے مقصد کو عظیم سے عظیم تر بنا دیا۔ یہاں شاخ کا کٹنا اور ہرا ہونا خوبصورت استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ یعنی ہر عزیز کی شہادت پر ان کا دل اور زیادہ قوی اور مقصد عظیم تر ہوتا چلا گیا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ''سب کچھ بھی لٹا کر یہ لٹانے کی تھی حسرت''۔ یہ کس کی شہادت سے متعلق ہے؟
2. اس بند کی خوبیاں بیان کیجیے۔

12.9 خلاصہ

اردو میں مرثیے کی ایک طویل تاریخ ہے۔ اس دوران مرثیے میں ہیئتی اعتبار سے کئی تبدیلیاں آئیں۔ آخر کربلائی مرثیے کے لیے مسدس کا فارم پسندیدہ قرار پایا۔ موضوعاتی اعتبار سے، کربلا کے عظیم واقعے اور اس واقعے سے جڑی ہوئی باتیں، روایتیں، تاریخی حقائق، مذہبی نظریات، جذبات و احساسات طے پائے۔ بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک کے ساتھ ادب کے ہر میدان میں کئی اہم تبدیلیاں آئیں اور مرثیے کے مفہوم میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ اس تاریخی واقعے کو حالات زمانہ اور بین الاقوامی مسائل کی روشنی میں خاصی اہمیت حاصل رہی۔ آج مرثیہ شعری استعارے کے طور پر بھی استعمال ہو رہا ہے۔ جدید دور کے مرثیہ نگاروں میں جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری، شاد عظیم آبادی، اثر لکھنوی اور آل رضا اور مانی عباس کے ساتھ حیدر آباد کے مشہور ترقی پسند شاعر اور نقاد وحید اختر کا نام لیا جاتا ہے وحید اختر نہایت پر گو اور زود گو شاعر تھے ان کے تین شعری مجموعے اور ایک مرثیوں کا مجموعہ ''کربلا تا کربلا'' منظر عام پر آ چکا ہے۔ وحید اختر کے مرثیوں میں روایتی اجزا ضرور ملتے ہیں ساتھ ہی ان اجزا کے مضامین کو انہوں نے فکر کی بالیدگی اور عصری شعور سے وسعت عطا کی ہے۔ ان کے مرثیے صرف مجلس برپا کرنے کے لیے نہیں ہوتے بلکہ مجلس کو فکر و آگہی کا درس بھی دیتے ہیں۔

12.10 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. وحید اختر کی حیات پر روشنی ڈالیے۔
2. ''شہید عطش'' پر ایک جامع مضمون لکھیے۔

3. وحیداختر کی مرثیہ نگاری کا مجموعی جائزہ پیش کیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. وحیداختر کے عہد کا جائزہ پندرہ سطروں میں پیش کیجیے۔
2. ''شہید عطش'' کی کردار نگاری کا جائزہ لیجیے۔
3. وحیداختر کے مرثیے سے مکالمہ نگاری کے نمونے پیش کیجیے۔

12.11 فرہنگ

الفاظ		معنی	الفاظ		معنی	الفاظ		معنی
مدھ ماتی	=	مست، نشہ میں چور	لب بستہ	=	منہ بند	حبس	=	قید، گھٹن
صولت	=	رعب، دبدبہ	زاغ	=	کوا	زغن	=	چیل
بوم	=	اُلو	محتسب	=	قاضی، حاکم شرعی	محن	=	غم، دکھ
بوجہل	=	سرکار کا چچا، جو دشمن اسلام تھا، جاہل، متعصب				مرقد	=	تربت، مزار، قبر
خواب رمیدہ	=	وحشتناک خواب	عناں	=	باگ	تہی	=	خالی
بیداد	=	ناانصافی، ظلم وستم	قدغن	=	ممانعت، روک ٹوک	زیاں	=	نقصان
دریوزہ گری	=	بھیک مانگنا	تسخیر	=	محاصرہ کرنا، گھیرنا، قابو میں لانا	ید بیضا	=	موسیٰؑ کا معجزہ
دم عیسیٰ	=	حضرت عیسیٰ کا معجزہ (حضرت عیسیٰ کی پھونک جس سے مردہ زندہ ہو)				خورسند	=	خوش، شادماں
بُنِ مُو	=	بال کا سرا، بال کی نوک	آئین	=	قانون، دستور	اقلیم	=	ملک
پھریرا	=	پرچم	اوج	=	بلندی	نگوں سر	=	سر جھکائے
رایت	=	پرچم	رقصندہ	=	تھرکتا ہوا	تمازت	=	گرمی
بعثت	=	پیغمبر کا بھیجا جانا، خصوصاً آنحضرت	رم	=	دوڑنا، خصوصاً ہرن کا	توقیر	=	عزت، تعظیم وتکریم
قیصر	=	شاہ روم کا لقب، مراد شہنشاہ	خاقان	=	چین اور ترکستان کا سابق بادشاہوں کا لقب مراد شہنشاہ			
ہم شکل نبی	=	حضرت علی اکبر، فرزند امام حسینؑ	اعزہ	=	عزیز کی جمع۔ رشتے دار	دبدبہ	=	رعب
تطہیر	=	پاک کرنا	قعر ضلالت	=	انتہائی ذلت کا گڑھا	ہنگام	=	وقت
فرق	=	پیشانی / انسان کا سر	نیوڑھانا	=	جھکانا	شناور	=	تیراک
خوں گشتہ	=	خون میں ڈوبا ہوا	تگ ودو	=	دوڑ دھوپ	باطل	=	جھوٹ
علی اصغر	=	امام حسین کے شیر خوار فرزند جنہیں کربلا میں حرملہ نے اپنے تیر سے شہید کیا						

12.12 سفارش کردہ کتابیں

1. ''پتھروں کا مغنی'' (شعری مجموعہ) وحیداختر مطبوعہ 1966
2. ''شب کار زمیہ'' (شعری مجموعہ) وحیداختر مطبوعہ 1973
3. میں اور میرا عہد۔ مضمون مشمولہ صبا، حیدرآباد جلد 6، شمارہ 7,8 - 1940
4. علی گڑھ میگزین (خصوصی شمارہ) انتخاب شعرائے علی گڑھ 1970
5. وحیداختر کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ (تحقیقی مقالہ) اسرار احمد، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
6. ''کربلا تا کربلا'' (مجموعہ مراثی) وحیداختر مطبوعہ علی گڑھ۔ 1990

اکائی: 13 مراثی انیسؔ و دبیرؔ کا تقابلی مطالعہ

ساخت

13.1 تمہید
13.2 انیس کی مرثیہ گوئی
13.3 دبیر کی مرثیہ گوئی
13.4 انیس اور دبیر کے مرثیوں کا تقابلی مطالعہ
13.5 انیس اور دبیر کے مرثیوں میں مشترکہ مضامین
13.5.1 انیس اور دبیر کی لفظیات اور صنعتیں
13.6 خلاصہ
13.7 نمونہ امتحانی سوالات
13.8 فرہنگ
13.9 سفارش کردہ کتابیں

13.1 تمہید

اس اکائی میں دبستان لکھنؤ کے دو عظیم شاعروں میر انیس اور مرزا دبیر کی شخصیت، ان کی شاعری اور خصوصاً مرثیہ نگاری کے بارے میں گفتگو کی جائے گی۔ مرثیہ گوئی کے باب میں ان دونوں شاعروں کے کلام کی فنی خصوصیات اور محاسن کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جائے گا اور ان کے مرثیوں کے مشترکہ مضامین، مراثی میں ان کی لفظیات اور صنعتوں، کے بارے میں وضاحت کی جائے گی۔

13.2 انیسؔ کی مرثیہ گوئی

اردو مرثیہ نگاری میں انیس و دبیر دونوں اپنی اپنی جگہ ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ دبیر شوکت الفاظ کے بادشاہ تھے، تو انیس صفائی زبان اور سلاست کے شہنشاہ تھے۔ انیس کی تربیت فارسی اور اردو شاعری کی روایات کے زیر اثر ہوئی۔ انیس کے بزرگ دلی سے فیض آباد پہنچے تھے، انیس فیض آباد ہی میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کی توجہ اور ہدایت پر انیس نے مرثیہ گوئی میں دلچسپی لی۔ میر خلیق نے ان کو شعری تربیت کے لیے امام بخش ناسخ کے ہاں بھیجا تھا۔ انیس ابتدا میں حزیںؔ تخلص کرتے تھے۔ ناسخ نے اسے بدل کر انیسؔ کر دیا۔ انیس نے غزلیں بھی کہیں مگر مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا اور جب اودھ کا دارالحکومت فیض آباد سے اٹھ کر لکھنؤ آ گیا تو فیض آباد کی ساری رونقیں یہاں منتقل ہو گئیں۔ لکھنؤ میں دبیرؔ کی مرثیہ گوئی کی دھوم تھی۔ انیس پہلے فیض آباد میں مرثیے پڑھتے رہے، پھر فیض آباد سے لکھنؤ آنے لگے۔ ان کے کلام کی شہرت سے مجالس میں صاحبان ذوق کی کثرت ہونے لگی۔ دبیر تحت میں مرثیہ پڑھتے تھے اور ان کے مرثیوں اور مرثیہ خوانی کو پسند کرنے والے بھی لکھنؤ میں کچھ کم نہ تھے۔ حتیٰ کہ مداحوں کی پسندیدگی، قدر افزائی اور جانب داری نے لکھنؤ کو دو گروہوں یا حلقوں میں تقسیم کر دیا۔ کچھ لوگ ''انیسیے'' کہلائے اور کچھ ''دبیریے''۔ اس مقابلہ آرائی کی وجہ سے مرثیہ گوئی کے ہنر نے کچھ ایسی جلا پائی کہ اصناف سخن میں مرثیہ کا ایک لافانی مقام بن گیا۔

مرثیہ نگاری میں انیسؔ نے کئی ایک امور کی طرف توجہ کی ہے۔ انہوں نے کلام کو عام فہم و دل نشین بنانے پر زور دیا۔ لب و لہجہ میں سادگی سنجیدگی و متانت کے ساتھ محاورے، روزمرہ اور تراکیب میں وسعت پیدا کی۔ ان کا کہنا تھا کہ زبان کا استعمال موقع و محل کی مناسبت سے ہونا چاہیے بقول انیس:

روزمرہ شرفا کا ہو، سلاست ہو وہی　　لب و لہجہ ہو وہی سارا، متانت ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے، صنعت ہو وہی　　یعنی موقع ہو جہاں جس کا، عبارت ہو وہی

لفظ بھی چست ہوں، مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

چناں چہ میر انیس کے ہاں فصاحت اور بلاغت صاف جھلکتی ہے۔ان کی مرثیہ گوئی کا ماہرین ادب اور اہل کمال نے بھرپور اعتراف کیا ہے:

انیسؔ نے اپنے مرثیوں میں محض موضوع کو نہیں سمیٹا بلکہ کردار نگاری کے بھی بہترین مرقعے پیش کیے۔اس میں ہر عمر، ہر طرح کے کردار نہایت خوبی و دلکشی کے ساتھ موجود ہیں۔انیس ایک مخصوص عہد کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔یہ وہ زمانہ ہے جبکہ جاگیردارانہ نظام مائل بہ زوال تھا اور تہذیب و معاشرت رسم و رواج، زبان و محاورات اور اعتقادات، خلفشار و افراتفری کا شکار تھے۔انیس کے ہاں ان سب کا عکس نظر آتا ہے۔اس سے شاعر کی تہذیبی حسیت اور عصری شعور کی مضبوطی و بلندی کا احساس ہوتا ہے۔انیس کے مرثیوں میں سماجی اور تہذیبی تصاویر اپنی تمام تر جزویات کے ساتھ واضح دکھائی دیتی ہیں۔انیس کے پاس سماجیاتی مطالعے کے امکانات انتہائی وسیع ہیں۔انہوں نے مرثیوں کے مزاج کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔کردار کی مناسبت سے مکالمے، اس کے ساتھ منظر نگاری کا انداز اس قدر والہانہ کہ قاری مبہوت رہ جاتا ہے۔انیس نے زندگی کے ہر پہلو، ہر زاویہ کو سمجھا اور اس سے اپنا رشتہ جوڑا۔رنج و خوشی، ولولہ، غم و غصہ، عشق و محبت، وفاداری، جان نثاری، بے بسی، مظلومی، اقتدار پھر اس کی محرومی۔اس طرح کی ساری کیفیتیں وقفہ وقفہ سے سامنے آتی ہیں۔جذبات نگاری میں وہی شاعر کامیاب و کامران ہوتا ہے جس نے نفسیاتی تجربے کیے ہوں۔انیس کی مرثیہ گوئی، انسانی نفسیات و کیفیات کی بہترین مثالیں پیش کرتی ہے۔ان کا کمال فن یہ ہے کہ انہوں نے کبھی تشبیہات، استعارات، صنائع و بدائع اور ضرب الامثال کو اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔اشعار کی بندش، الفاظ کی نشست، خوبی، دلآویزی، برجستگی، سلاست، روانی، پوری تابناکی کے ساتھ ان کے کلام میں ہر جگہ جلوہ گر نظر آتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. انیس کی مرثیہ گوئی کے خدوخال بیان کیجیے۔
2. 'انیس کے مرثیوں میں اس عہد کی عکاسی ملتی ہے' تبصرہ کیجیے۔
3. ''انیس نے اپنے مرثیوں میں زبان و بیان اور صنائع و بدائع کا خاص خیال رکھا ہے' وضاحت کیجیے۔

13.3 مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی

مرزا سلامت علی دبیر دلی میں 1803ء میں پیدا ہوئے۔''بخت دبیر'' مادہ تاریخ ہے جس سے 1218 کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔مرزا کے والد مرزا غلام حسین نے بھی دیگر شرفاے دہلی کی طرح لکھنؤ آباد کیا۔اس وقت مرزا کوئی پانچ برس کے تھے۔گیارہ برس کی عمر میں مرزا نے فارسی کے علاوہ عربی سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کی۔دبیر کو ان کے والد نے میر مظفر حسین ضمیرؔ کی خدمت میں پیش کیا اور ان سے درخواست کی کہ ''بندہ زادہ کو مداحی اہلبیت کا شوق ہے''۔ضمیر نے دبیر کا تخلص دیا اور حلقہ شاگردی میں داخل کر لیا۔مشق سخن کے بارہ تیرہ برس میں ہی انھیں اودھ کے پہلے بادشاہ غازی الدین حیدر کے دربار سے بلوایا گیا۔اس وقت دبیر کی شہرت لکھنؤ میں پھیل چکی تھی اور میر انیس ابھی لکھنؤ نہیں پہنچے تھے۔دبیر نے بادشاہ غازی الدین حیدر کے دربار میں مرثیہ سنانے سے پہلے یہ بند پڑھا تھا:

واجب ہے حمد و شکر جناب الہ میں　　فضل خدا سے آیا ہوں کس بارگاہ میں
مجھ سا گدا اور انجمن بادشاہ میں　　چرچا یہ لوگ کرتے ہیں اس وقت راہ میں

ذرے پہ چشم مہر ہے، مہر منیر کو!
حضرت نے آج یاد کیا ہے دبیر کو

اس کے بعد نصیر الدین حیدر شاہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے تک لکھنؤ کے سامعین میر انیس سے متعارف ہو چکے تھے۔

ابتدائی دور میں انیس مسافرانہ لکھنؤ آیا کرتے، مجلس پڑھتے اور فیض آباد چلے جاتے تھے۔ جب ان کی مقبولیت بڑھنے لگی اور خود خلیق بھی فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہو گئے تو اس وقت سے دبیر اور انیس کے درمیان مسابقت بڑھنے لگی۔ تاہم دونوں کا انداز بیان جداگانہ تھا۔ مرزا دبیر اور انیس میں آپسی تناؤ تھا اور نہ کس طرح کی لڑائی تھی، دونوں ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ لیکن شاعری میں نئی جہت، نئی فکر، نئے مضامین کی تلاش میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ دبیر کہتے ہیں:

صلح احباب سے خوش ہے دل محزوں اپنا ان کے مضمون سے لڑتا نہیں مضمون اپنا

میر انیس کہتے ہیں:

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

میر انیس اور مرزا دبیر دونوں کا مقصد ایک تھا۔ کربلا کے سوز و گداز سے دلوں کو موم کرنا چاہتے تھے۔ عزاداری کے ذریعے اسلام کی حقانیت، اس کے اخلاق و کردار کو پھیلانا چاہتے تھے۔ اسلوب اور لہجوں کے فرق نے ان کے وسیلۂ اظہار میں امتیاز پیدا کر دیا۔

مرزا دبیر نے نصیر الدین حیدر کی ملکہ کی خواہش پر ایک مثنوی بھی لکھی۔ اس کے علاوہ ایک نثری کتاب ''ابواب المصائب'' بھی تحریر کی۔ اس کتاب کے بارے میں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ سورہ یوسف کی تفسیر ہے۔ مگر بعض اصحاب کہتے ہیں کہ یہ تحریر سورہ یوسف کی تفسیر نہیں، بلکہ مصنف نے اس میں واقعات کربلا اور سورہ یوسف کے درمیان ایک معنوی ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مرزا دبیر نہایت پر گو شاعر تھے۔ انہوں نے کم از کم تین ہزار مرثیے کہے ہوں گے۔ ان کے علاوہ سلام، نوحے اور رباعیات کی ایک قابل لحاظ تعداد بھی ملتی ہے۔ مرثیہ گوئی میں مرزا کی خصوصیات یہ تھیں کہ وہ شوکت لفظی، جدید تشبیہات، استعاروں اور زور کلام کے قائل تھے۔ ان کا کلام علمی زبان کے استعمال اور مضمون آفرینی کا اعلیٰ نمونہ ہوا کرتا تھا۔ صنائع بدائع کے ساتھ ساتھ دبیر کے پاس لکھنؤ کے مذاق کے مطابق رعایت لفظی و مبالغے پر بھی زور ملتا ہے۔ عالمانہ انداز، استادانہ رنگ مرزا کے مرثیوں میں صاف جھلکتا ہے۔ ان کے ہاں صنعتوں کا استعمال بالاستعیاب دکھائی دیتا ہے جیسے لف و نشر، حسن تعلیل، تجنیس، اشتقاق، منقوط و غیر منقوط وغیرہ۔ مضمون آفرینی، تخیل کی بلند پردازی، نازک خیالی، تشبیہات و استعارات اور جذبات کی ترجمانی، واردات قلبی، واقعات کی تصویر کشی، منظر نگاری کا وصف بھی اپنے خاص نہج میں پایا جاتا ہے۔ مرزا دبیر کو روایتیں نظم کرنے کا بڑا شوق تھا۔ مرزا دبیر نے سب سے پہلے جو معرکہ کا مرثیہ پڑھا اس کا مطلع تھا ''بانو پچھلے پہر اصغر کے لیے روتی ہے۔'' اس مرثیے میں مرزا نے مصائب کی ادائیگی میں فصاحت اور بلاغت کے معیارات اس قدر بلند کیے ہیں کہ شبلی نعمانی کو بھی ان کی تعریف کرنی پڑی۔

1291ھ میں مرزا ضعف بصارت کا شکار ہوئے اور محض ایک برس کے اندر ۱۲۹۳ھ م ۱۸۷۵ء میں رحلت پائی اور اپنے ہی مکان میں دفن ہوئے۔ مرزا دبیر، میر انیس کے حلیف تھے حریف نہ تھے۔ شاید اسی لیے انیس و دبیر کے ایک ہمعصر آغا عشق کہتے ہیں:

ہے نظم کے جوہر کا خزینہ خالی گویا جگر و دل سے ہے سینہ خالی
اے عشق! نہیں ہیں جو انیس اور دبیر ہے شمس و قمر سے یہ مہینہ خالی

اپنی معلومات کی جانچ:

1. مرزا دبیر کے حالات زندگی بیان کیجیے۔
2. مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی پر روشنی ڈالیے۔

13.4 انیس اور دبیر کے مرثیوں کا تقابلی مطالعہ

دبستان لکھنؤ کی اہمیت، شاعرانہ زبان و بیان، صناعی اور رعایت لفظی کے ساتھ ساتھ مرثیہ نگاری کا باب جس قدر اہم ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

لکھنؤ سے پہلے فیض آباد علم وفن کا مرکز تھا اور جب لکھنؤ دارالخلافہ بنا تو وہ ساری رونقیں، فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوگئیں۔ تہذیب وشائستگی داد ودہش، نشست وبرخاست، تکلف وتواضع، قدر افزائی وعزت نوازی، وقار وتمکنت، غرض سب کچھ لکھنؤ آ گئے۔ دہلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ میں شعروادب کے چرچے عام ہوگئے۔ خصوصیت سے شاعری کی روایات مستحکم ومضبوط ہوتی گئیں۔ اہل علم وفن دور دراز علاقوں سے جمع ہوگئے۔ مذہبی اقدار کی بنیاد پر مرثیہ نگاری کا فن بام عروج پر پہنچا۔ اس صنف سخن کی مخصوص شعریات سے آگہی، اس کا برمحل وبرجستہ استعمال بڑھنے لگا۔ مرثیہ نگاری کی ظاہری وداخلی ساخت میں بھی تبدیلی آئی۔ مرثیہ کی لفظیات میں نمایاں فرق کیا جانے لگا۔ دراصل یہی وہ نقطہ آغاز تھا، جس کی وجہ سے لکھنؤ میں مرثیہ نگاری قبول عام کی سند پا گئی۔ واقعات کربلا یا شہادت امام حسینؑ کے غم انگیز حالات کے بیان کے علاوہ کلام میں فصاحت وبلاغت کا غیر معمولی لحاظ، مرثیہ گوئی کو نئے افق سے روشناس کرگیا۔ شعرا کی باہمی مسابقت نے انہیں اپنے اپنے امتیازات پیدا کرنے کی طرف مائل کیا۔ نئے مضامین اور اظہار کے نئے سانچے تلاش کرنے لگے۔ خصوصاً مرثیہ گوئی میں میر ضمیر نے مسدس کی طرح ڈالی۔ چنانچہ خود انہوں نے اپنے مشہور مرثیہ: ''کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے'' کے آخری بند میں تعلّی کرتے ہوئے اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

جس سال لکھے وصف یہ ہم شکل نبی کے — سنہ بارہ سو انچاس تھے ہجری نبوی کے
آگے تو یہ انداز سنے تھے نہ کسی کے — اب سب یہ مقلد ہوے اس طرز نوی کے

دس میں کہوں، سو میں کہوں، یہ دور ہے میرا
اس طرز میں جو، جو کہے، شاگرد ہے میرا

اس طرح لکھنؤ میں مرثیہ نگاری کا دائرہ عمل اب غم واندوہ کے محدود حصار میں نہیں رہا۔ بلکہ واقعات کربلا کے جذباتی اظہار کے ساتھ ساتھ تہذیب، تاریخ، معاشرت، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، رزم وبزم کے عناصر بھی سراپا نگاری ساتھ مرثیے میں در آئے۔ انیس اور دبیر کے علاوہ دیگر شعرا بھی مراثی میں نئی نئی تراکیب، تلمیحات، تشبیہات، استعارات کی کہکشاں سجانے لگے اور اردو شاعری میں اپنی قادرالکلامی، فکری تنوع اور بلند خیالی کا سکہ بٹھانے لگے۔ خصوصیت سے میر انیس اور مرزا دبیر نے اپنے مراثی میں کربلا کے رقت انگیز واقعات میں غم واندوہ کے علاوہ شہدائے کربلا کی شجاعت، دلیری، عظمت کردار، حریت وپاس وفا کی کیفیات کو پیش کرنے کی دانستہ اور شعوری کوشش کی، جس سے مرثیہ کے فن میں چار چند لگ گئے۔ مرثیہ کا بنیادی مقصد واقعات کربلا اور مصائب شہدا کے بیان سے مجلس بپا کرنا ہے۔ تاثیر میں شدت پیدا کرنے کے لیے ماحول میں مانوسیت اور اپنائیت کا ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے انیس ودبیر نے عراق میں واقع ہونے والے عالمی المیہ کو ہندوستانی بلکہ لکھنوی ماحول میں پیش کیا۔ ہمارے بعض ناقدین نے مرثیوں میں عربی فضا کے فقدان پر ماتم کیا۔ مسعود حسین ادیب رضوی بھی اس بات کو مانتے ہیں اور آل احمد سرور ان عوامل کو عوام کی دلچسپی کے شاعرانہ وصف، ایجاز تخیل اور ادب کے امتیازی خواص بتاتے ہیں۔ مولانا حالی نے مرثیے کے اخلاقی پہلو پر زور دیا اور مقدمہ شعروشاعری میں لکھا کہ ''جس اعلیٰ درجہ کے اخلاق ان لوگوں نے مرثیے میں بیان کیے ہیں، ان کی نظیر فارسی بلکہ عربی میں بھی مشکل سے ملے گی۔''

میر انیس اور مرزا دبیر ایک ہی زمانے اور ماحول کے پروردہ تھے۔ ان کی شاعری کا موضوع بھی ایک تھا۔ لیکن ان دونوں کی شاعری میں اسلوب اور طرز نگارش، کا نمایاں فرق تھا۔ انیس کا سارا خاندان دہلوی خصوصیات کا پابند تھا۔ شاعرانہ مسلک، مضمون آفرینی کی بجائے اثر آفرینی کا قائل تھا۔ جب کہ مرزا دبیر بھی دہلی سے متعلق تھے مگر محض پانچ سات برس کی عمر میں لکھنؤ آئے۔ ان کی والدہ لکھنوی تھیں اس لیے بھی دبیر، دہلوی رنگ قبول نہ کرسکے۔ اس کے علاوہ دبیر نے اس عہد کے مزاج ومذاق کے مطابق تحصیل علم پر کافی وقت صرف کیا تھا۔ اس ریاض ومشق نے ان کی علمیت واختراعی صلاحیتوں کو ابھارا، تخیل، باریک بینی، مضمون آفرینی، صنائع بدائع کی فراوانی بعض وقت اثر آفرینی پر اثر انداز ہوگئی۔ اثر آفرینی مرثیہ کا طرہ امتیاز ہے۔ ظاہری خوبیوں پر زور دینے کی وجہ سے یہ عنصر دبیر کے یہاں کم ہوگیا ہے۔

ان دونوں عظیم شاعروں نے مراثی میں شادی وغم کے جو مناظر پیش کیے ہیں، ان میں لکھنؤ کی معاشرت کا عکس صاف جھلکتا ہے۔ مناظر فطرت، جذبات نگاری کے معاملے میں بھی کم وبیش یہی صورت رہی۔ لکھنوی زندگی وہاں کا ماحول، آداب، معاشرت، تکلفات، غرض ہر شئے سے لکھنویت عیاں تھی۔ لکھنؤیت گویا ان دونوں نے مقتضائے حال کی رعایت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ دونوں نے اپنے اپنے طور پر اس صنف سخن کو نکھارا، سنوارا اور دوام بخشا۔

مرثیہ نگاری میں مضمون کی بندش بڑی اہم ہوتی ہے۔ انیس اور دبیر میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے وہ الفاظ کی ترکیب و ترتیب ہے۔ انیس کے ہاں الفاظ کی مناسبت، برجستگی اور سلاست نمایاں ہے، جب کہ دبیر کے پاس یہ بات نہیں۔ ان کی لفظیات پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ دبیر کبھی کبھی ایک ہی مصرع میں نہایت شاندار الفاظ کے ساتھ پست اور کم رتبہ لفظ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ تعقید و بے ربطی بھی ان کے مضمون کو مجروح کرتی ہے۔ وہ جہاں معنی آفرینی پر زیادہ توجہ کرتے ہیں، اکثر کلام میں پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً تلوار کی تعریف میں لکھتے ہیں:

سیب بہشت رونقِ اسلام فتحِ جنگ — الماس تیغ شہ کا تھا سنگ رنگ دُھنگ
چمکی سروں پہ ایسے سواروں کے بے درنگ — یوں جی چھٹے دلیروں کے تیغوں سے جیسے زنگ

نے گردنیں تھیں دوش پہ، نے فرق خود میں
تیغ علی تھی خود میں، سر ان کے گود میں

سایہ دو نیم، رنگ دو نیم، اور بو دو نیم — رُو کا یہاں شمار ہے کیا، آبرو دو نیم
ہر بار چار آئینہ تھا، چار سو دونیم — سینے میں دل تو، دل میں ہر اک آرزو دونیم

دل خوب اس کی کاٹ کی لذت سمجھتا تھا
کٹتی تھی جو گھڑی وہ غنیمت سمجھتا تھا

دبیر نے تلوار کی اس تعریف میں محض لفظوں کی کاریگری دکھائی ہے۔ تخیل کی جولانی سے زیادہ کام لیا ہے۔ جب کہ تلوار کی کاٹ، تیزی اور اس کے جوہر کی کوئی کیفیت نہیں بتائی ہے۔ حقیقت نگاری سے دور انہوں نے محض استعاروں، نزاکت خیال کو مدنظر رکھا۔ جب کہ میر انیس نے اسی موضوع کو کس خوبی سے برتا ہے، دیکھیے۔

کیا کیا چمک دکھاتی تھی سر کاٹ کاٹ کے — تنتی تھی بس تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے
پانی وہ خود پیے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے — دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے

کیا جانیے ملا تھا مزا کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح اُستخوان کو

دبیر کے کلام میں تشبیہات، استعارات کا زور و شور صاف نظر آتا ہے۔ اس لیے شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ دبیر کے ہاں خیال آفرینی، دقت پسندی، جدتِ بیان، استعارات، اختراع تشبیہات کے علاوہ شاعرانہ استدلال اور شدت مبالغہ کا جواب نہیں۔ مگر وہ ان تمام باتوں کو اکثر سنبھال نہیں سکتے تھے اس کی وجہ سے ان کے کلام میں تعقید اور اغلاق پیدا ہو جاتا تھا۔ چناں چہ گھوڑے کی چال، فوج کی ہلچل، مبارزانہ مقابلے کے لیے آمد کی دھوم وغیرہ سینکڑوں مضامین میں نئی تشبیہوں اور استعاروں نے مرثیوں کو لسانی اعتبار سے اونچا تو کیا مگر اثر آفرینی میں وہ پھیکے پڑ گئے۔ برخلاف اس کے انیس نے زیادہ تر نفس مضمون کو سمجھا اور کمال ندرت سے خوبصورت تشبیہات اور استعاروں کے ساتھ واقعہ کی عکاسی کی ہے اور اپنے کلام کو عام فہم اور دل نشیں بنانے پر زور دیا ہے۔ لب و لہجہ میں سادگی، سنجیدگی اور متانت کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ بحیثیت مرثیہ نگار وہ شاعری میں محاکات کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں:

قلمِ فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ — شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ

انیس نے صنائع بدائع کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ مختلف صنعتوں کا اہتمام بھی انیسؔ کے کلام کا خاصہ ہے۔ اسی طرح منظر نگاری میں بھی انیس کو کافی عبور تھا۔ جیسے گرمی کی شدت کا منظر دیکھیے:

لو وہ آفتاب کی حدت و تاب و تب — کالا تھا رنگ دھوپ سے ان کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب — خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب

اڑتی تھی خاک، خشک تھا چشمہ حیات کا
گھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

دبیر کے ہاں بھی منظر نگاری کا وصف کچھ کم نہیں لیکن وہ لکھنؤ کے مذاق کے مطابق رعایت لفظی اور مبالغہ پر زور دیتے ہیں۔ عالمانہ انداز اور استادانہ رنگ سے ان کا کلام خالی نہیں۔ اکثر صنعتوں کی بہتات، مضمون کو گنجلک کر دیتی ہے۔ صبح کا منظر دیکھیے۔

گلگونۂ شفق جو ملا حور صبح نے — اسپند مشک شب کو کیا نور صبح نے
گرمی دکھائی روشنیٔ طور صبح نے — ٹھنڈے چراغ کر دئے کافور صبح نے

لیلائے شب کی رات کو دولت جو لٹ گئی
افشاں جبیں سے مہر درخشاں کے چھٹ گئی

اسی طرح جذبات نگاری کے معاملے میں دونوں شاعروں کے اسلوب پر نظر ڈالی جائے تو بیّن فرق دکھائی دے گا۔ انیس کے ہاں وہی سادگی، پرکاری اور اثر آفرینی کارفرما ہے۔ جب کہ دبیر کے پاس مضمون میں معنی آفرینی کی فضا پر ابر سا چھا گیا ہے۔

انیس کے اشعار دیکھیے۔ کسی موقع پر رسول اکرمؐ نے حسب عادت جب امام حسینؓ کے لبوں کا بوسہ نہیں لیا تو امام حسینؓ رنجیدہ ہو گئے۔ ایک بچے کی ناراضگی کے جذبات کو انیس کس طرح بیان کرتے ہیں:

اٹھے حسین زانوے احمد سے خشمگیں — غصے سے رنگ زرد اور آنکھوں پہ آستیں
رخ پر پسینہ، جسم میں رعشہ، جبیں پہ چیں — پوچھا کدھر چلے تو یہ بولے کہیں نہیں

گھر میں اکیلے تیوری چڑھائے چلے گئے۔
دیکھا نہ پھر کے سر کو جھکائے چلے گئے

حضرت امام حسینؓ جب میدان جنگ میں جاتے ہیں تو بی بی زینبؓ کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے دبیر لکھتے ہیں:

دھڑکا یہ ہے کہ قتل نہ ہو جائیں شاہ دیں — چلتے ہیں جلد اور زمین سوجھتی نہیں
واں لڑکھڑائیں اور یہاں منہ کے بل گریں — آنکھیں کہیں، خیال کہیں، اور دل کہیں

بیٹے مرے، نہ نکلی مگر اب نکل پڑی
منہ اپنے ڈھانپ ڈھانپ لو زینب نکل پڑی

اپنی معلومات کی جانچ:

1. انیس کے اسلوب پر روشنی ڈالیے۔
2. دبیر کے مرثیوں کی خصوصیات بیان کیجیے۔

13.5 انیس اور دبیر کے مرثیوں میں مشترکہ مضامین

میر انیس اور مرزا دبیر دونوں مرثیے کے شہ سوار ہیں۔ مرثیہ کا موضوع ایک ہی ہے مگر دونوں کے انداز بیان الگ الگ ہیں۔ واقعات کربلا اور اس کے مضامین مشترک ہیں مگر ان دونوں شاعروں نے اکثر مرثیوں میں بند کے بند یا متفرق اشعار میں ایک دوسرے کو بطور حریف پیش کیا ہے۔ بعض بندوں میں مضمون کے علاوہ ردیف اور قافیے تک یکساں ملتے ہیں مثلاً میر انیس ایک جگہ زمانے کی ناقدری کی شکایت کرتے ہیں۔ ایک بند کی ٹیپ میں کہتے ہیں:

عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے　　　　اس عہد میں سب کچھ ہے پہ انصاف نہیں ہے

مرزا دبیر نے بھی اپنے ایک مرثیے میں اسی بحر میں بالکل اسی طرح کے ایک بند کے ٹیپ میں شکوہ کیا ہے۔

دل صاف ہو کس طرح کہ انصاف نہیں ہے　　　　انصاف ہو کس طرح کہ دل صاف نہیں ہے

اس سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں شاعروں میں باہمی چشمک ضرور تھی۔ میر انیس نے اپنے اکثر شعروں میں مرزا دبیر پر سرقہ اور خوشہ چینی الزام لگایا ہے۔

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار　　　　خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

لیکن مرزا دبیر نے میر انیس پر کبھی اس طرح کا الزام نہیں لگایا بلکہ خود پر لگائے گئے الزام کی صفائی پیش کی ہے۔ جیسے وہ کہتے ہیں:

واللہ بری ہوں، سرقۂ مضمون غیر سے　　　　ہے استفادہ مجھ کو احادیث و سیر سے

....

شکرِ خدا، کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں　　　　ہر مرثیہ میں موجد طرز جدید ہوں

انیس اور دبیر کے مرثیوں میں متحد المضمون مرثیے بھی مل جاتے ہیں دو ایک مثالیں دیکھیے۔ جیسے بی بی صغرا کا رخصت کے وقت حضرت علی اصغرؑ کو حسرت سے دیکھنا نہایت دل سوز سماں ہے۔ مرزا دبیر نے اس منظر کو یوں دکھلایا:

اصغر کی طرف ہاتھ اٹھا کر یہ پکاری

یہ مصرع دبیر نے میر انیس کے اس مصرع کے جواب میں لکھا ہے:　　　　وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری

لیکن ان دونوں مصرعوں میں کوئی نسبت نہیں ہے۔ ذیل کے دونوں مصرعوں میں بھی بین فرق و امتیاز محسوس کیا جا سکتا ہے۔

دبیر　:　آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگا لوں

انیس　:　آ آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری

یہ دو بند دیکھیے۔ انیسؔ کہتے ہیں:

بیت الشرف خاص سے نکلے شہہ اسرار　　　　روتے ہوئے ڈیوڑھی پہ گئے عترت اطہار

فراشوں کو عباس پکارے یہ بہ تکرار　　　　پردہ کی قناتوں سے خبردار خبردار!

باہر حرم آئے ہیں رسول دوسرا کے

شُقّہ کوئی جھک جائے نہ جھونکوں سے ہوا کے

دبیر کہتے ہیں:

دربان عصا اٹھا کے بڑھے جانب یسار   ڈبی طرف نقیب گئے باندھ کر قطار
آ آ کے در پہ لونڈیاں چلائیں ایک بار   آئے اِدھر نہ اب کوئی جائے نہ ہوشیار

آواز غیر سن کے وہ اندیشہ کرتی ہے
آہستہ بولو دختر زہرا اترتی ہے

مرثیہ نگاری میں یہ دونوں شاعر ایک سے بڑھ کر ایک ہیں، مگر بعض موقعوں پر مرزا دبیر نے حسن بلاغت سے مضمون پیش کرنے کا ایسا لا جواب ڈھنگ اختیار کیا ہے جو میر انیس سے نہیں ہو سکا۔ جیسے واقعات کربلا کا سب سے زیادہ دل دوز واقعہ حضرت علی اصغر کی پیاس کا ہے۔ حضرت امام حسین اعزہ کی شہادت کے بعد ننھے علی اصغر کو فوج اشقیا کے سامنے لا کر ان سے مخاطب ہوتے ہیں کہ اس معصوم کے گلے میں ایک بوند پانی ٹپکا دو۔ اس واقعہ کو میر ضمیر، میر خلیق اور دیگر سبھی شعرا نے قلم بند کیا ہے۔ میر انیس نے بھی اسی واقعہ کو مختلف انداز میں کئی ایک مرثیوں میں لکھا ہے۔ ایک بہترین مرثیے میں فرماتے ہیں:

بولے دکھا کے بچے کو شاہ فلک سریر   مرتا ہے پیاس سے یہ مرا کودک صغیر
پانی ملا ہے کل سے نہ ممکن ہوا ہے شیر   للّلہ اس غریب پہ کر رحم اے امیر!

مہماں ہے کوئی آن کا ہونٹوں پہ جان ہے
اس کا قصور کیا ہے کہ یہ بے زبان ہے

لیکن مرزا دبیر نے جس بلاغت سے اس واقعہ کو نظم کیا ہے اور جو درد انگیز سماں دکھایا ہے وہ آج تک کسی سے بھی بیان نہ ہو سکا:

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبط مصطفیٰ   لے تو چلا ہوں فوج عمرو سے کہوں گا کیا
نہ مانگنا ہی آتا ہے مجھ کو، نہ التجا   منت بھی گر کروں تو کیا دیں گے وہ بھلا

پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
پیاسے کی جان جائے گی اور آبرو مری

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے   چاہا کریں سوال، پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے   چادر پسر کے چہرہ سے سرکا کے رہ گئے

آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

گو میں بقول عمرو شُمر ہوں گنہگار   یہ تو نہیں کسی کے بھی آگے قصور وار
شش ماہہ، بے زبان، نبی زادہ، شیر خوار   ہفتم سے سب کے ساتھ یہ پیاسا ہے بیقرار

سِن ہے جو کم تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے اور یہ مظلوم زادہ ہے

یہ کون بے زباں ہے تمہیں کچھ خیال ہے   دُرِ نجف ہے، بانوئے بیکس کا لال ہے
لو مان لو تمہیں قسم ذوالجلال ہے   یثرب کے شاہزادے کا پہلا سوال ہے

پوتا علی کا تم سے طلب گار آب ہے
دے دو کہ اس میں ناموری ہے، ثواب ہے

پھر ہونٹ بے زبان کے چومے، جھکا کے سر — رو کر کہا، جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
باقی رہے نہ بات کوئی اے مرے پسر — سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر

پھیری زباں لبوں پہ جو اس نور عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسینؑ نے

اسی طرح کئی ایک مرثیوں میں مشترکہ مضامین کے اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ ذیل میں چند ایسے اشعار درج کیے جاتے ہیں جس میں اصل واقعہ مشترک ہے۔ دونوں شاعروں نے اپنے اپنے انداز سے بات کہی ہے۔ سرکار دو عالمؐ کی شجاعت سے متعلق کہتے ہیں:

انیس — طاقت اگر دکھادوں رسالت مآب کی — رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی
دبیر — چاہوں تو بیٹھے بیٹھے اک انگل سے زین پر — گردوں کی ڈھال چیر کے رکھ دوں زمین پر

روح کا تن سے جدا ہونا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنے گھر کو چھوڑتا ہے۔ معرکہ آرائی کا یہ حال دیکھیے:

انیس — یوں روح کے طائر، تن و سر چھوڑ کے بھاگے — جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے
دبیر — یوں جسم رعشہ دار سے جانیں ہوئیں رواں — جیسے مکاں سے زلزلہ میں صاحب مکاں

دوران جنگ برق کے چمکنے کی کیفیت ملاحظہ ہو۔

انیس — اک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے ستم گاروں کی — برق ہر صف میں چمکنے لگی تلواروں کی
دبیر — گرد عباس کے کثرت تھی ستم گاروں کی — مینہ تو تیروں کا تھا اور برق تھی تلواروں کی

اہل حرم جب ایک ہی رسن سے باندھے گئے تو دبیر کہتے ہیں:

دبیر — یوں متصل رسن سے بندھے تھے وہ دلفگار — رشتہ میں جیسے دانہ تسبیح آبدار
انیس — گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن — جس طرح رشتہ گلدستہ میں گلہائے چمن

ان مضامین کی بندش اور صفائی کا فرق ظاہر ہے۔ مرزا دبیر کے ہاں خیال آرائی کی جو فراوانی ہے وہ اس پر قابو نہیں رکھ سکے اور نہ اس پر کوئی بند باندھ سکے۔ بہ الفاظ دیگر انہوں نے نظم و ضبط کا خیال نہ رکھا۔ اسی لیے ان کے بیان میں خیال آفرینی، سادگی اور اصلیت کی کمی ہے، جب کہ انیس کے ہاں فصاحت، جذبات اور احساسات کی خوبی، نرمی، اثر آفرینی کی ایک مانوس فضا ملتی ہے۔ اس لیے ان کا انداز متاثر کن ہے۔

13.5.1 میر انیس اور مرزا دبیر کی لفظیات اور صنعتیں

میر انیس اور مرزا دبیر نے واقعات کربلا کو جس جذباتی اور محبت آمیز عقیدت سے پیش کیا وہ تاریخ ساز ہے۔ مرزا دبیر نے اپنے مرثیوں میں صنائع و بدائع لفظی و معنوی کا استعمال بڑی فیاضی سے کیا ہے تو انیس نے اپنے کلام میں اہل زبان کی بول چال کا زیادہ استعمال کیا ہے۔ بول چال کی زبان سادہ، سہل، صاف ہوتی ہے جیسے انیس کہتے ہیں:

حشر تک خلق میں یہ ذکر غم انگیز رہا — تو تو بچپن کے غلاموں سے بھی کچھ تیز رہا
زینب نے کہا جس میں رضائے شہ عالی — مالک ہیں وہی میں تو ہوں اک چاہنے والی

دبیر کی خصوصیات میں شوکت الفاظ، مضمون آفرینی اور زور کلام شامل ہے:

عرش فلکی بڑھ کے نقیبانہ پکارے ہشیار ' خبردار ' پرے ' دور ' کنارے

یہ دراصل ایہام کی مثال ہے جس میں دو الفاظ ایسے لائیں جائیں جو بظاہر سننے والے کو وہم میں ڈال دیں ایک اور شعر دیکھیے :

سرمہ ہے نجف کا یہ سخن ' گرد نہیں ہے آمد کے مضامین ہیں آورد نہیں ہے

مراعات النظیر کی مثالیں دیکھیے جس میں الفاظ کی رعایت مقدم ہوتی ہے یہ صنعت خاص و عام میں پسند کی جاتی ہے۔

انیس اب تک یہ لڑائی کے نہیں ڈھنگ سے واقف دونوں میں ایک بھی نہیں چورنگ سے واقف

دبیر زردار زرد ہو کے گل اشرفی بنے نصرانی خاک ہو کے گل ارمنی بنے

صنعت مبالغہ میں کسی بھی لفظ میں مبالغہ کا پہلو واضح طور پر مراد لیا جاتا ہے۔

انیس گر آنکھ سے نکل کر ٹھہر جائے راہ میں پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

دبیر کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے رستم کا جگر زیر کفن کانپ رہا ہے

حسن تعلیل ایک لطیف صنعت ہے جس میں فطری حقیقت کی ذہنی تاویل کی جاتی ہے جس سے کلام میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔

انیس ڈر سے ہوا فرات کی موجوں کو اضطراب اور آب میں سروں کو چھپانے لگے حباب

دبیر فوارہ بلندی کی طرف چھوٹ رہا تھا پانی بھی گلستاں کے تماشے کو اٹھا تھا

لف ونشر میں الفاظ اسی مناسبت و ترتیب سے لائے جاتے ہیں کہ جس سے معنوی ترکیب بھی خوبصورت ہو جائے اور نحوی ترکیب بھی۔ لف کے معنی ہیں۔ لپیٹنے اور نشر کے معنی ہیں بکھیرنے کے۔ انیس و دبیر نے اس صنعت میں بھی اپنی ہنرمندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اردو شاعروں میں یہ صنعت بڑی مقبول رہی ہے۔

انیس واللیل ' والضحیٰ ' رخ روشن ' خط سیاہ لعل و خزاں و گل ' لب و رخسار و چشم سیاہ

دبیر دو نیزے ' دو سوار ' دو شمشیریں ' دو صفدر دو شمعیں ' دو پروانے ' دو دریا ' دو شناور

اسی طرح ان دونوں شاعروں نے تلمیح ' تجنیس وغیرہ سے بھی خوب استفادہ کیا ہے۔ صنعت منقوط اور غیر منقوط کی مثالیں بھی ان کے یہاں مل جاتی ہیں

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اثر آفرینی سے کیا مراد ہے؟
2. مرزا دبیر کی طرز نگارش میں خیال آفرینی کی وضاحت کیجیے۔
3. حسن تعلیل سے کیا مراد ہے؟ انیس کا ایک شعر اس صنعت میں لکھیے۔
4. صنعت لف ونشر کی ایک مثال دبیر کے کلام سے دیجیے۔

13.6 خلاصہ

دبستان لکھنؤ کے دو عظیم شاعر میر انیس اور مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری نے اردو شعر و ادب میں ایک شاندار تاریخ بنائی ہے۔ ان کی شاعری نے ایک عالم کو متاثر کیا ہے عام طور پر اصناف شاعری میں غزل ' رباعی ' قصیدہ اور مثنوی پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی اور مرثیے کا چلن عام نہیں تھا۔ مگر دبستان لکھنؤ کے ان دو شاعروں نے اپنے زمانے میں اس صنف سخن کو اعلیٰ و ارفع مقام پر پہنچا دیا۔ ان دونوں مرثیہ گو شاعروں کا اسلوب اور طرز نگارش الگ الگ ہے۔ ان دونوں کے کلام میں خیال آفرینی اور معنی آفرینی کا واضح فرق ملتا ہے۔ اس تقابلی مطالعہ کے ذریعے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مرثیہ گوئی کے باب میں انیس و دبیر دونوں ہم پلہ ' ہم رتبہ شاعر ہیں۔ کہیں کہیں انیس ' دبیر پر اور کبھی کبھی دبیر ' انیس پر سبقت لے جاتے ہیں۔ اکثر ان دونوں کے ہاں ایسے اشعار ملتے ہیں

جن کے مضامین مشترک ہیں۔ اصل بات پیش کشی کا مسئلہ ہے کوئی سادگی سلاست روانی کا گرویدہ ہے' کوئی مضمون آفرینی' خیال اور بندش کا دلدادہ۔ فصاحت' بلاغت' علمیت کے اعتبار سے دونوں لاجواب ہیں۔ انہوں نے اپنے زمانے کے مزاج اور مذاق کو ہمیشہ مدنظر رکھا۔ ان کے چاہنے والے ''انیسیے'' اور دبیریے'' کہلائے۔ دونوں شاعروں میں بظاہر کوئی رنجش نہیں تھی۔ قدرت نے بھی کچھ باتوں میں دونوں کو ایک ہی سطح پر رکھا تھا۔ دونوں ایک ہی سال پیدا ہوئے ایک سال میں انتقال کیا۔ دونوں اپنے اپنے گھر کے آنگن میں دفن ہوئے۔ دبیر' میر انیس کے اتنے مداح تھے کہ ان کے انتقال پر دبیر نے ایک تاریخی شعر کہا جو زبان زد خاص و عام ہو گیا وہ شعر ہے۔

آسمان بے ماہ کامل' سدرہ بے روح الامیں
طور سینا بے کلیم اللہ' و منبر بے انیس

13.7 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. انیس و دبیر کی مرثیہ گوئی کا تقابلی جائزہ لیجیے۔
2. انیس و دبیر کے مرثیوں کے مشترک مضامین پر مثالوں کے ساتھ اظہار خیال کیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. انیس اور دبیر نے اپنے مرثیوں میں اپنے عہد کے مزاج اور مذاق کا خیال رکھا ہے' تبصرہ کیجیے۔
2. انیس دبیر کے مرثیوں سے کوئی تین صنعتوں کی مثالیں دیجیے۔

13.8 فرہنگ

الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی
موازانہ	=	اندازہ کرنا' مقابلہ کرنا	تبحر	=	بہت بڑا عالم' علم کا دریا	تنافر	=	نفرت کرنا
اطلاق	=	کسی اصول کا استعمال' محمول کرنا	تکفیر	=	کسی کو کافر کہنا' کفر کا الزام لگانا	زندیق	=	بے دین
شُقہ	=	وہ کپڑا جو علم میں باندھتے ہیں۔ پھریرا	سلاست	=	روانی' فصاحت	فعال	=	سرگرم' بہت کام کرنے والا
فروغ دینا	=	ترقی دینا	دسترس	=	رسائی' مشق' مہارت	افراتفری	=	پریشانی' ہل چل

13.9 سفارش کردہ کتابیں

1. شبلی نعمانی — موزانہ انیس و دبیر
2. سفارش حسین — اردو مرثیہ
3. مسیح الزماں — اردو مرثیہ کی روایت
4. علی عباس حسینی — اردو مرثیہ
5. ابواللیث صدیقی — لکھنؤ کا دبستانِ شاعری
6. رشید حسن خاں — موازنہ انیس و دبیر

اکائی : 14 اردو نظم کا آغاز و ارتقا

ساخت

14.1 تمہید

14.2 اردو نظم کا دکنی دور

14.3 اردو نظم کا ابتدائی دور شمالی ہند میں

14.4 نظیر اکبر آبادی

14.5 1857 کے بعد نظم

14.5.1 انجمنِ پنجاب اور نظم

14.6 انجمنِ پنجاب سے باہر نظم

14.7 ترقی پسند تحریک اور اردو نظم

14.8 حلقۂ اربابِ ذوق

14.9 اردو نظم آزادی کے بعد

14.10 خلاصہ

14.11 نمونہ امتحانی سوالات

14.12 سفارش کردہ کتابیں

14.1 تمہید

اردو اصنافِ شعر میں، نظم کو ایک خصوصی حیثیت حاصل ہے جب کہ غزل اردو کی مقبول ترین صنف ہے۔ مثنوی، مرثیہ اور قصیدہ کو بھی کافی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ لیکن یہ ہماری مروجہ، متداول اور روایتی اصنافِ سخن ہیں۔ قدیم میں بھی ایسی نظموں کی خاصی تعداد ہے جو مختلف ہیئتوں میں ایک ہی موضوع اور کسی ایک خاص عنوان کے تحت لکھی گئیں اور محض ہیئت کی بنیاد پر کبھی ان کو مثنوی کہا گیا، کبھی قصیدہ اور کبھی مسدّس۔ تاہم اس نوع کی نظموں کی مقبولیت کے اپنے اپنے جواز تھے۔ نظم میں کسی ایک موضوع پر تسلسل کے ساتھ اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ نظم میں موضوعات ایک سے زیادہ بھی ہوسکتے ہیں۔ لیکن یہ سب ایک بنیادی موضوع کے تحت یا اس سے مربوط و منسلک ہوتے ہیں۔ نظم کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے گرد پوری نظم کا تانا بانا بنا جاتا ہے۔ ارتقا بھی نظم کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ طویل نظموں میں یہ ارتقا واضح ہوتا ہے، مختصر نظموں میں یہ ارتقا واضح نہیں ہوتا اور اکثر و بیشتر ایک تاثر کی شکل میں ابھرتا ہے۔

اردو شاعری میں موضوعاتی نظمیں محمد حسین آزاد سے قبل بھی موجود تھیں۔ اگر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو ماضی میں نظم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جو اس وقت کے مختلف اصناف میں جابجا بکھری ہوئی ہیں۔ اردو نظم کے سلسلے میں ہم اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتے کہ مغربی شاعری اور نظم نگاری سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا رشتہ اردو شاعری کی قدیم روایت سے بھی گہرا رہا ہے۔ اس لیے اردو شاعری کی قدیم روایت کے وہ حصے خاصے اہمیت کے حامل ہیں جو نظم کو جدید صورت میں تشکیل دینے میں ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔

14.2 اردو نظم کا دکنی دور

اردو نظم کا پہلا گہوارہ سرزمین دکن ہے۔ اس کی ابتدا نویں صدی ہجری میں ہوئی ہے۔ دکنی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا دور جو چودھویں' پندرہویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا ہے' تاریخ میں بہمنی دور کہلاتا ہے ۔ دوسرا دور سولہویں' سترہویں صدی عیسوی پر پھیلا ہوا ہے ۔ یہ قطب شاہی دور کے نام سے مشہور ہے ۔ ادبی و شعری نقطہ نظر سے یہ دور خاصی اہمیت رکھتا ہے ۔ اس دور کے مشہور شاعر محمد قلی قطب شاہ' عبداللہ قطب شاہ' وجہی' غواصی' سیوک' رستمی' ابن نشاطی اور نوری وغیرہ ہیں ۔

حضرت بندہ نواز گیسودرازؒ دکن کے مشہور صوفی گزرے ہیں ۔ انہوں نے کچھ رسالے تصوف کے لکھے تھے ۔ اس کے علاوہ کچھ نظمیں بھی کہی تھیں ۔ وہ شہباز تخلص کرتے تھے ۔ ان کی نظم 'چکی نامہ' کا ذکر خوب ہوتا ہے ۔ اس نظم میں انہوں نے چکی کے گیت کی صورت میں عورتوں کو مذہبی حقائق یاد دلائے ہیں ۔ بندہ نواز گیسودرازؒ کے والد سید یوسف حسینی شاہ راجو کی بھی چند نظمیں ملتی ہیں ۔ ان کی ایک نظم 'چکی نامہ' کے نام سے مشہور ہے اور یہ اردو کی پہلی نظم قرار دی جاسکتی ہے ۔ فنی لحاظ سے یہ ایک معمولی نظم ہے ۔ لیکن اس کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے ۔ انہوں نے بھی عورتوں کے لیے کئی نظمیں لکھی ہیں ۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ پہلا صاحبِ دیوان شاعر گذرا ہے ۔ اُس کی نظمیں مختلف موضوعات پر ہیں ۔ ان میں موسموں' تہواروں' عمارتوں اور قلی قطب شاہ کی محبوباؤں کا تذکرہ ملتا ہے ۔ ہندوستانی پھلوں' پھولوں' چرند و پرند' رسم و رواج کی تفصیلات بھی موجود ہیں ۔ شوخ' سانولیوں' پریم پیاریوں کے پریم کی باتیں اور گھاتیں بیان کرنا اس شاعر کا محبوب مشغلہ ہے ۔ زمین اور زمین کی ساری رعنائیاں اور دل فریبیاں اور سحر انگیزیاں اس کی نظموں میں سموئی ہوئی نظر آتی ہیں ۔ یہ نظمیں صحیح معنوں میں ہندوستانی تہذیب کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں ۔ یہ ساری باتیں اور یہی جذبات قلی قطب شاہ کی نظموں میں نمایاں طور سے ملتے ہیں ۔ قلی قطب شاہ کی نظموں میں موضوع کا ربط تو ملتا ہے لیکن منطقی ارتقا اور تعمیر کی کمی صاف جھلکتی ہے ۔ ان کی نظموں میں گیرائی اور گہرائی نہیں ملتی تاہم یہ نظم نگاری کی ابتدائی کوششوں میں سے ہیں' اس لیے ان کی اہمیت اپنی جگہ قائم و دائم ہے ۔

قدیم دکنی دور میں چند اور شعرا کا نام لیا جاسکتا ہے جنہوں نے دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے کے علاوہ کچھ نظمیں بھی لکھیں' ان میں برہان الدین جانم اور علی عادل شاہ ثانی شاہی قابل ذکر ہیں ۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. نظم اور غزل میں بنیادی فرق کیا ہے؟
2. اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر کون ہے؟
3. دکنی کے چند اہم نظم نگاروں کے نام بتائیے ۔

14.3 اردو نظم کا ابتدائی دور شمالی ہند میں

شمالی ہند میں افضل جھنجھانوی اور جعفر زٹلی کے یہاں اردو نظم کے ابتدائی نمونے مل جاتے ہیں ۔ افضل جھنجھانوی کی '' بکٹ کہانی '' میں 1325 اشعار ہیں ۔ یہ ایک منظوم افسانہ ہے جو بارہ ماسے کے طرز پر لکھا گیا ہے ۔ افضل کو اپنی جوانی کے آخری دنوں میں ایک ہندو عورت سے محبت ہوجاتی ہے ۔ وہ اپنے معلمی کے پیشے کو ترک کردیتے ہیں ۔ وہ عورت اپنا ہاتھ افضل کے ہاتھ میں دے دیتی ہے ۔ اس نظم میں افضل نے ایک پتی ورتا عورت کے جذبات و کیفیات کی مکمل تصویر کشی کرنے کی سعی کی ہے ۔ جس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہا ہے ۔ میر حسن نے اسے شمالی ہند کی نمائندہ اور قابل قدر تصنیف قرار دیا ہے ۔ محمود شیرانی تو اسے اردو نظم کی اہم کڑی شمار کرتے ہیں ۔ اس کے علاوہ دیگر ناقدین اور تذکرہ نگاروں نے بھی اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے ۔

جعفر زٹلی نے ہجو یہ نظموں پر خاص توجہ دی' ان کی نظموں میں عریانی' فحاشی' تلذذ اور خیالات کی سطحیت ملتی ہے ۔ ان کی زبان میں بھی ناہمواری پائی جاتی ہے ۔ جعفر زٹلی سپاہی پیشہ آدمی تھے ۔ اس لیے اپنی نظموں میں انہوں نے خارجی حقائق کو بڑی خوبصورتی سے نظم کیا ہے اور یہی وجہ تھی کہ ان کی نظم '' انقلاب زمانہ '' کافی مشہور و مقبول ہوئی ۔

دلّی میں ولّی کے دیوان کی آمد کے بعد جن شعرا نے اردو شاعری کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا' ان میں فائز' حاتم' آبرو' مظہر جان جاناں' خان آرزو' وغیرہ اہم ہیں ۔ فائز کا شمار اہم شعرا میں ہوتا ہے ۔ ان کے یہاں غزل کے علاوہ مختلف موضوعات پر مسلسل نظمیں بھی ملتی ہیں جو خاصی تعداد میں ہیں ۔ فائز نے اپنی نظموں میں قدیم زبان کا استعمال کیا ہے۔ ان کے یہاں ہندی کے الفاظ بھی کثرت سے ملتے ہیں ۔ ان کی یہ تمام خوبیاں اپنے عہد کے شاعروں میں انہیں ممتاز ومنفرد بناتی ہیں ۔

حاتم بھی نظم گوشعرا کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں ۔ ان کے یہاں بھی مسلسل نظموں کے بہت سارے نمونے ملتے ہیں ۔ روبہ زوال معاشرے پر حاتم کی بڑی گہری نظر تھی ۔ انہوں نے تباہ و برباد ہوتی ہوئی دہلی کی بڑی عبرت ناک تصویر کشی کی ہے ۔ انہوں نے داخلی اور خارجی دونوں طرح کے موضوعات کو بخوبی برتا ہے ۔ ان کی نظموں میں خیالات کا تسلسل ملتا ہے لیکن موضوع کا ارتقا نہیں ملتا۔ زبان و بیان بھی معمولی درجے کے ہیں ۔ دلی میں شاعری کے اس ابتدائی دور میں ولی' سراج اور آبرو کی مثنویوں میں نظم کے ٹکڑے بخوبی ملتے ہیں ۔ ولی کی مثنوی ''شہر سورت کی تعریف میں'' سراج کی ''بوستانِ خیال'' اور آبرو کی ''موعظت' آرائش معشوق'' خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. بکٹ کہانی کا شاعر کون ہے؟
2. جعفر زٹلی کی کونسی نظم زیادہ مشہور ہوئی ؟

14.4 نظیر اکبر آبادی

آگے چل کر میر وسودا کا دور آتا ہے ۔اس دور میں بھی اردو شاعری اپنے ارتقائی منازل سے گزرتی رہی ۔ دہلی اور لکھنو میں اردو کے کئی اہم اور نامور شعرا پیدا ہوئے ۔ جنہوں نے اردو شاعری کو بام عروج پر پہنچادیا۔ چند ممتاز شعرا کے نام اس طرح ہیں ۔ سودا' میر' میر حسن' جرات' انشا' مصحفی' نظیر' درد' اثر' ذوق' مومن' غالب' ناسخ اور آتش وغیرہ ۔اس کے علاوہ مرثیہ گوشعرا جن میں ضمیر' خلیق' انیس اور دبیر وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں ۔ بحیثیت مجموعی یہ دور اپنی غزل گوئی کے لیے مشہور ہے اور نظیر کے علاوہ کسی نے نظم کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اس لیے نظیر کے علاوہ کسی شاعر کو نظم گو شاعر کا درجہ دینا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی اس دور کا تنہا ایسا شاعر ہے جس نے روایت سے الگ ہو کر شاعری کی اور نظم کو اپنے تجربات و خیالات کا وسیلہ بنایا۔ نظیر کا یہ تجربہ بالکل نادر اور انوکھا تھا ۔ انہوں نے خواص کے بجائے عام لوگوں کے لیے شاعری کی ۔ نظیر کے مشاہدے میں غیر معمولی گیرائی تھی۔ نظیر اکبر آباد میں رہتے ہوئے بھی ایک باشعور اور حساس فنکار کی طرح سارے ملک کی تقدیر' اس کی زبوں حالی اور برگشتگی کا نظارہ کررہے تھے اور تباہی و بربادی کے اس روح فرسا نظارے سے متاثر ہورہے تھے ۔ نظیر نے اپنی اکثر نظموں میں اس کا ذکر کیا ہے ۔ مسلسل جنگ' لوٹ مار' قتل عام' آبادیوں اور شہروں کی ویرانی و بربادی' فصلوں کی تباہی' صنعت وحرفت کی بے قدری' بیروزگاری اور ان سب سے پیدا ہونے والی معاشی' معاشرتی دقتیں اور اخلاق سوزی کے واقعات وغیرہ' یہی سارے عوامل تھے جن میں نظیر کی شاعری پروان چڑھتی ہے اور یہی سیاسی و سماجی پس منظر ان کی مختلف نظموں کے موضوعات بنتے ہیں ۔ نظیر کا تنوع اور ان کی معلومات بہت کم شاعروں کے حصے میں آئی ہیں ۔ آج اردو نظم کافی آگے بڑھ چکی ہے لیکن نظیر کی حیثیت ایک روشن مینار کی سی ہے جو بہت سارے نظم نگاروں کی راہ روشن کررہے ہیں ۔

نظیر کا انتقال 1830ء میں ہوتا ہے ۔ ان کے بعد کچھ دنوں تک نظم کی دنیا سنسان و خاموش رہتی ہے ۔ پھر اردو نظم کی دنیا میں محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی اہم نظم گوشعرا کی حیثیت سے منظر عام پر آتے ہیں ۔ نظیر سے لے کر آزاد تک کا عہد خاص طور سے غزل کا عہد رہا۔ اس زمانے میں مثنوی' مرثیہ اور قصیدے بھی لکھے گئے لیکن نظم پر باقاعدہ توجہ نہیں دی گئی ۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. نظیر کا مقام پیدائش بتائیے؟
2. نظیر کی نظموں کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

14.5 1857 کے بعد نظم

جدید نظم کے اولین علم برداروں میں محمد حسین آزاد کا نام سرفہرست ہے۔ انہیں اس بات کا احساس ہو چلا تھا کہ نئی تہذیب اور نئے علوم و فنون کے اثرات سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں' جس سے یہاں کی تہذیب بدل رہی ہے۔ بدلتے ہوئے حالات نے نظم کا نیا تصور قائم کرنے میں مدد دی۔ کرنل ہالرائیڈ اس وقت پنجاب کے سررشتہ تعلیم کے منتظم اعلیٰ تھے۔ ان کے مشورے اور لاہور کے ہندو مسلم اور سکھ علما و فضلا کی مدد سے 21 جنوری 1865ء کو محمد حسین آزاد نے 'انجمن پنجاب' قائم کیا تا کہ اپنے مقصد میں کامیابی کے لیے انہیں ایک پلیٹ فارم مل سکے۔ انجمن پنجاب کا قیام ایک تاریخی قدم تھا۔ کرنل ہالرائیڈ اس انجمن کے سرپرست تھے۔ اور انہیں کی صدارت میں 1867 میں پہلی بار جلسہ ہوا جس میں مولانا محمد حسین آزاد نے ''نظم اور کلام موزوں'' کے باب میں کافی اہم لکچر دیا۔ اس کے بعد یہاں ماہانہ لکچر ہونے لگے۔ آزاد نے قدیم شاعری کی خامیاں اور جدید نظمیہ شاعری کے محاسن کی طرف لوگوں کی توجہ دلائی۔ آزاد کے انہیں لکچرز نے لوگوں کے ذہنوں کو جدید نظم کی طرف مائل کیا۔ 75-1874ء کے جلسے میں ایک اہم بات یہ ہوئی کہ مصرعہ طرح پر غزلیں پڑھنے کے بجائے مختلف موضوعات پر نظمیں پڑھی گئیں۔

14.5.1 انجمن پنجاب اور نظم

انجمن پنجاب کا دائرہ ان کے اغراض و مقاصد کی رو سے کافی وسیع نظر آتا ہے۔ 1857 کی جنگ آزادی کی وجہ سے لوگ کافی ڈرے اور سہمے ہوئے تھے۔ انگریزوں کے کسی بھی اقدام کو خدشے اور بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انجمن کے قیام کا مقصد اس بدگمانی کو دور کرنا بھی تھا۔ شروع میں اس جلسہ میں شریک ہونے والے انگریزی ملازم' امرا و رؤسا ہوا کرتے تھے۔ لیکن جلد ہی اس میں عام لوگوں کو شامل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ اس طرح حکام کی دلچسپی اور سرپرستی سے یہ انجمن کامیابی کی راہ پر چل نکلی۔

جب 30 مئی 1874ء میں انجمن پنجاب نے مصرع طرح کے بجائے ایک مخصوص موضوع پر نظمیں لکھ کر مشاعروں میں شرکت کا اعلان کیا تو لاہور میں ایسے مشاعروں کا سلسلہ چل نکلا۔ ان میں سے اکثر مشاعروں میں مولانا الطاف حسین حالی نے بھی شرکت کی۔ پہلے مشاعرے میں یعنی 19 اپریل 1874 میں محمد حسین آزاد کا لکچر اور مثنوی ''شب قدر'' پڑھی گئی۔ دوسرے میں یعنی 30 مئی 1874 کو برسات کے موضوع پر نظمیں پڑھی گئیں۔ تیسرے یعنی 30 جون 1874 کو 'زمستان' کے عنوان پر نظمیں ہیں۔ چوتھے یعنی 3 اگست 1874 کو 'امید' کے موضوع پر نظمیں کہی گئیں۔ اس طرح کچھ وقفے کے ساتھ مختلف موضوعات پر گیارہ مشاعرے ہوئے جس میں اکثر شریک ہونے والے شعرائے کرام اس طرح تھے: آزاد' حالی' انور حسین' ذوق کاکوری' اشرف بیگ' قادر بیگ' مضطر دہلوی' راحت دہلوی' مرزا مشرف بیگ دہلوی' فکری دہلوی' امام بخش' کرشن لعل' رفیق' حقیر' محمد سعید اور دیگر بہت سارے دوسرے شعرا شریک ہوئے۔

شروع شروع میں بعض گروہوں کی جانب سے ان مشاعروں کی مخالفت بھی ہوئی۔ ان پر تنقیدیں کی گئیں۔ بعض اخبارات نے محمد حسین آزاد کی مخالفت میں تبصرے بھی شائع کئے۔ 1875ء میں مشاعرہ بند ہو گیا۔ لیکن جدید نظم کی جو بنیاد پڑی وہ آہستہ آہستہ مضبوط اور مستحکم ہوتی گئی۔ پروفیسر احتشام اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک علاحدہ صنف کی حیثیت سے نظم کو پوری طرح پھلنے پھولنے کے لیے اس دور جدید کا انتظار کرنا پڑا۔ جس نے انیسویں صدی کے وسط میں زندگی کی بنیادوں میں تبدیلی پیدا کر دی''۔

محمد حسین آزاد

اس مشاعرے میں آزاد نے برسات' زمستان' تہذیب' امید' حب وطن اور قناعت وغیرہ کے موضوعات پر نظمیں پڑھیں ۔ آزاد کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے شاعری میں نئی اصناف کا اضافہ کیا اور مثنوی کے دائرے کو مزید وسعت بخشی ۔ آزاد کی شاعری نیچرل شاعری کے نام سے یاد کی جاتی ہے ۔ نظم جدید کو یہ نام اس لیے دیا گیا کہ آزاد اور حالی نے بیشتر نظموں میں مناظر فطرت کی تصویر کشی کی ہے ۔ انہوں نے ایسا کرتے ہوئے شعوری یا غیر شعوری طور سے انیس اور نظیر کی شاعری کی توسیع کی ہے ۔ میر حسن کے یہاں روایت کا شائبہ اور تکلف ملتا ہے لیکن آزاد کی منظر نگاری میں فطری حسن اور سادگی ملتی ہے ۔ آزاد نے اپنی شاعری کو روایتی حسن و عشق سے آزاد کرایا اور اردو شاعری کو نئی آب و تاب سے روشناس کیا ۔

الطاف حسین حالی

حالی نے بھی انجمن پنجاب کے مشاعرے میں نشاط امید' برکھارت' حب وطن اور مناظرۂ رحم و انصاف وغیرہ نظمیں پڑھیں ۔ مدوجزر اسلام سرسید کی ایما پر لکھی گئی ۔ یہ مسدس مسلمانوں کے ماضی و حال کا آئینہ ہے ۔ ان کی دیگر نظموں میں شکوہ ہند' مناجات بیوہ' چپ کی داد وغیرہ کا ذکر کیا جاسکتا ہے ۔ ان کی نظموں میں قومی دردمندی کا جذبہ بھی نمایاں طور پر ملتا ہے ۔ حالی اپنی نظموں میں شاعر سے زیادہ مصلح نظر آتے ہیں ۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. انجمن پنجاب کے مشاعروں کی اہمیت کیا تھی؟
2. محمد حسین آزاد کی چند نظموں کے عنوانات بتایئے ۔
3. حالی نے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں کون کون سی نظمیں پیش کیں؟

14.6 انجمن پنجاب سے باہر نظم

شبلی نعمانی بنیادی طور پر ناقد تھے لیکن انہوں نے ایک محقق' مورخ اور شاعر کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت قائم کی ۔ انہوں نے چند اہم نظمیں لکھی ہیں ۔ وہ اپنی نظم 'صبح امید' میں نادر اور معنی خیز تشبیہوں' استعاروں اور دل پذیر ترکیبوں کے استعمال سے حسن پیدا کرتے ہیں ۔ کلیم الدین احمد نے 'صبح امید' کو مسدس حالی پر ترجیح دی ہے ۔

اسمٰعیل میرٹھی' شرر اور اکبرالہ آبادی

اردو نظم کے ارتقاء میں اسمٰعیل میرٹھی کا نام بھی اہم اور قابل ذکر ہے ۔ اسمٰعیل نے تصور اور تخیل میں موضوع تلاش کرنے کے بجائے اپنے اطراف کا غائر مطالعہ کیا ۔ اور روزمرہ زندگی کے واقعات' فطری مناظر' گھریلو اشیا اور پالتو جانوروں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا اور ان پر چھوٹی چھوٹی نظمیں اکثر بچوں کے لیے لکھیں ۔

اردو نظم میں جدید اسلوب اور جدید ہیئت کو رائج کرنے اور اسے فروغ دینے کے لیے باقاعدہ تحریک چلانے کا سہرا عبدالحلیم شرر کے سر ہے ۔ انہوں نے مغربی نظموں کے نمونوں کے اتباع میں ایک شعوری تحریک چلائی اور فلپانا اور مظلوم ورجینا جیسی غیر مقفیٰ اور بے قافیہ نظم کی شکل میں شائع کیا ۔

اکبرالہ آبادی کو اردو نظم کے ارتقا میں ایک منفرد مقام حاصل ہے ۔ انہوں نے طنز و مزاح کے اسلوب کے نئے امکانات سے روشناس کرایا ۔ انہوں نے انگریزی نظموں کا مطالعہ کیا تھا ۔ برق کلیسا اور جلوہ دربار دہلی ان کی انفرادی رنگ کی نظمیں ہیں ۔ انہوں نے چھوٹی چھوٹی نظموں میں بھی فطرت کی مصوری کے نمونے پیش کیے ہیں ۔

شاد عظیم آبادی اور دیگر نظم نگار

شاد عظیم آبادی نے بھی کچھ اہم نظمیں کہی ہیں ۔ یہ سب اصلاحی رنگ لیے ہوئے ہے ۔ ان کی ایک نظم 'یاد عظیم آباد' 1875ء میں شائع ہوئی ۔ اس نظم میں انہوں نے اپنی محبت قومی کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

نظم طباطبائی' شوق قدوائی 'وحیدالدین سلیم' درگا سہائے سرور جہاں آبادی' نادر کاکوروی' منشی جوالا پرشاد برق' کیفی دہلوی' مہاراجہ کشن پرشاد شاد' پنڈت امرناتھ ساحر وغیرہ شعرا کرام بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں ۔ لیکن جو اہمیت چکبست اور اقبال کو میسّر ہے وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہے ۔ چکبست کی قابل ذکر وطنی نظم' وطن' فریاد قوم' ہمارا وطن' آوازہ قوم اور خاک ہند میں ہندوستان کی عظمت کا ذکر کیا گیا ہے ۔

تلوک چند محروم نے بھی انگریزی نظموں کا مطالعہ کیا اور بہت ساری نظموں کو اردو نظم کے قالب میں ڈھالا ۔ موت کا موسم' ایک خاندان کی قبر' ایام غم' سپاہی کا خواب' حسرت پرواز اور ترانہ عشق وغیرہ ان کی ترجمہ کی ہوئی نظمیں ہیں ۔ اس کے علاوہ بھی شام سرما' شفق شام' تصویر بہار' نور جہاں کا مزار وغیرہ موثر نظم ہے ۔

اقبال

اردو نظم کے ارتقا میں اقبال کی دین نا قابل فراموش ہے ۔ اقبال کے سامنے حالی' نظیر' آزاد' شبلی اور اسمٰعیل میرٹھی کی نظمیں بطور نمونہ موجود تھیں ۔ انہوں نے نہ صرف اس سلسلے کو آگے بڑھایا بلکہ اردو میں نظم نگاری کے وقار و معیار کو بلندی عطا کی ۔ اقبال اردو کے اہم مفکر شاعر ہیں ۔ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعے دنیا کے سامنے اپنے مخصوص نظام فکر کو پیش کیا ۔ ان کی نظموں میں ربط و تسلسل ہے ۔ مدلل اور مربوط فلسفہ ہے ۔ ایک مخصوص انداز فکر ہے ۔ اقبال کے مخاطب ہمیشہ وہ انسان رہے ہیں جو حرارت' یقین محکم اور عمل پیہم سے خالی اور جمود اور تعطل کا شکار تھے ۔ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ ان کے مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونکنے کی کوشش کی اور کامیاب زندگی گزارنے کا تصور پیش کیا ۔ ان کی کچھ اہم نظمیں خضر راہ' مسجد قرطبہ' ساقی نامہ' ذوق و شوق' والدہ مرحومہ کی یاد میں' شمع و شاعر' ابلیس کی مجلس شوریٰ' بچے کی دعا' ہمالہ' طلوع اسلام' شکوہ' جواب شکوہ' ماں کا خواب' پرندے کی فریاد' پہاڑ اور گلہری وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔ ان میں سے اکثر نظمیں اپنی فنی خوبیوں کی بلندی پر نظر آتی ہیں ۔

جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی کو بھی اردو نظم کے ارتقاء میں ایک اہم مقام حاصل ہے ۔ ان کے کم و بیش پندرہ مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں ۔ اقبال کے بعد جوش ہی نظم کے بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں ۔ انہیں شاعر فطرت' شاعر انقلاب اور شاعر شباب کہا جاتا ہے ۔ جوش کو الفاظ پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی ۔ انہیں فطری' رومانی اور سیاسی نظمیں لکھنے پر یکساں قدرت حاصل تھا ۔ ہندوستان کی سیاسی زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا واقعہ ہوا ہوگا جس پر انہوں نے نظم نہ لکھی ہوگی ۔ جوش قوم پرستی' ہندو مسلم اتحاد' حب وطن' جمہوریت' امن اور آزادی خیال کے پجاری ہیں اور ان خیالات کو انہوں نے اپنی ہزاروں نظموں میں بڑے دل چسپ اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے ۔ یہاں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ شاعری میں' خاص کر نظم میں' نئے رجحانات کے باوجود اردو کی تاریخ میں مستقبل کی دنیا ان کو بہت بلند مقام دے گی ۔

فراق گورکھپوری' اختر شیرانی اور ساغر نظامی

فراق گورکھپوری کا شمار بھی اردو نظم کے ارتقا میں ہوتا ہے ۔ وہ اپنے خیالات نئے طریقے سے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ زندگی کی ناہمواریوں اور داخلی کشمکش کے جذبات مجتمع ہو جاتے ہیں ۔ ان کی آواز میں انکسار ملتا ہے ۔ زور اور دردمندی کے ساتھ انسانی زندگی پر بھروسہ بھی ملتا ہے ۔ فراق آج کے ان ترقی پسندوں میں شمار ہوتے ہیں جو زندگی کے سبھی سنجیدہ مسئلوں کو اپنی نظموں میں جگہ دیتے ہیں ۔ رومانی' نیم رومانی اور داخلی رومانی تحریک کے علمبرداروں میں اختر شیرانی اور عظمت اللہ کے نام اہم ہیں ۔ نیم رومانی تحریک براہِ راست اقبال سے متاثر ہے ۔ اور اس میں جوش اور حفیظ کے علاوہ ترقی پسند تحریک کے بیشتر شعرا کو شامل کیا جا سکتا ہے اور داخلی تحریک میر جی اور اس کے معاصرین سے

لے کر جدید علامت پسند شعراء تک پھیلتی چلی گئی ہے۔

اختر شیرانی کی نظموں کے مطالعہ سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اس کا موضوع اسلاف کے کارناموں کا بیاں یا خودی کی فلسفیانہ توضیح نہیں بلکہ کائنات میں عورت کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے۔ ان کی نظموں میں عورت' زندگی کے ایک خاص رخ کی علامت بن کر نمودار ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک عورت صرف حسن اور خیر کا ہی کا سرچشمہ نہیں بلکہ تخلیقل اور محبت کا منبع بھی ہے۔

اردو نظم کے ارتقامیں ساغر نظامی کی حیثیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ ابتدا میں وہ رومانی نظمیں لکھتے تھے۔ پھر جب وطن میں محو ہوگئے اور بہت سی حسین اور جوشیلی نظمیں لکھیں۔ دھیرے دھیرے انہوں نے سیاسی رنگ بھی پیدا کرلیا اور آزادی' سماج واد' اور عوام کے حقوق کی باتیں کرنے لگے۔ ساغر نے کئی اہم نظمیں لکھیں جن میں مشعل آزادی اور نہرو نامہ طویل اور اہم ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اقبال کی دو اہم نظموں کے نام لکھیے۔
2. اردو کے تین اہم نظم گو شعرا کا نام بتائے۔

14.7 ترقی پسند تحریک اور اردو نظم

1935-36 میں ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی شروعات ہو۔ کئی اچھے باصلاحیت اور نوجوان شاعر اس تحریک میں شامل ہوگئے اور کچھ پرانے ادیب بھی اس کی حمایت کرنے لگے۔ اچھے شعرا اور مصنفین نے اس تحریک میں ایک نئی طاقت اور نئی روشنی دیکھی۔ یہاں جن شعر کا ذکر ہوگا ضروری نہیں کہ وہ سب کے سب پوری طرح ترقی پسند ہیں یا ترقی پسند مصنفین کے سبھی آدرشوں کی پابندی کرتے ہیں۔ اس انجمن کو ہندوستانی زندگی کے ترقی پذیر افکار کا مرکز بنتے دیکھ کر بہت سے ایسے افراد بھی اس میں شامل ہوگئے جو سطحی خام خیالوں میں الجھے ہوئے تھے اور اپنی شخصیت کو ایک نیا میدان فراہم کرنا چاہتے تھے۔ کچھ تو ایسے تھے جو علامت نگاری' ابہام' تجربہ پسندی اور دوسرے خیالات کو ترقی پسندی سمجھ کر اس انجمن میں شامل ہونے آئے تھے۔ واضح رہے کہ ابتدا میں ترقی پسند اور داخلیت پسند شعرا میں کوئی حد فاصل قائم نہیں تھی۔ چنانچہ ایک لمبے عرصے تک تمام جدید نظم گو شعرا کو ترقی پسند شاعری کا داعی اور علمبردار قرار دیا گیا۔ ترقی پسند نظم گو شعرا سماجی شعور کی روایت اقبال سے اخذ کیا اور بعد میں اس میں مارکسزم کا اضافہ کرکے اقبال کے دوسرے نظریات سے انحراف کیا۔ ایک اور اہم بات جو دیکھنے کو ملتی ہے وہ یہ کہ تقریباً تمام اہم ترقی پسند شعرا کے یہاں رومان کے راستے حقیقت تک رسائی پانے کا ایک واضح رجحان دکھائی دیتا ہے۔

فیض خالص ترقی پسند نظم گو شاعر ہے۔ رومان کے راستے سے حقیقت کی طرف نکل آنے کا عمل اس کے یہاں واضح دکھائی دیتا ہے۔ فیض کی شاعری میں قدیم شعرا کا وزن اور فن کارانہ حسن بھی ملتا ہے اور نئی زندگی کی بے چینی کے ساتھ ساتھ انقلابی حوصلہ بھی ملتا ہے۔ وہ روایت سے اسی قدر ہٹتے نظر آتے ہیں جتنا وہ اپنے خیالات کے اظہار کے ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ اپنا وقت تجربوں میں صرف نہیں کیا بلکہ جو بھی ان کی نظمیں پڑھتا ہے اسے ایک درد انگیز' پُر امید اور طاقت ور جدت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی غم کو کائناتی غم میں بدلنے کی سعی کرتے ہیں۔

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے

تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوادی ہم نے

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے
اتنے احسان کے گنواؤں تو گنوا نہ سکوں

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے' کیا پایا ہے
جُز تیرے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

فیض نے اپنی نظموں کے ذریعے جدید اردو نظم کی ترقی و ارتقا میں اہم اور نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

مجاز

اسرار الحق مجاز بھی ترقی پسند نظم گو شعرا میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ مجاز کو اس وقت کے ہندوستان کے نوجوانوں کی تمناؤں' آرزوؤں' تصوروں اور بے تاب امنگوں کا شاعر کہا جاسکتا ہے۔ آوارہ' بربط شکستہ' ایک غمگین یاد وغیرہ ان کی خوبصورت نظمیں ہیں۔ گرچہ انہوں نے کم لکھا ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے اعلیٰ درجہ کا لکھا ہے۔

جاں نثار اختر

جاں نثار اختر کی نظمیں حسین اور جاندار ہوتی ہیں۔ وہ ترقی پسند نظم گو شعرا میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ طالب علمی کے دور میں بڑی دل فریب اور رومانی نظمیں لکھتے تھے۔ بعد میں دوسرے شعرا کے مانند وہ بھی انقلاب کی طرف آئے۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

علی سردار جعفری

علی سردار جعفری نے بھی شروع میں رومانی نظمیں لکھیں۔ وہ بھی بعد میں سماجی اور سیاسی مسئلوں کو حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے شعور کا ارتقا قومی اور بین الاقوامی شعور کے ساتھ ہوا۔ انسان دوستی ان کی شاعری میں بنیادی موضوع ہے۔ ناانصافی اور ظلم کے خلاف سردار جعفری کے الفاظ اور جملے' جملوں کی مانند نظر آتے ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام: پتھر کی دیوار' خون کی لکیر' ایشیا جاگ اٹھا' امن کا ستارہ' ایک خواب اور' اور ایک طویل نظم نئی دنیا کو سلام کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

ساحر لدھیانوی

ساحر لدھیانوی کی ابتدائی نظموں میں حسن و محبت کا بڑا دل چسپ بیان ملتا ہے۔ شکست' میرے گیت چکلے' گریز' بلاوا' احساس' تاج محل' طلوع اشتراکیت اور پرچھائیاں وغیرہ ان کی قابل ذکر نظمیں ہیں۔ ان کے تشبیہ و استعارے حسین و لطیف ہوتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں سادگی' نرمی اور تراش کا احساس ہوتا ہے۔

کیفی اعظمی

کیفی اعظمی بھی ایک مقبول' ترقی پسند اور انقلابی شاعر ہیں۔ شروع میں کیفی نے بھی رومانیت میں ڈوبی ہوئی نظمیں کہیں پھر بعد میں شعوری طور پر قوم پرستی اور آزادی کے گیت گائے۔ ان کی نظر عالمی اور بین الاقوامی واقعات و سیاسیات پر گہری تھی جس کو انہوں نے اپنی نظموں میں برتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی نے اپنی نظموں میں بڑی خوبصورتی سے دیہات کی تصویر کشی کی ہے۔ ان کا اسلوب شاعری بڑا جاندار اور ان کے الفاظ بڑے میٹھے لگتے ہیں۔ شروع میں انہوں نے رومانیت کو ہی اپنایا تھا مگر دھیرے دھیرے سیاسی بیداری سے متاثر ہو کر فکر انگیز نظمیں لکھنے لگے۔ ان کی نظمیں انسان دوستی کا جذبہ جگاتی ہے اور مستقبل کے سنہرے خوابوں کی عکاسی کرتی ہے۔

مخدوم محی الدین

مخدوم ترقی پسند تحریک سے وابستہ ایک عظیم شاعر تھے۔ ان کی شاعری ان کی زندگی ہے اور زندگی ان کی شاعری ہے۔ وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ غریبوں اور مزدوروں کے ساتھ زندگی گزاری۔ سامراجی اور جاگیرداری شکنجوں کے کرب کو محسوس کیا۔ مخدوم نے محنت اور محبت دونوں کو مجبور دیکھا اس لیے وہ دونوں ہی کی جیت اور کامرانی کا متمنی نظر آتے ہے۔ یہی مخدوم کی شاعری کا مرکزی خیال ہے۔ ان کی شاعری میں توانائی' لطافت اور حسن کی فراوانی ہے۔

مجموعی طور سے اردو نظم کی تدریجی ارتقا میں ترقی پسند نظم کی اہمیت اس بات میں ہے کہ اس نے شاعر کے باطن کو چھوا ہے۔ محبت کے جذبے کو ایک کشادہ کینوس عطا کرنے کی کوشش کی۔ ترقی پسند نظم گو شعرا نے باطن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ کچھ اہم ترقی پسند نظم گو شعرا کا ذکر نہ ہوسکا جن کے نام احسان دانش، وامق جونپوری، ظہیر کاشمیری، غلام ربانی تاباں، شمیم کریانی، عرش ملسیانی، اختر انصاری، میکش حیدرآبادی، میر حسن، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، سکندر علی وجد وغیرہ ہیں۔ ان تمام شعرا نے اردو نظم کے ارتقا میں اہم اور نمایاں کردار ادا کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اردو نظم کے ارتقا میں ترقی پسند تحریک کا کیا رول رہا ہے؟
2. ترقی پسند شاعروں میں سے کسی تین کے نام بتائے۔
3. ساحر لدھیانوی کے چند قابل ذکر نظموں کے نام بتائے۔
4. مخدوم کی شاعری کا مرکزی خیال کیا ہے۔

14.8 حلقہ ارباب ذوق

ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ ایک اور تحریک یا رجحان چلتا رہا جسے ادب میں ''حلقہ ارباب ذوق'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کے اہم شعرا میں میراجی، ن۔م۔راشد، تصدق حسین خالق، قیوم نظر وغیرہ شامل ہیں۔ جدید نظم کو صحیح معنوں میں جن نظم نگاروں نے ہیئتی تنوع اور معنوی عمق کے اعتبار سے مغربی نظموں کے نمونوں سے ہمسری کرنے کے قابل بنادیا، ان میں ن۔م۔راشد، میراں جی اور فیض احمد فیض وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے اپنی ذہانت، وسعت مطالعہ اور فکری اپج کی بدولت جدید نظم کے لیے ترقی کی ایک نئی راہ کھول دی۔ ان کے انداز فکر اور طرز اسلوب کے اثرات بہت جلد محسوس کیے گئے اور کئی نئے تعلیم یافتہ شعرا ان کے اتباع میں نئی طرز کی نظمیں لکھنے لگے۔ ان میں ڈاکٹر تاثیر، مجید امجد، اختر الایمان، قیوم نظر، یوسف ظفر، مختار صدیقی، ضیا جالندھری، عارف عبدالمتین، ظہور نظر، بلراج کومل، منیر نیازی، خلیل الرحمٰن اعظمی، قاضی سلیم، محمد علوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ن۔م۔راشد نے بیسویں صدی میں اردو نظم کو تصور، ہیئت اور اسلوب کی جدت پسندی کے اعتبار سے مغربی نظموں سے ہم آہنگ کرنے میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی فنی بصیرت سے کام لے کر اردو نظم کو یورپی شاعری کی سطح پر لا کھڑا کردیا۔ راشد نے جدید اردو نظم کی تشکیلی عمل میں یورپی نظموں کے نمونوں کو سامنے رکھا ہے اور اس طرح انہوں نے اردو نظم کا ایک نیا معیار قائم کرنے کی سعی کی ہے۔ مغربی ادب کے مطالعہ نے راشد کے ذہن و فکر پر نئے تشکیلی اثرات مرتسم کیے۔ انھیں شخصی تجربات کے اظہار کے لیے نئے شعری پیمانوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے نظم آزاد کو اپنی شخصیت کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ان کی چند اہم نظمیں، ایران میں اجنبی، حسن کوزہ گر، خودکشی، اجنبی عورت، سباویراں، دریچے کے قریب، رقص اور کون سی الجھن کو سلجھاتے ہیں ہم وغیرہ اہم ہیں۔

اردو نظم کے ارتقا میں میراجی کا نام اہم ہے۔ میراجی نے اردو نظم کو ہیئت اور طرز دونوں کے اعتبار سے یورپی نظموں کے بلند معیار سے ہم آہنگ کرنے کی شعوری کوشش کی۔ میراجی کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ انگریزی، فرانسیسی، امریکی، جرمنی اور روسی زبانوں کی شاعری کا مطالعہ کیا تھا۔ ان زبانوں کی کئی نمائندہ نظموں کا منظوم ترجمہ بھی کیا۔ میراجی کی نظموں میں جنس ایک اہم موضوع رہا ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں مین جنسی موضوع کو بھرپور انداز میں برتنا شروع کیا۔ ان نظم کروٹیں۔ دھوبی کا گھاٹ، ایک شام کی کہانی، دوسری عورت اور اخلاق کے نام وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن جنسی الجھن کا موضوع پست سطح سے بلند ہوکر اس دور کی اجتماعی زندگی میں ایک اہم پہلو کا مظہر بن جاتا ہے۔ جنسی جذبہ جب شکستِ آرزو کی ارفع صورت میں ڈھل جاتا ہے تو پُرتاثیر نظمیں وجود میں آتی ہیں۔ اس سلسلے میں نارسائی، کٹھور، مجھے گھر یاد آتا ہے۔ مجاور، دور کنارا، عدم کا خلا قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں میں دوری کی اذیت، شخصی محرومی، غم انتظار، ذہنی تلاش اور ذوق تپش کا بیان ملتا ہے۔ اجنتا کے غار قدرے طویل نظم ہے۔ بعد کی اڑان، اندھا طوفان، فاختہ، کوا وغیرہ علامتی نظمیں ہے۔ اونچا مکان میں ایک فاحشہ کی قابل رحم زندگی کا بیان ملتا

ہے۔کلرک کا نغمۂ محبت'' میں کلرک کی مجبور زندگی کے ادھورے خوابوں کا سیدھا سادا بیان ملتا ہے۔

میرا جی نے اردو نظم کو موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے نئی وسعتوں سے آشنا کیا۔ اردو نظم کے مزاج میں ایک بڑی تبدیلی پیدا کی۔ میرا جی کے بعد ان کے طرز فکر اور انداز بیان کے اثرات کئی جدید نظم نگاروں میں محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ میرا جی کی نظمیں جدید نظم کے ارتقا میں ایک اہم موڑ کا پتہ دیتی ہیں۔

اختر الایمان' راشد' میرا جی اور فیض کے بعد جدید اردو نظم کے دائرے کو وسیع تر کرنے میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں فیض اور راشد کی طرح سماجی اور معاشرتی مسائل سے گہری دلچسپی ہے۔ ان کی فکری توجہ کا مرکز زندگی کی بدلتی ہوئی قدریں ہیں۔ اختر الایمان کے یہاں غم اور کسک کی ایک گہری کیفیت ابھری ہے۔ ان کو زندگی اور اس کے مظاہر سے بڑا پیار ہے اور وہ شکست و ریخت کے اس عمل سے ہراساں ہے۔ اختر الایمان کے غم میں زیاں کا ایک گہرا احساس شامل ہے۔ اختر الایمان کی بہترین نظمیں اس کیفیت کی عکاس ہیں۔ فیصلہ' مسجد' پرانی فصیل' تنہائی میں' جواری' پگڈنڈی' تعمیر' واپسی' دستک' شکوہ اور یادیں اس سلسلے کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ اختر الایمان نے کمزور نظمیں بھی لکھیں لیکن ان کی کامیاب نظمیں فکری اور فنی عظمت کے چند نئے گوشے روشن کرتی ہیں۔ خاص طور پر ان کی یہ نظمیں:دست: یادیں اور'' ایک لڑکا'' فکری عمق' ایمائی اثر آفرینی اور اسلوب کی انفرادیت کے اعتبار سے جدید نظموں میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔

14.9 نظم آزاد کے بعد

آزادی کے بعد اردو نظم میں بہت سارے رجحانات در آئے۔ کچھ رجحانات کا سلسلہ مغرب کی جدید نظموں سے ملتا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے زمانے میں انسان' مشینی زندگی کا ایک پرزہ بن کر رہ گیا ہے۔ صنعتی نظام حیات میں انسان کی تنہائی' بے بسی' بے چارگی کے احساسات سے دوچار ہوتی ہے۔ لوگ شہروں کی طرف جارہے ہیں۔ بڑے اور صنعتی شہروں کی بھاگ دوڑ سے خاندان کا شیرازہ منتشر ہورہا ہے۔ تنہائی نے خودغرضی کے جذبات کو فروغ دیا ہے۔ انسان کی تمنائیں' آرزوئیں' خواہشات صرف اپنی ذات تک ہی محدود ہورہی ہیں۔ یہ دور شدید ذہنی خلفشار' برہمی اور ملال کا دور ہے۔ صرف اردو ہی نہیں اس دور کی تمام زبانوں کی نظموں میں ان کیفیتوں کا اظہار ہورہا ہے۔ عمیق حنفی کی سندباد' شہرزاد' شب گشت' سیارگان' ویت نام' صورت الناقوس' سبز آگ' صلصلۃ الجرس وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ذہنی تناؤ اور کشمکش کی کیفیت ساتویں اور آٹھویں دہائی کی اردو نظموں میں عام ہے۔ عمیق حنفی' وحید اختر' ابن انشا' وزیر آغا وغیرہ کی نظموں میں اس دور کی عکاس ملتی ہے۔ سلیم احمد کی نظم 'مشرق' کافی مقبول ہوئی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے مشرق و مغرب کے دو زاویوں اور دو تہذیبوں کے مجادلے کو پیش کرتے ہیں' آدھی صدی کے بعد' وزیر آغا کی نظم ہے جو پانی کے دھارے کو ایک ایسے انسان کی تمثیل کے طور پر پیش کرتی ہے جس کی زندگی زمانوں یا تین ادوار کی بے بہا لہروں اور کروٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ فہمیدہ ریاض کی نظم 'کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے؟' اردو نظم کے سفر کا ایک اہم موڑ ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. آزادی کے بعد جدید نظم میں کون کون سے رجحانات آئے؟
2. چند جدید نظم گو شعرا کے نام لکھیے۔

14.10 خلاصہ

انسان کی کثیر الجہات زندگی کا مکمل اظہار سب سے بہتر صورت میں اردو نظم میں ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ کیونکہ موجودہ دور میں بعض خصوصیات وجہ سے سب سے جاندار صنف سخن اردو نظم ہے۔ اقبال' جوش' علی سردار جعفری' عمیق حنفی' وحید اختر وغیرہ نے دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی مگر ان کے جوہر اردو نظم میں ہی کھلتے ہیں۔

بلا شبہ اردو نظم جس میں زندگی کے تغیر و تبدل، زمانے کی شکست و ریخت اور انقلابات کو بڑی خوبی، وضاحت اور علامتی تہہ داری کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ تمام اصناف سخن جو کبھی آرائش محفل ہوا کرتی تھیں، زمانے کی کروٹوں کے ساتھ فنا ہوگئیں یا انہوں نے اپنی ہیئت ہی بدل دی۔ لیکن اردو نظم میں آج بھی نئی توانائی محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہ اور اس طرح کے بہت سارے اسباب ہیں جن سے ہمیں مستقبل میں اردو نظم کے امکانات روشن اور تابناک نظر آتے ہیں۔ اردو نظم کی وسعتوں اور امکانات کو دیکھتے ہوئے ہمیں امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ اردو نظم نہ صرف زندہ رہے گی بلکہ اس کا ارتقائی عمل بھی جاری و ساری رہے گا۔

14.11 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. اردو نظم کے آغاز و ارتقا پر مختصراً روشنی ڈالیے۔
3. اردو نظم نگاری میں ترقی پسند شعرا کی دین سے بحث کیجیے۔
5. آزادی کے بعد اردو نظم نگاری کے سفر کا جائزہ پیش کیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

2. سرسید تحریک کے زیر اثر جن نظم گو شعرا نے شاعری کی، ان پر نوٹ لکھیں۔
4. جدید نظم نگاروں پر ایک نوٹ لکھیں۔
6. اردو نظم کے کسی ایک شاعر کی نظم نگاری کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔

14.12 سفارش کردہ کتابیں

1.	خلیل الرحمٰن اعظمی	نئی نظم کا سفر
2.	وزیر آغا	نظم جدید کی کروٹیں
3.	وزیر آغا	اردو شاعری کا مزاج
4.	عبادت بریلوی	جدید شاعری
5.	یعقوب یاور	ترقی پسند اردو شاعری
6.	ڈاکٹر حنیف کیفی	نظم معریٰ اور آزاد نظم
7.	آل احمد سرور	ادب اور نظریہ
8.	ڈاکٹر محمد عقیل صدیقی	اردو نظم نظریہ و عمل
9.	حامدی کاشمیری	جدید اردو نظم اور یورپی اثرات
10.	ڈاکٹر قمر رئیس/ عاشور کاظمی	ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر
11.	علی سردار جعفری	ترقی پسند ادب
12.	گوپی چند نارنگ	اقبال کا فن

اکائی : 15 دکن میں نظم نگاری

ساخت

15.1 تمہید
15.2 عہد
15.3 دکنی نظم کے موضوعات
15.4 عہد بہمنی میں نظم نگاری
15.5 عادل شاہی عہد میں نظم نگاری
15.6 قطب شاہی عہد میں نظم نگاری
15.6.1 عید میلاد النبیؐ
15.6.2 مرگ یا آمد برسات
15.7 خلاصہ
15.8 نمونہ امتحانی سوالات
15.9 فرہنگ
15.10 سفارش کردہ کتابیں

15.1 تمہید

یہ خیال عام ہے کہ نظم کا آغاز شمالی ہند میں ہوا۔ بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ نظم گوئی کا آغاز نظیر اکبر آبادی سے بہت پہلے دکن میں ہوا۔ دکن میں شعرا نے مختلف اور متعدد موضوعات پر بڑی اچھی نظمیں کہی ہیں۔ دکنی نظم کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے۔ بہمنی دور میں خواجہ بندہ نواز سے منسوب چکی نامہ پہلی موضوعاتی نظم ہے۔ عادل شاہی دور میں جو نظمیں ملتی ہیں زیادہ تر ان کا تعلق مذہب و اخلاق سے ہے۔ قطب شاہی دور میں محمد قلی قطب وہ شاعر ہے جس کے یہاں متنوع موضوعات پر نظمیں ملتی ہیں۔

15.2 عہد

اردو ادب کا قدیم دور جسے ہم دکنی دور کہتے ہیں، کم و بیش چار سو سال پر محیط ہے۔ سب سے پہلی سلطنت بہمنی سلطنت تھی جو 1350 میں قائم ہوئی۔ 1525ء میں جسکا خاتمہ ہوا اس ایک سلطنت کے ٹوٹنے سے پانچ دکنی سلطنتیں وجود میں آئیں جن کا ذکر آ چکا ہے۔ ان پانچ سلطنتوں میں عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے زیر سرپرستی اہم علمی و ادبی کارنامے منظر عام پر آئے۔ عادل شاہی سلطنت 1490ء میں وجود میں آئی اور 1686ء میں اس کا خاتمہ ہوا۔ قطب شاہی سلطنت 1518ء میں قائم ہوئی ؟ 1687ء میں اس کا زوال ہوا۔ ان سلطنتوں نے بہمنی سلطنت کی طرح مقامی روایات اور تہذیبی اقدار کو فروغ دینے میں بھرپور حصہ لیا۔ دکنی زبان اور ادب کی سرپرستی کی چنانچہ نظم نگاری کے ابتدائی نقوش ہمیں بہمنی دور اور اس کے بعد قطب شاہی اور عادل شاہی عہد میں ملتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. دکن کی پہلی سلطنت کا نام کیا ہے، وہ کب قائم ہوئی ؟

2. عادل شاہی سلطنت کا قیام کب عمل میں آیا؟

3. قطب شاہی سلطنت کب قائم ہوئی اور کس سنہ میں اس کا زوال ہوا؟

15.3 دکنی نظم کے موضوعات

دکنی نظم کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے۔ مذہبی امور' صوفیانہ خیالات' حسن و عشق کی داستانیں' مناظر قدرت' سماجی اور تہذیبی زندگی کے متعدد پہلو' عیش و عشرت کی محفلوں کا تذکرہ' میلوں ٹھیلوں' عیدوں اور تہواروں کا بیان' غرض کوئی پہلو ایسا نہیں' کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر دکنی شعرا نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ دکن کے شعرا کو اپنی سرزمین سے بڑی محبت تھی۔ یہاں کے ماحول سے' یہاں کے رسم و رواج سے' یہاں کے تہواروں سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ اسی محبت اور لگاؤ نے ان سے ایسی نظمیں کہلوائیں جن سے ان کے جذبۂ حب الوطنی کا اظہار ہوتا ہے۔ دکنی نظموں کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ ان میں ہندوستانی تہذیب کی عکاسی ملتی ہے۔ سماجی اور معاشرتی زندگی کی جھلکیاں نیز حقیقت اور واقعیت کی تصویریں ملتی ہیں۔ ان میں یہاں کی سرزمین کی ساری رعنائی اور دلکشی سمٹ آئی ہے۔ قلی نے اپنی پیاریوں کا تذکرہ بھی اپنی نظموں میں بڑی خوبی سے کیا ہے۔ یہ پہلا شاعر ہے جس نے اردو نظم کو رومانی موضوعات سے سنوارا۔ دکنی نظموں کی ایک اور خوبی اندازِ بیان کی سادگی اور روانی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. دکنی نظم کے اہم موضوعات کیا ہیں؟

2. کس دکنی شاعر نے اردو نظم کو سب سے پہلے رومانی موضوعات سے سنوارا ہے؟

15.4 عہد بہمنی میں نظم نگاری

دکن میں نظم کی روایت متعین کرنا نسبتاً مشکل ہے کیوں کہ محمد قلی قطب شاہ سے قبل نظم کی مستقل روایت نہیں ملتی۔ بہمنی دور کے ادب کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں طویل نظموں کا عام رواج ہے۔ مختصر نظمیں بھی لکھی جارہی ہیں جن میں کسی مذہبی' اخلاقی یا روحانی نکتے کو مریدوں اور طالبوں کی ہدایت کے لیے بیان کیا جاتا ہے۔ یہ نظمیں بنیادی طور پر گیتوں کی شکل میں ہیں۔

بہمنی دور کے نظم نگاروں میں سب سے پہلا نام جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کا ہے۔ خواجہ صاحب حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے خلیفہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کے شاگرد رشید اور خلیفہ تھے۔ 1399ء میں گلبرگہ آئے اور اسی سرزمین کا حصہ بن گئے۔ خواجہ صاحب یہاں اپنی تعلیمات سے روشنی پھیلاتے رہے۔ مقامی لوگوں سے سابقہ تھا اس لیے مقامی زبان ہی میں رشد و ہدایت کرتے اور تصنیف و تالیف کا کام بھی انجام دیتے رہے۔ آپ سے منسوب چند چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں' جن میں شکار نامہ اور چکی نامہ خاص طور پر مقبول ہوئیں۔ شکار نامے میں ذات خداوندی تک پہنچنے کے گُر تمثیلی انداز میں بتلائے ہیں۔ یہ خالص تصوف کی کتاب ہے جس میں شکار کی اصطلاحیں اور الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔ چکی نامہ میں سلوک و معرفت کے رموز بیان کیے گئے ہیں ایک شعر ہے:

آٹا پیسو' پورنیا بھرو' بہشتی میوہ شکر' دھرو
ساتوں صفاتاں کا پورن بھروگے ماں بسم اللہ اللہ

چکی نامہ میں عورتوں کو مذہبی تعلیم دی گئی ہے۔ مقامی رسم و روایات کے پس منظر میں عرفان کی باتیں بتائی گئی ہیں۔ چکی نامہ خواتین کی تعلیم اور مذہبی رجحان کو فروغ دینے کے لیے لکھا گیا ہے۔

میراں جی شمس العشاق بہمنی دور کے ایک بہت بڑے صوفی شاعر تھے ۔ شمس العشاق کی نظموں میں خوش نامہ اور خوش نغز اور مغز مرغوب بڑی اہم نظمیں ہیں ۔ خوش نامہ ایک طویل نظم ہے جس میں خوش نامی کی ایک نیک سیرت لڑکی کو موضوع سخن بنایا گیا ہے ۔ اسی کے نام پر نظم کو خوش نامہ سے موسوم کیا گیا ہے ۔ خوش بڑی بھولی بھالی نیک سیرت لڑکی ہے ۔ اسے بناؤ سنگھار سے نفرت ہے ۔ وہ ہمہ وقت عبادت میں محو رہتی ہے ۔ وہ سترہ سال کی عمر میں اللہ کو پیاری ہوجاتی ہے ۔ میراں جی اس کی بے وقت موت سے اخلاقی نتائج اخذ کرتے ہیں ۔ اس نظم میں بڑی سادگی اور سلاست ہے ۔ خوش نغز 72 اشعار پر مشتمل نظم ہے ۔ یہ نظم سوال و جواب کے پیرائے میں ہے ۔ خوش سوال کرتی ہے' میراں جی جواب دیتے ہیں ۔ مغز مرغوب ایک مختصر سی نظم ہے ۔ اس میں 23 اشعار ہیں اس میں بھی تصوف کے مسائل پیش کیے گئے ہیں ۔

بہمنی دور کے ایک اور مشہور شاعر اشرف بیابانی ہیں ۔ اشرف بیابانی کی تین تصانیف کا پتہ چلتا ہے (1) نوسرہار (2) لازم المبتدی اور (3) واحد باری ۔ دوسری اور تیسری تصانیف یعنی لازم المبتدی اور واحد باری اشرف کی نظمیں ہیں ۔ لازم المبتدی ایک مختصر سی نظم ہے جس میں مذہبی مسائل کا بیان ہے ۔ واحد باری ایک منظوم لُغت ہے جو امیر خسرو کی منظوم لُغت خالق باری کے انداز میں لکھی گئی ہے ۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. شکار نامہ اور چکی نامہ کس کی نظمیں ہیں ؟ اس کے موضوعات کیا ہیں ؟
2. حضرت میراں جی شمس العشاق کی نظموں کے نام بتایئے ۔
3. اشرف کی نظم واحد باری کا موضوع کیا ہے ؟

15.5 عادل شاہی عہد میں نظم نگاری

عادل شاہی عہد تقریباً دو صدیوں پر محیط ہے ۔ اس سلطنت کے تمام بادشاہ علم دوست' شاعروں اور ادیبوں کے سرپرست تھے ۔ ان میں سے دو تین بادشاہ خود بھی بڑے شاعر گزرے ہیں ۔ مثلاً عادل شاہی حکومت کا پانچواں بادشاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی نہ صرف عالموں' شاعروں اور اہل کمال کا قدر داں تھا بلکہ خود بھی صاحب علم وفن تھا ۔ شاعری اور موسیقی میں کمال رکھتا تھا ۔ اس وجہ سے لوگ اس کو ''جگت گرو'' کہتے تھے ۔ اس کی کتاب نورس میں کچھ نظمیں ہیں جسے وہ گیت کہتا ہے لیکن یہ گیتوں کے وزن پر نہیں ہیں ۔ ان کا انداز سراسر نظموں کا سا ہے ۔ ایک گیت میں اس نے اپنی بیوی چاند سلطانہ کے حسن و جمال و عقل کی تعریف کی ۔ ایک گیت میں اپنے محبوب ہاتھی آتش خاں کی تعریف کی ہے ۔ کئی گیتوں میں خدیجہ سلطان بڑی صاحبہ کا ذکر ہے ۔ ایسے بھی کئی گیت ہیں جن میں راگ راگنیوں اور دیوی دیوتاؤں کے مرقعے کھینچے ہیں ۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کا پوتا علی عادل شاہ ثانی بھی اپنے دادا کی طرح علم دوست بادشاہ تھا ۔ خود بھی شاعر تھا ۔ شاہی تخلص کرتا تھا ۔ اس کے کلیات میں بھی گیت نما نظمیں ملتی ہیں ۔

میراں جی شمس العشاق کے فرزند شاہ برہان الدین جانم' ''جگت گرو'' کے عہد کے ممتاز صوفی' عالم اور شاعر تھے ۔ انہوں نے اپنے والد کی روایات کو قائم رکھتے ہوئے تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا ۔ مذہبی تعلیمات کو اپنے مریدوں اور معتقدوں کو ذہن نشین کرانے کے لیے کئی نظمیں لکھیں ۔ حجت البقا' وصیت الہادی اور بشارت الذکر اور ارشاد نامہ آپ کی اہم نظمیں ہیں ۔ ان نظموں میں تصوف کے مسائل نظم کیے گئے ہیں ۔ جانم کے مرید شیخ غلام محمد داول نے کئی نظمیں لکھیں چہار شہادت' کشف الانوار اور کشف الوجود میں تصوف کے مسائل پیش کیے گئے ہیں ۔ ''ناری نامہ'' داول کی ایک طویل نظم ہے ۔ اس میں نیک اور پتی ورتا عورتوں اور خراب عورتوں کا بیان ہے ۔ یہ نظم مربع ترجیع بند کی ہیئت میں لکھی گئی ہے ۔ عورتوں کو ان کے فرائض کا احساس دلایا گیا ہے ۔ عورتوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ شوہروں کو آسودگی بہم پہنچائیں' وفا شعار رہیں' وہ ایسے کام کریں جن سے شوہر خوش ہوں ۔ اس نظم میں بات چیت کا سا لہجہ ہے اور ایک ایسا گمبھیر پن اور لوچ ہے کہ نظم دل پر اثر کرتی

ہے۔اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں :

اندلا اگر مجذوب ہے　　صورت طبع نا خوب ہے
جیسا اچھو محبوب ہے　　پیو باج کوئی پیارا نہیں
تج تے خلل نا آن دے　　پیو باج منگتا جان دے
ہر حال پیو سک پان دے　　پیو باج کوئی پیارا نہیں

اس زمانے میں ایک سے زیادہ بیویوں کا عام رواج تھا۔ بیویوں میں آپس میں ''سوکن پن'' بھی عام تھا عورتوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ

مل سوکناں میں یوں رہنا　　کچہ نہ دسے سوکن پنا
نہ دیکھ پرایا آپنا　　پیو باج کوئی پیارا نہیں
رغبت پیا کا فام کر　　بھاتا اسے سو کام کر
جگ میں توں اپنا نام کر　　پیو باج کوئی پیارا نہیں

رموز السالکین ایک طویل مذہبی نوعیت کی نظم ہے۔ ''گفتار امین اعلیٰ'' کا موضوع توحید ہے۔اس میں وحدت الشہود کے مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ نظم ہندوی بحر میں ہے۔ ہندی بحر کے باوجود عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال بھی خوبی سے کیا گیا ہے۔اس نظم کے دو شعر دیکھیے جس میں ہندی عربی اور فارسی کا کتنا خوبصورت سنجوگ ملتا ہے:

جیو جوالا اس کا جان　　سب سوں بن شب عین عیان
عین ارادت جس کے ہات　　جیو جوالا سب سنگات
جگ میں توں اپنا نام کر　　پیو باج کوئی پیارا نہیں

یہ نظم ترجیع بند کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ پیو باج کوئی پیارا نہیں' اس نظم کا ٹیپ کا مصرع ہے۔ شاہ امین الدین اعلیٰ دکن کے ایک اہم صوفی بزرگ ہیں' شاہ برہان الدین جانم کے صاحبزادے ہیں۔انہوں نے اپنے خاندان کی روایات کو آگے بڑھایا۔ ان کی نظموں کا موضوع تصوف ہے۔محبّ نامہ' رموز السالکین' گفتار امین اعلیٰ' اور وجود یہ ان کی نظمیں ہیں۔انہوں نے محبّ نامہ میں معشوق کا سراپا پیش کیا ہے۔ یہ ایک عاشقانہ نظم ہے اس میں صرف ردیف کی پابندی ہے' قافیہ ترک کردیا ہے۔نصرتی کے یہاں دو نظمیں مخمس کی ہیئت میں ملتی ہیں۔ایک میں محبوب کی دلربائی کو سراہا ہے۔ دوسری میں عشق کے کھیل کو موضوع بنایا ہے۔

ہاشمی ایک ریختی گو کی حیثیت سے امتیاز رکھتا ہے اس کا ایک مخمس ملتا ہے' جس میں 38 بند ہیں۔اس میں حمد' نعت' مدح آل رسول' مدح آل علی' مدح مہدی جونپوری' نیز مہدی موعود کے پانچ صادقوں کی مدح کی گئی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. جوش نامہ کا موضوع کیا ہے؟
2. ناری نامہ کس ہیئت میں ہے؟
3. شاہ امین الدین علی اعلیٰ کس کے بیٹے ہیں۔ان کی نظموں کے نام لکھیے؟
4. جگت گرو کس بادشاہ کو کہا جاتا تھا؟

15.6 قطب شاہی عہد میں نظم نگاری

قطب شاہی عہد کے نظم نگاروں میں سب سے اہم نام محمد قلی قطب شاہ کا ہے ۔ اس کی نظمیں اپنے موضوعات کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں ۔ وہ عوامی زندگی کا بہترین نمائندہ شاعر ہے ۔ اس نے بیشتر ایسے موضوعات کو اپنی نظموں کا عنوان بنایا ہے جو عرصے تک اردو شاعری کا موضوع نہ بن سکے ۔ اس کی نظموں میں بڑا تنوع ہے ۔ اس کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے جہاں اس نے اپنی پیاریوں کے حسن و جمال کا ذکر کیا ہے وہیں اپنے عہد کی سماجی زندگی اور اس کے رسوم و رواج کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے ۔ اس کی نظموں میں باغ اور محلات کا تذکرہ بھی موجود ہے اور مختلف کھیلوں، تہواروں اور عیدوں کا بھی ۔ جہاں اس نے برسات کے موسم پر بہت سی نظمیں کہیں وہیں اس نے موسم سرما کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اس نے اپنے دور حکومت میں کئی تقریبات ایسی مقرر کردی تھیں جو بڑے تزک و احتشام سے منائی جاتی تھیں، جن میں تمام مذاہب کے لوگ شریک ہوتے تھے ۔ یہ تقریبیں حسب ذیل ہیں :

(1) محرم (2) عید میلادالنبیؐ (3) عید بعثت نبیؐ (4) عید سوری (5) عید مولود علی

(6) عید غدیر (7) شب برات (8) عید رمضان (9) بقرعید (10) نوروز

(11) بسنت (12) سالگرہ بادشاہ (13) شب معراج (14) مرگ سال (آغاز برسات)

ان میں چار تقریبیں ایسی تھیں جو بین قومی سمجھی جاتیں اور جن میں ہندو اور مسلمان سب شریک ہوتے تھے یعنی

(1) سالگرہ بادشاہ (2) آمد برسات (3) نوروز (4) محرم

ان تمام تقریبات پر اس کی نظمیں ملتی ہیں ۔ ان کے مطالعے سے اس عہد کی سماجی اور تہذیبی زندگی کا واضح نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

محمد قلی نے یوں تو کئی محلات تعمیر کروائے تھے جن میں چار محلات کا ذکر اس کے کلیات میں موجود ہے ۔ جن چار محلات پر اس کی نظمیں ملتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں :

(1) خداداد محل (2) اعلیٰ محل (3) محل کوہ طور اور (4) قطب مندر

اس نے ''خداداد محل'' میں اس کی آرائش اور بلندی کا تذکرہ کیا ہے ۔ محل کوہ طور ایک طویل نظم ہے اس میں محل کے کنگوروں کی بلندی اور محل کے اطراف جو پر رونق میدان تھا اس کی بڑی تعریف کی ہے ۔ ''باغ محمد شاہی'' پر اس نے جو نظم کہی ہے، اس میں منظر نگاری کا حق ادا کردیا ہے۔ اس نے باغ کی واضح اور روشن تصویر پیش کی ہے ۔ اس نے واضح الفاظ میں چپے کی کلی، انگوروں کے خوشوں، انار، کھجور، سپاریوں کے خوشوں ناریل اور جامن کے پھولوں کا ذکر کیا ہے ۔

قلی حسن کا پرستار تھا وہ دوشیزاؤں کے حسن و جمال پر فریفتہ تھا۔ ان کی اداؤں پر جاں چھڑکتا تھا ۔ اس کی زندگی دادعیش دیتے گذری۔ اس کے محل میں حسینوں کا جمگھٹا رہتا تھا ۔ اس نے اپنی نظموں میں اپنی پیاریوں کا سراپا بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ یہ نظمیں بڑی ہی دلکش ہیں۔ ہر ''پیاری'' اپنی خوبیوں میں منفرد ہے ۔ جن پیاریوں کے نام اس کے کلیات میں ملتے ہیں وہ یہ ہیں (1) سانولی (2) ننھی (3) کونلی (4) پیاری (5) گوری (6) چھیلی (7) لالہ (8) لالن (9) موہن (10) محبوب (11) بلقیس (12) حاتم (13) ہندی چھوری (14) پدمنی (15) سندر (16) سجن (17) رنگیلی (18) مشتری ۔

قلی نے اپنی نظموں میں اپنی پیاریوں کے حسن و جمال ہی کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی عشق بازی کا بیان بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ کیا ہے ۔ بارہ پیاریاں اس کی منظور نظر تھیں ۔ اس کی نظم ''خدا داد محل'' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی محل میں اس کی بارہ پیاریاں بھی رہتی تھیں۔ وہ کہتا ہے قلی میں حسن پرستی اور مذہب پرستی کا عجیب و غریب امتزاج ملتا ہے ۔ وہ ہر عیش کو مذہب سے جوڑ دیتا ہے مثلاً بارہ

اماموں کی مناسبت سے وہ بارہ پیاریاں بھی رکھتا ہے اور کہتا ہے :

نبی صدقے بارا اماماں کرم تھے　　کرو عیش جم بارہ پیاریوں سوں پیارے

ان نظموں میں محبت اور شاہد پرستی کے واقعات کی سچی تصویریں ملتی ہیں ۔ ذاتی واقعات اور مشاہدات کو شعر کے پردے میں ڈھال دیا ہے ۔ یہ نظمیں اس کے عشق کا صحیفہ بھی ہیں، تفسیر بھی ۔ ان میں نشاط ہی نشاط، شادمانی ہی شادمانی ہے ۔ سرخوشی اور سرشاری ہے ۔

میری سانولی من کی پیاری دِسے　　کہ رنگ روپ میں کونلی ناری دِسے
سُہے سب سہیلیاں میں بالی عجب　　سر و قد ناری او تاری دِسے
سکیاں میں ڈولے نیہہ بازی سوں جب　　او مکھ جوت تھے چند کی خواری دِسے
توں سب میں اتم ناری تج سم نہیں　　کوئل تیری بولاں سے ہاری دِسے
تیری چال نیکی سب ہی من کو بھاے　　سکیاں میں توں جوں پھل بہاری دِسے
بہوت رنگ سوں آپ رنگیاں کیاں　　ولے کاں ترے رنگ کی ناری دِسے
نبی صدقے قطبا پیاری سدا　　سہیلیاں میں زیبا تماری دِسے

سانولی پر قلی کی تین نظمیں ملتی ہیں جن میں ایک نظم پیش کی گئی ہے ۔ اس نظم میں محمد قلی کہتا ہے کہ :

''میری سانولی من کی پیاری نظر آتی ہے ۔ وہ ایک کم عمر حسینہ ہے ۔ سب سہیلیوں میں اس کا اونچا قد بڑا بھلا لگتا ہے ۔ اس کے قد کی بلندی پر سرو کو نثار کرنے جی چاہتا ہے ۔ جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ عشق کا کھیل کھیلنے میں مصروف ہوتی ہے تو اس کے چہرے کی روشنی کے آگے چاند بھی شرمندہ نظر آتا ہے ۔ وہ عورتوں میں سب سے اچھی ہے جس کا کوئی مقابل نہیں ۔ اس کا گلا بہت سریلا ہے ۔ کوئل بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی ۔ اس کی اچھی چال سب کے دلوں کو لبھاتی ہے ۔ وہ اپنی سکھیوں میں بہار کے پھول کی طرح شاداب ہے ۔ اس کی سہیلیاں لاکھ خود کو سنواریں سجائیں لیکن سانولی کے رنگ کی بات اور ہی ہے کوئی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی''۔

پیاریوں پر قلی کی نظمیں اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ پیاری اپنی مخصوص اور منفرد خوبیوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آتی ہے ۔ ننھی کمسن ہے ہنس مکھ ہے تو سانولی سلونے روپ کا اوتار ہے ۔ خوش رفتار ہے اس کا گلا کوئل کا سا ہے ۔

کنولی کی کمر باریک ہے، سرو قد ہے، دبلی پتلی ہے تو ''پیاری'' کی آنکھیں مدبھری ہیں، اس کی چوٹی زہریلے ناگ کی طرح ہے ۔

چھبیلی کے رخسار پر تل ہے ۔ اس کی ہر ادا قاتل ہے تو گوری چندر مکھی ہے رسیلی ہے، سجیلی ہے ۔ رنگ رس کے باغ کی کلی ہے اس کے ہونٹ رسیلے اور مدبھرے ہیں ۔ قلی نے اپنی نظموں میں ہر پیاری کی خوبیوں کی بڑی خوبصورتی کے ساتھ مرقع کشی کی ہے ۔

''جلوہ'' کے موضوع پر قلی کی چھ نظمیں ملتی ہیں جن کے مطالعے سے اس کے عہد کی دلہنوں کے بناؤ سنگھار اور جلوے کے رسم کی تفصیلات کا اندازہ ہوتا ہے ۔ جلوے کے وقت چوکیوں کو چاروں طرف سے موتیوں سے آراستہ کیا جاتا تھا ۔ مشاطائیں دلہن کے ہاتھوں اور پاؤں کو مہندی لگاتی تھیں ۔ کندنی کلیوں کے ہار گوندھے جاتے تھے ۔ تمام عورتوں کو اس تقریب میں موتیوں کے کناروں کی ساڑھیاں بندھوائی جاتی تھیں ۔ سات سہاگنیں مل کر دلہن کے بالوں میں تیل لگاتیں، کنگھی کرتیں، چوٹی گوندھتیں، مانگ میں موتی پروتیں ۔ آنکھوں میں کاجل اور

سرمے کے خط کھینچے جاتے ۔ پیشانی پر ٹیکا لگایا جاتا ۔غرض بہت سجا سنوار کر ساتوں سہاگنیں دلہن کو تخت پر لاکر بٹھاتیں ۔ اس کے بعد سر پر سہرا اور گلے میں پھولوں کے ہار پہناتیں' دلہن کو آنچل اڑھایا جاتا' دولہا' دلہن کو شربت پلایا جاتا ۔ دونوں ایک دوسرے کو پان کے بیڑے کھلاتے ۔ جلوے پر اس کی نظم کے چند شعر دیکھیے ۔

پریم پیاری کا جلوہ گاؤ سارے　　اسے چند سور سوں پریاں سنگارے
سہاگاں بھاگ پھل مستک کھلے ہیں　　سہیلیاں آرتی تارے نوارے
اچاؤ تخت جلوے کا خوشی سوں　　کہ چوندھیر چوک موتیاں سوں سنوارے
چڑاؤ تیل اب ساتو سہاگاں　　مشاطہ ہو کے زہرہ ہت نگارے
پلا شربت دیوو ہاتاں میں بیڑے　　بندا دو ساڑیاں موتیاں کنارے

کھیلوں میں ''چوگان'' ''کھمڈی'' ''کولانٹ'' اور ''پھوگڑی پھو'' پر قلی کی نظمیں ملتی ہیں ۔اس نے اپنے ہاتھی پر بھی ایک نظم کہی جس میں ہاتھی کے ڈیل ڈول ۔اس کی ہوشیاری' اس کی طاقت اور اس کی فتح مندی کا بڑی خوش اسلوبی سے ذکر کیا ہے ۔

قلی نے عیدوں کے ساتھ ساتھ تہواروں کو رواج دے کر یہ ثابت کردیا ہے کہ ہندو اور مسلم دونوں کا وہ بادشاہ ہے اور دونوں ہی اسے عزیز ہیں ۔معمولی تقاریب کو اس پیمانے پر مناتا ہے کہ وہ تقریبیں سماجی زندگی کا جزو بن جاتیں ہیں ۔ان تقاریب میں طرح طرح کی رسمیں ادا کی جاتیں' ضیافتوں کا اہتمام ہوتا ۔ان تقاریب میں ہندوستانی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے ۔عید الفطر یا عید رمضان پر قلی کی گیارہ نظمیں ملتی ہیں ۔ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شوال کا چاند نظر آتے ہی ہر طرف عیش وعشرت کے شادیانے بجنے لگتے ۔شیر خرما اور سویّوں سے دوست احباب کی تواضع کی جاتی ۔عید کے دن دمے اور طبل بجائے جاتے ۔عیدالفطر کو وہ سیوی کی عید کہتا ہے ۔

عید سیوی لیائیا خوشیاں آنند
اس آنند سو کریں خوباں آنند

ایک جگہ وہ شیرخرما کا ذکر کرتا ہے

تج خندہ کا شکر دے منجے شیرخرمے میں
شربت پلا ادھر ستے کھلیا گلال عید

دمامے اور طبل کا بیان :

عیدی کے دمامے طبلاں بجتے جگت میں
پٹخن گھنگھرو نار کے گرجن سو انبر ہے

اس کی نظموں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عید کے دن شراب کے دور بھی چلتے تھے ۔

عید الضحیٰ یا بقرعید قطب شاہی عہد میں بڑی شان سے منائی جاتی ۔' عیدی تقسیم ہوتی ' قلی اس موقع پر مجلس آرائی کرتا ۔ پھولوں اور خوشبوؤں سے اس کی محفل پُر رونق بن جاتی ۔ضیافت کا اہتمام کیا جاتا ۔ دستر خواں پر نعمتیں چنوادی جاتی تھیں ۔ اس موضوع پر قلی کی نو نظمیں ملتی ہیں ۔ یہاں اس کی نظموں کے چند شعر درج کیے جارہے ہیں' جن میں پُرتکلف ضیافتوں اور عیدی (جس کا دکن میں آج بھی رواج ہے) کی طرف اشارہ ہے اور خوشیوں اور رنگ رلیوں کی طرف بھی :

خبر بکرید خوشیاں ستیں میرے تائیں لیا یا ہے
خوشیاں اوپر تھے قربانی ہونے بکرید آیا ہے

گلابی پھول منج مجلس تھے رنگ پاکر سہاتے ہیں
کہ ساقی اپ نین پیالے سوں مدد لے منج رجھایا ہے

.....

جنت میں کے سوں الواں نعمتاں سوں کیا تازہ جگت کا جان بکرید
ہوا بھرپور جگ کا نین ہور من۔ بچھایا ہر طرف یوں خوان بکرید

.....

خدا تج کو دیا عیدی یو ہندستاں سالم کوں تو دن پر دن' قیامت لک ملک تیرا اباداں ہے
یو عید قربانی اپے قرباں ہوئی سہیلیاں اپر تو اس سبب اس عید کو سب جگ ایتاماں ہے

.....

یا موہنیاں سنگار کر پھرتیاں لٹکتیاں دھرت پر یا کھن اپر تارے سہیں یا کھیلیاں بستاں ہے
کوئی گاتی کوئی آلاپتی کوئی ہنستی کوئی ناچتی کوئی پیتی کوئی پلاتی کوئی سرخش کوئی مستاں ہے

15.6.1 عید میلادالنبیؐ

محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں عید میلادالنبیؐ بڑے شاندار پیمانے پر منائی جاتی تھی۔ عید کا جشن خداداد محل کے میدان میں منایا جاتا تھا جس کے تینوں طرف جواہر و نفائس کی دکانیں تھیں۔ آس پاس کی عمارتوں کو سنوارا جاتا تھا۔ اس موضوع پر قلی کی چھ نظمیں ملتی ہیں۔ ایک نظم میں وہ کہتا ہے کہ جب قطب شاہ عید مولودِ نبیؐ مناتا ہے تو تمام زمین جنت کی طرح سجائی جاتی ہے۔ بازار' قصر' محل سب سجائے جاتے ہیں۔ جب بادشاہ چتر کے نیچے بیٹھتا ہے تو راستے کے دونوں طرف ہندو راجا ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر دربار عام بھی کیا جاتا تھا۔

گنائے نبیؐ کے جو مولود انداں ہمایوں محمد قطب شہ تر کماں
سنوارے جگت سب جنت جوں چرت سوں نگارے سو بازار قصراں ' محلاں
تخت پر جو شہ بیس راتے جگت سب دیکھت چتر سرمائی شہ کا جوں اساں

ایک جگہ وہ میزبانی کا ذکر کرتا ہے :

نبیؐ صدقے گنایا ہے ترکماں آج میزوانی
علی صدقے سے دو جگ میں بلند اس کے ستارے ہیں

عید بعثت نبیؐ' عید میلاد علی' عید غدیر پر اس نے کئی نظمیں کہی ہیں۔ شب برات پر اس کی دس نظمیں ملتی ہیں۔ قلی کے عہد میں شب برات بڑی دھوم سے منائی جاتی تھی۔ آتش بازی اور روشنی کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ قلی چراغوں' آتش بازیوں' شاہانہ رنگ رلیوں میں محو ہو جاتا تھا۔ ایک نظم میں اس نے آتش بازی کی مختلف اصطلاحوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں اکثر آج بھی رائج ہیں جیسے ہوائیاں' گھڑیاں' بازیاں' گلریزاں وغیرہ۔

ہوا یاں سو کے بنگڑیاں چکراں جوں　　گھڑیاں بازیاں سو اب جوبن کری رے
نین مستی کے گلریزاں سو بھر کر　　نلی طاوس چک چومن کری رے
پھلی ناسک جھمکنے تھے ہے شب رات　　دھرت کوں آج نس جوں گھن کری رے

بسنت پر قلی کی سات نظمیں ملتی ہیں ۔کئی نظموں میں اپنی سکھیوں کے ساتھ بسنت کھیلنے' حوضوں کو پھولوں سے بھر دینے اور شاہانہ مجلس آرائی کا بیان ہے ۔ اپنی پیاریوں کی سج دھج اور محلات کی چہل پہل کا ذکر بڑی عمدگی سے کیا ہے ۔ اس تہوار کو موسم بہار کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔قلی اس تہوار کا دلی خیر مقدم کرتا ہے ۔ اس تہوار کو اس نے ایک قومی تہوار بنادیا تھا ۔ یہ تہوار اس کے لیے پیام عیش لاتا تھا ۔

بسنت کھیلیں عشق کا آپیارا　　تمہیں ہو چاند میں ہوں جوں ستارا
پیاری کے مکھ میانے کھیلیا بسنت　　پھولاں حوض تھے چڑ کے چھڑکیا بسنت

15.6.2　مرگ یا آمد برسات

مرگ کو اس نے ایک قومی تہوار بنادیا تھا ۔موسم گرما کی بے کیفی کے بعد قطرہ باراں بے کیف زندگی میں مسرت کی لہر دوڑا دیتا ہے ۔ مرگ یا برسات کا موسم شروع ہوتا ہے تو وہ بڑی دھوم دھام سے محفل نشاط آراستہ کرتا ہے۔ شراب کے دور چلتے' مطربان خوش گلو رقص و سرور کے کمال دکھاتے تھے ۔ باغوں میں جھولے ڈالے جاتے ۔ اس موضوع پر کہی گئی نظموں میں اس نے اپنی پیاریوں کے سنگار کے ملبوسات کا ذکر کیا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے اس موسم کے شروع ہوتے ہی محلات میں زمرد کے رنگ کی مسندیں بچھا دی جاتیں' پھول اور پان تقسیم کیے جاتے اور قلی اپنی سکھیوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ۔

سہیلیاں مرگ سال آیا ہوا سوں　　گرجنا اس کا سہتا ہے ادا سوں

قلی کی نظموں میں اس کے فطری جذبات کا عکس ہے' کہیں بھی تصنع کا شائبہ نہیں ہے ۔ ان نظموں کی اہمیت اس اعتبار سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان میں ہندوستانی زندگی کی جھلکیوں کے مختلف روپ نظر آتے ہیں ۔ اس نے ان نظموں میں اپنے عہد کی تہذیبی اور سماجی زندگی کو محفوظ کردیا ہے ۔

قطب شاہی عہد میں دکن میں مثنوی کو زیادہ فروغ نصیب ہوا ۔ مختلف موضوعات پر شعرا نے مثنویاں کہیں ۔ ان مثنویوں میں ایسے ٹکڑے بھی مل جاتے ہیں جن پر موضوع کے اعتبار سے نظم کا اطلاق ہوسکتا ہے ۔ قلی کی نظم گوئی پر اظہار کرتے ہوئے سید احتشام حسین لکھتے ہیں کہ قطب مشتری میں کئی حصے ایسے ہیں جنہیں الگ کرکے نظم کا عنوان دیا جاسکتا ہے جیسے ''در شرح شعر گوید'' یا باغ کا جو منظر پیش کیا ہے' وہ مستقل نظم معلوم ہوتی ہے ۔

قطب شاہی عہد کا ایک قدیم شاعر جس نے محمد قلی اور وجہی سے قبل نام کمایا وہ فیروز بیدری ہے ۔ اس کی ایک طویل نظم جو 121 اشعار پر مشتمل ہے ''پرت نامہ'' ہے ۔ یہ ایک مدحیہ نظم ہے جس میں فیروز' حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح کرتا ہے ۔ اپنے مرشد شیخ ابراہیم مخدوم جی کی مدح میں اشعار کہے ہیں ۔ یہ نظم عقیدت میں ڈوبی ہوئی نہایت سلیس و سادہ انداز میں لکھی گئی ہے ۔ چند شعر پیش ہیں جن سے نظم کی سلاست کا اندازہ ہوسکتا ہے ۔

بڑا پیر مخدوم جی جگ منے　　منگیں نعمتاں معتقد اس کنے
تو سلطان جگ کا وجگ میں فقیر　　کہ سب بادشاہاں کوں توں دستگیر
محبت کے دریا کا غواص توں　　کہ سب موتیاں میں رتن خاص توں

غواصی عبداللہ قطب شاہ کے عہد کا نامور شاعر ہے ۔ اس نے مثنویوں کے علاوہ نظمیں بھی لکھی ہیں ۔ اس کی چند نظمیں مذہبی عقیدت میں لکھی گئی ہیں ۔ ایک نظم ملکہ حیات بخشی بیگم کی تعریف میں ہے ۔ شب برات اور بقرعید کے موقعے پر بھی اس نے کچھ نظمیں لکھیں ۔ بعض نظمیں قدرتی مناظر پر ہیں جیسے سرما' سیر چاندنی' اور ایک نظم دنیا کی بے ثباتی پر ''بے وفا دنیا'' کے نام سے ہے ۔ یہ نظمیں غزل کے فارم میں ہیں ۔ سرما' سیر چاندنی' بقرعید جیسی نظموں میں شوخی و لذت کوشی ہے ۔ غواصی کی یہ نظمیں بڑی جاندار اور دل پذیر ہیں ۔

عبداللہ قطب شاہ ہی کے دور کا ایک اور شاعر قطبی ہے جس نے ''مینا نامہ'' اور ''چڑیا نامہ'' دو نظمیں لکھیں' یہ نظمیں صوفیانہ خیالات پر مبنی ہیں ۔

اسی دور کا ایک اور شاعر عبدالطیف ہے جس نے ''وفات نامہ'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں آنحضرت ﷺ کی وفات کا حال قلمبند کیا ہے ۔ معظم بھی اسی دور کا شاعر ہے جس نے معراج نامہ کے علاوہ ایک نظم قلندر نامہ بھی لکھی ہے ۔ نظم قلندر نامہ تصوف کے ایک موضوع' ایک طرز فکر' قلندری پر لکھی گئی ہے ۔ معظم' امین الدین علی اعلیٰ کا مرید تھا ۔

بہمنی' عادل شاہی اور قطب شاہی دور کے نظم نگاروں نے اس صنف کو اپنے قصائد اور مثنویوں میں بھی استعمال کیا ہے ۔ بہمنی اور عادل شاہی دور میں زیادہ تر مذہبی نظمیں ہی ملتی ہیں جب کہ قطب شاہی عہد میں نظموں کے موضوعات میں تنوع اور ہمہ گیری ہے ۔ اس لحاظ سے محمد قلی قطب شاہ وہ پہلا شاعر ہے جس نے اردو شاعری کو باضابطہ نظم نگاری سے روشناس کروایا اور ایک بڑا ذخیرہ فراہم کیا ہے ۔ اسی عہد میں دکنی نظم کو فروغ حاصل ہوا ۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. محمد قلی قطب شاہ کی نظموں کے موضوعات کیا ہیں ؟
2. محمد قلی کی نظموں کی اہم خوبی کیا ہے ؟
3. غواصی کی نظموں کے موضوعات لکھیے ۔
4. کس دکنی عہد میں نظم نگاری کو فروغ حاصل ہوا ؟

15.7 خلاصہ

1350 ء میں بہمنی سلطنت قائم ہوئی اور 1525 ء میں اس کا خاتمہ ہوا ۔ 1490 ء میں عادل شاہی اور 1518 ء میں قطب شاہی حکومت قائم ہوئی ۔ ان سلطنتوں نے دکنی زبان و ادب کی ترقی میں اہم حصہ ادا کیا ہے ۔ ان حکومتوں کے اکثر بادشاہ خود بھی شاعر تھے ۔ ان کے عہد میں اور ان حکمرانوں کے دربار سے وابستہ شاعروں نے شعر و ادب میں کئی زرین کارنامے چھوڑے ہیں ۔ نظم نگاری کے ابتدائی نقوش ہمیں بہمنی عہد میں ملتے ہیں ۔ عادل شاہی عہد کے شاعروں نے بھی نظم نگاری میں حصہ لیا لیکن ان کے موضوعات مذہبی نوعیت کے تھے ۔ محمد قلی قطب شاہ وہ پہلا دکنی شاعر ہے جس نے باضابطہ طور پر نظم کے میدان میں اہم حصہ ادا کیا ۔ متنوع اور متعدد موضوعات پر نظمیں لکھیں ۔ قطب شاہی عہد کے بعض شاعروں نے بھی محمد قلی قطب شاہ کی تقلید میں اچھی نظمیں لکھیں اس طرح اردو نظم نگاری میں بھی دکنی عہد کے شاعروں نے اہم حصہ ادا کیا ہے ۔

15.8 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تین تین سطروں میں دیجیے :

1. محمد قلی قطب شاہ کی نظم نگاری پر تبصرہ کیجیے ۔

2. عادل شاہی عہد میں اردو نظم نگاری پر روشنی ڈالیے۔
3. قطب شاہی عہد کی نظم نگاری پر تبصرہ کیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. بہمنی عہد میں نظم گوئی کا جائزہ لیجیے۔
2. قلی قطب شاہ کی نظموں کے تہذیبی پہلوؤں کو اجاگر کیجیے۔
3. غواصی کی نظم نگاری پر تبصرہ کیجیے۔

15.9 فرہنگ

بسیط	=	پھیلا ہوا	مبنی	=	جس پر کسی چیز کی بنیاد ہو
تخصیص	=	خصوصیت	مشتمل	=	شامل
مستقل	=	مستحکم	پوریناں	=	(دکنی) پوریاں
دھرو	=	(دکنی) ڈالو	جم	=	سدا، ہمیشہ
تے	=	سے	کونلی	=	نوخیز، کم عمر
آن دے	=	آنے دے	دیسے	=	دکھائی دے
فام کر	=	(فہم کر) سمجھ کر	سہے	=	زیب دے
اتم	=	اعلا	تھے	=	سے
سم	=	مانند	آباداں	=	آباد رہے
پھل بہاری	=	بہار کا پھل	دھرت پر	=	دھرتی پر
گھن پر	=	آسمان پر	دو رست	=	دو رستے، دونوں جانب
بیس	=	بیٹھے	بہوت	=	بہت
ساتو	=	ساتوں	دیو	=	دو
ادھر	=	ہونٹ	ستے	=	سے
ناد	=	طرح، مانند	الواں	=	ہمہ قسم کے
ہور	=	اور	لگ	=	تک

15.10 سفارش کردہ کتابیں

1. مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور — کلیات محمد قلی قطب شاہ
2. ڈاکٹر جمیل جالبی — تاریخ ادب اردو، جلد اول
3. ڈاکٹر زور — دکنی ادب کی تاریخ
4. مولوی عبدالحق — اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ

اکائی : 16 شمالی ہند میں نظم نگاری

ساخت

16.1 تمہید
16.2 شمالی ہند میں اردو نظم کے اولین نقوش
16.3 سودا اور میر کا دور
16.4 انجمن پنجاب کا مشاعرہ اور اردو نظم کی تحریک
16.5 علی گڑھ تحریک اور اردو نظم
16.6 علی گڑھ تحریک کے اثرات کا تسلسل اور اردو نظم
16.7 خلاصہ
16.8 نمونہ امتحانی سوالات
16.9 فرہنگ
16.10 سفارش کردہ کتابیں

16.1 تمہید

غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ اردو شاعری کی چار اہم اصناف سمجھی جاتی ہیں لیکن ان میں غزل کے سوا باقی دیگر اصناف کا چلن ختم ہو چکا ہے۔ موجودہ زمانے میں صنف نظم کو ارتقا اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ دور حاضر میں غزل کے شانہ بہ شانہ اگر کوئی صنف آگے بڑھ رہی ہے تو وہ نظم ہی ہے۔ اس اعتبار سے نظم کو جدید شاعری کی دوسری اہم صنف کہا جاسکتا ہے۔ اردو میں نظم نگاری کو شاعری کی ایک صنف کی حیثیت سے ترقی دینے کی شعوری کوشش کا آغاز انیسویں صدی کے ربع آخر میں ہوا لیکن دکنی شعرا کی نظموں کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں نظم گوئی کی تاریخ شاعری کے آغاز کی تاریخ سے جڑی ہوئی ہے۔ گجرات اور دکن کے بعد شمالی ہند میں اردو زبان کو تخلیق ادب کے وسیلے کے طور پر اور شعری اظہار کے لیے استعمال کیا گیا۔ آئندہ صفحات میں ہم شمالی ہند میں نظم نگاری کے آغاز و ارتقا کا مطالعہ کریں گے۔

16.2 شمالی ہند میں اردو نظم کے اولین نقوش

شمالی ہند میں اردو شاعری کا غلغلہ اٹھارویں صدی کے آغاز میں بلند ہوا لیکن سترھویں صدی کے دوران بھی کچھ ایسے سخنور تھے جنھوں نے اردو زبان میں شعری تخلیقات پیش کیں۔ شمالی ہند کے ان اولین شعرا میں افضل (مصنف بکٹ کہانی) شیخ محبوب عالم (مصنف مسائل ہندی) میر جعفر زٹلی، اسمٰعیل امروہوی (مصنف وفات نامہ بی بی فاطمہ۔ قصۂ معجزہ انار) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں نظم گوئی کے حوالے سے جعفر زٹلی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔

میر جعفر زٹلی اورنگ زیب کی تخت نشینی 1658ء کے آس پاس نارنول میں پیدا ہوا اور 1713ء میں فرخ سیر کے حکم سے اسے قتل کیا گیا۔ جعفر زٹلی ایک پھکڑ باز اور غیر سنجیدہ شاعر تھا۔ اس نے بکثرت ہجویں لکھی ہیں۔ اس کی شاعری میں فحش الفاظ اور مضامین کا بے باکانہ استعمال نظر آتا ہے۔ جنسیات اور مغلظات کے بغیر وہ شعر نہیں کہہ سکتا تھا حتیٰ کہ فقر و فنا جیسے موضوع پر اس نے جو نظمیں لکھی ہیں ان میں بھی مغلظات کا استعمال کیا ہے۔ لیکن اس سوقیت اور ابتذال کے باوجود جعفر کے کلام کی ادبی اور تہذیبی اہمیت ہے۔ شمالی ہند میں اردو نظم کے اولین نمونے اسی کے ہاں ملتے ہیں۔ اس سے قبل کے شعرا مثلاً افضل اور محبوب عالم کے ہاں طویل مثنویاں ملتی ہیں، مختصر نظمیں نہیں ملتیں۔ جعفر کے

کلیات میں مختصر نظمیں ہیں ۔جعفر کو بعض نقادوں نے اپنے عہد کا مورخ کہا ہے کیونکہ اس کی نظمیں اپنے دور کی عکاسی کرتی ہیں ۔جعفر زٹلی کا عہد' مغلیہ سلطنت کے زوال و انحطاط کا عہد تھا ۔ جانشینی کے لیے مغل شاہزادوں کی آپسی رسہ کشی اور خانہ جنگی کی وجہ سے ہر طرف طوائف الملوکی' بدنظمی اور معاشی بدحالی کا دور دورہ تھا ۔جعفر نے اپنے گرد و پیش کے حالات کو ایک ذہین فن کار کی نظر سے دیکھا اور زمانے کی ناہمواری اور اہل اقتدار کی نااہلی کو طنز و تمسخر اور ہجو کا نشانہ بنایا ۔ اس کا کلام اس دور کے تہذیبی انتشار' اخلاقی قدروں کے زوال اور معاشی بدحالی کی ترجمانی کرتا ہے ۔

جعفر زٹلی کی نظموں میں شہر آشوب کی سی کیفیت نظر آتی ہے ۔'' دستور العمل در اختلافِ زمانہ ناہنجار''، '' جنگ نامہ بہ وقت مردن عالمگیر'' اور فنا کے موضوع پر'' طوطی نامہ'' جعفر زٹلی کی اہم نظمیں ہیں جن میں تاریخی شعور اور سماجی معنویت ملتی ہے ۔ ہزل اور زٹل کے باوجود جعفر زٹلی کو شمالی ہند کا اولین نظم نگار شاعر ماننا پڑتا ہے ۔

شمالی ہند میں باقاعدہ اردو شاعری کا آغاز فرخ سیر (1713ء تا 1719ء) اور محمد شاہ (1719ء تا 1747ء) کے عہد سے ہوا ۔ اس دور میں متعدد شعرا نے فارسی گوئی ترک کر کے اپنی بول چال کی زبان یعنی اردو کو تہذیبی اور تخلیقی کاموں کے لیے استعمال کرنا شروع کیا ۔ اس عہد کے شعرا میں صدر الدین خاں فائز (م 1738ء) شاہ مبارک آبرو (م 1733ء) اور شاہ حاتم (1699 ۔ 1792ء) کے نام نظم نگاری کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں ۔ ان میں فائز کے بارے میں کافی تحقیقی مواد پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے دیوان فائز کے مقدمے میں جمع کیا ہے ۔ وہ فائز کو شمالی ہند کا پہلا صاحب دیوان شاعر مانتے ہیں ۔ فائز کے دیوان میں غزلیات کے علاوہ چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی پائی جاتی ہیں جو بیانیہ نہیں بلکہ توضیحی نوعیت کی حامل ہیں ۔ یہ مثنویاں ظاہری ساخت کے اعتبار سے مثنوی ہیں لیکن موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے نظم کے دائرے میں آتی ہیں ۔ فائز کی نظموں کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر مسعود حسن رضوی رقم طراز ہیں ۔

> '' فائز کے یہاں مسلسل نظمیں بھی ہیں اور مقدار میں غزلوں سے کہیں زیادہ ہیں ۔ان کے عنوان مختلف ہیں مثلاً تعریف پنگھٹ ۔ وصف بھینگون ۔ تعریف جوگن ۔ بیان میلہ بہتہ ۔ تعریف نہانِ نگمبود ..... یہ مسلسل نظمیں ثابت کرتی ہیں کہ جس طرح فائز ہماری موجودہ معلومات کی بنا پر دہلی کے پہلے اردو غزل گو قرار پاتے ہیں اسی طرح وہ دہلی کے پہلے اردو نظم گو بھی ٹھہرتے ہیں ۔''

اس بیان کا آخری حصہ درست نہیں ہے کیونکہ شمالی ہند کا پہلا اردو نظم گو جعفر زٹلی ہے ۔

فائز کے ہم عصر آبرو نے ایک مثنوی نما نظم لکھی جس میں انھوں نے ایک لڑکے کو درس آرائش دیا ہے ۔ یہ نظم اخلاقی گراوٹ اور جنسی ابتذال کی آئینہ دار ہے ۔ اسی عہد کے ایک اور شاعر شاکر ناجی (پیدائش 1692ء) نے اپنے دور کے سیاسی اختلال' اخلاقی زوال' حکمرانوں کی نااہلی اور امرا کی عیش کوشی پر ایک شہر آشوب لکھا تھا جو مکمل صورت میں دستیاب نہ ہو سکا ۔

اس دور کے ایک اہم سخنور شاہ ظہور الدین حاتم ہیں ۔ وہ ایک قادر الکلام غزل گو تھے ساتھ ہی انہوں نے نظم نگاری میں بھی اپنے کمال فن کا ثبوت دیا ۔ ڈاکٹر زور'' سرگزشت حاتم'' میں لکھتے ہیں :

> '' حاتم کو ایک نظم گو شاعر کی حیثیت سے بھی اہمیت حاصل ہے ۔ سودا سے قبل شمالی ہند کے جس شاعر کے کلام میں مسلسل نظموں کے وافر نمونے ملتے ہیں وہ حاتم ہی ہیں ۔ ان کے ہم عصروں میں ناجی اور آبرو نے بھی مسلسل نظمیں لکھیں لیکن ان کے موضوع اتنے وسیع نہیں تھے اور نہ ان کی نظمیں اتنی کثیر تعداد میں موجود ہیں ..... شاہ حاتم کی جو نظمیں خاص کر قابل ذکر ہیں ان کے نام یہ ہیں ۔ حمد و نعت ۔ حقہ ۔ قہوہ ۔ نیرنگیٔ زمانہ ۔ عرضی استعفا بنام فاخر خاں'' بارہویں صدی' حال دل وغیرہ ۔''

حاتم کی نظموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں نظم نگاری کی عمدہ صلاحیتیں موجود تھیں ۔ یہ نظمیں تسلسل بیان' مربوط تخیل اور وحدت تاثر کا نمونہ پیش کرتی ہیں ۔ حاتم نے مثنوی کی ہیئت کے علاوہ مخمس کی ہیئت بھی استعمال کی ہے ۔ بارہویں صدی پر انھوں نے جو نظم لکھی ہے اس کا

ایک بند یہ ہے :

شہوں کے بیچ عدالت کی کچھ نشانی نئیں　　امیروں بیچ سپاہ کی قدر دانی نئیں

بزرگوں بیچ کہیں بوئے مہربانی نئیں　　تواضع کھانے میں دیکھو تو جگ میں پانی نئیں

گویا جہان سے جاتا رہا سخاوت و پیار

اپنی معلومات کی جانچ :

1. جعفر زٹلی کی نظم نگاری کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔
2. فائز کی چند نظموں کے نام بتایئے۔
3. ڈاکٹر زور نے حاتم کی نظموں کی کن خوبیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

16.3 سوداؔ اور میرؔ کا دور

عہد فائزؔ و حاتمؔ کے بعد سوداؔ و میرؔ کا دور شروع ہوتا ہے۔ اردو شاعری کا یہ دور کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور میں اردو شاعری کو نئی وسعت، نئی بلندی اور وقار حاصل ہوا۔ غزل، قصیدہ، مثنوی اور ہجو وغیرہ اصناف نے اپنے منفرد رنگ و آہنگ اور مخصوص مزاج و معیار پالیا۔ بعض حیثیتوں سے یہ اصناف اپنے نقطۂ عروج کو پہنچیں۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد اردو نظم کو بھی نظیر اکبر آبادی کی شکل میں ایک معمار نصیب ہوا جس نے تن تنہا فارسی یا ہندی کی روایتوں کا سہارا لیے بغیر نظم نگاری کا ایک عالی شان محل تعمیر کردیا۔ نظیر کی نظموں کے مطالعہ سے پہلے سوداؔ اور میرؔ کی نظم نگاری پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

اردو ادب کی تاریخوں میں سوداؔ اور میرؔ کو ایک نظم نگار کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جاتا اور یہ واقعہ ہے کہ نظم کے مخصوص مفہوم میں سوداؔ و میرؔ نے نظمیں نہیں لکھیں۔ لیکن ان کی مثنویوں، مخمسوں، شہر آشوبوں اور ہجوؤں میں نظم کی بہت سی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ان میں انفرادی و اجتماعی، داخلی و خارجی، سماجی و معاشرتی اور فطری و فلسفیانہ بھی مسائل پر غور و فکر کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان نظموں میں بیان کا تسلسل بھی ہے اور خیال کا ارتقا بھی۔ حسنِ تشکیل بھی ہے اور وحدت تاثر بھی۔ سوداؔ کی مثنوی ''درہجو''۔ ''بھنگی کی حکایت''۔ ''دراحوال مرزا فاخر''۔ ''ہجو پیل راجہ نرپت سنگھ''۔ ''حکایت ڈومنی''۔ ''تعریف چاہِ مومن خاں'' اور ''موسمِ گرما'' وغیرہ نظم کے معیارات پر پورا اترتی ہیں۔ ان کی شکل مثنوی کی سی ہے۔ تعریف چاہِ مومن خاں کے چند اشعار درج ذیل ہیں جن میں اس کنویں کے پانی کی خنکی کی توصیف اس طرح کی گئی ہے :

تانہ اوڑھے لحاف کب جیوے　　ڈگدگا کر اگر کوئی پیوے

ہوگیا سرد برف کا بازار　　شور شورے کا اٹھ گیا یک بار

حشر تک زیر آب ہے سیراب　　جس نے یکبار بھی پیا وہ آب

سوداؔ نے شہر آشوب بھی لکھا ہے جس میں انھوں نے اپنے عہد کی بدنظمی و بدحالی اور انتشار پر بے اطمینانی اور کرب و اضطراب کا اظہار کیا ہے۔ اپنے روایتی اور مقررہ مفہوم سے قطع نظر یہ شہر آشوب بھی اپنے عہد کے تہذیبی شعور اور عصری حسیت سے بھرپور ایک دلکش نظم ہے۔

اسی طرح میرؔ کے بعض ترکیب بند مختصر مثنویاں، مخمس، مسدس، شکارنامے اور سوانحی مثنویاں ہر اعتبار سے نظمیں ہیں۔ شہروں کی خرابی، درباروں کی بے رونقی، امرا کی کسمپرسی، لشکر کی بدحالی، عام انسانوں کی خودغرضی اور خود اپنی انانیت کی جو کیفیت میرؔ نے ان نظموں میں بیان کی ہے اس سے اس عہد کے سیاسی تنزل، اخلاقی قدروں کی گراوٹ اور معاشرتی انحطاط کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ شکار نامہ، مثنوی در بیان ہولی، دربیان مرغ بازان، نہنگ نامہ اور موہنی بلی وغیرہ فی الحقیقت اعلیٰ پایہ کی نظمیں ہیں۔ موضوعات کے تنوع اور رنگا رنگی کے باوجود ان نظموں میں فنی تجربے نہیں کیے گئے کیونکہ میرؔ کے پاس ''خالص نظم'' کا کوئی تصور نہیں تھا اور ویسے بھی وہ کلاسیکی روایات سے انحراف نہیں کرسکتے تھے۔

نظم نگاری کے حوالے سے سوداؔ و میرؔ کے عہد ہی کا نہیں بلکہ اردو نظم کی تاریخ کا گل سرسبد نظیر اکبر آبادی (ولادت 1739ء کے آس پاس ۔ وفات 1830ء) ہے ۔نظیر نے اردو شاعری میں بغاوت کی بنیاد ڈالی ۔ انھوں نے غزل گوئی پر نظم نگاری کو ترجیح دی اور بکثرت نظمیں لکھیں ۔نظیر کی ان نظموں کا اسلوب وہ نہیں ہے جو آج کل مروج ہے بلکہ ان کی ہئیت بھی مسدس یا مخمس یا ترکیب بند یا ترجیع بند کی ہے ۔نظیر کی نظموں کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ہندوستان کی عوامی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے نظیر نے ان نظموں کا لہجہ اور اسلوب بھی عوامی سطح سے ہم آہنگ رکھا ۔شائد اسی وجہ سے ان کی شاعری کو ان کے عہد کے ثقہ ادیبوں نے بازاری اور عامیانہ سمجھا۔

نظیر کی شاعری کی روح خالصتاً ہندوستانی ہے ۔ وہ اپنے گرد و پیش کی زندگی اور ماحول سے گہری وابستگی رکھتے ہیں اور عام واقعات سے اپنی نظموں کے لیے مواد حاصل کرتے ہیں ۔ان کی نظمیں موسم کی کیفیات' تہواروں' عوامی مشاغل' زندگی کے رنگا رنگ تجربات و مشاہدات اور معرفت و اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں ۔ ان نظموں سے مشاہدے کی باریکی' واقعیت پسندی' مقامی رنگ' انسان دوستی اور وسیع المشربی کا اظہار ہوتا ہے ۔نظیر ایک من موجی انسان تھے ۔ انھیں مجمع' بھیڑ' عرس' میلے ٹھیلے اور تہواروں سے بڑی دلچسپی تھی ۔ وہ ان میں نہایت رغبت سے شریک ہوتے اور اپنے تجربات و مشاہدات کو نظموں کی شکل دیا کرتے تھے ۔

نظیر کی نظموں کے موضوعات میں بڑا تنوع اور بوقلمونی پائی جاتی ہے ۔ ان کے ہاں ہر رنگ کی نظمیں ملتی ہیں ۔عبرت و نصیحت کے لیے ''بے ثباتی دنیا'' ۔ ''بیان موت'' ۔ ''بڑھاپا'' اور تندرستی نامہ وغیرہ' قلندروں اور گداگروں کے لیے ''کوڑی'' ۔فلوس'' ۔ ''جھونپڑا'' ۔ ''بنجارہ نامہ'' ۔ ''ہنس نامہ'' ۔ ''فنا نامہ'' وغیرہ ۔خوانچے والوں کے لیے تل کے لڈو' ککڑی' تربوز وغیرہ' مداریوں اور بازی گروں کے لیے ''جنگ بُلبلان'' ۔ ''ذکر مرغان'' ۔ ''گلہری کا بچہ'' ۔ ''ریچھ کا بچہ'' ۔ ''اژدھے کا بچہ وغیرہ ۔

نظیر صحیح معنی میں عوامی شاعر تھے ۔ انھوں نے ایک عام آدمی کی طرح زندگی کے حسن و قبح اور خوب و خراب کا تجربہ کیا ۔عوامی تقریبات اور مذہبی تہواروں پر انہوں نے کئی نظمیں لکھیں ۔ بالخصوص ہندوؤں کے تہواروں پر انھوں نے دل کھول کر لکھا مثلاً ہولی پر گیارہ نظمیں بسنت پر تین' دیوالی پر دو اور راکھی پر ایک نظم لکھی ۔ ہولی کا ایک بند درج ذیل ہے ۔

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
خم شیشے جام چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں چھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں پر بھی نظیر نے متعدد نظمیں لکھی ہیں مثلاً کرشن جی سے متعلق دس طویل نظمیں ہیں جن میں کنہیا جی کی راس' جنم کنہیا جی' بلدیو جی کا میلہ' بانسری اور کنہیا جی کی شادی وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔ شیو جی سے متعلق تین نظمیں ہیں جن میں ''مہادیو کا بیاہ'' اہم ہے ۔ ان کے علاوہ سکھوں کے پیشوا گرونانک جی پر ایک نظم ہے ۔نظیر نے یہ نظمیں محض رسماً نہیں لکھی ہیں بلکہ ان میں بلا کا جوش و جذبہ پایا جاتا ہے ۔نظیر کے زمانے میں سیکولرازم کا کوئی تصور نہیں تھا لیکن ان کی یہ نظمیں ان کی وسیع المشربی اور آزادہ روی کی دین ہیں ۔

ہندوستان کے موسموں کو بھی نظیر نے اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے ۔موسم برسات اور اس کے متعلقات پر ان کی پانچ نظمیں ہیں جو کافی طویل ہیں ۔ اسی طرح ''گرمی'' اور اس کے لوازمات مثلاً آندھی' اندھیری' پنکھا' پنکھیا' خربوزے' تربوز' ککڑی' مہندی اور کورے برتن پر بھی ان کی علاحدہ علاحدہ نظمیں ہیں ۔ جاڑے کے موسم پر بھی ان کی ایک نظم ہے ۔ ان نظموں کے مطالعے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ نظیر ہر موسم سے خود بھی لطف اندوز ہو رہے ہیں اور قاری کو بھی اپنے تجربات میں شریک کر رہے ہیں ۔ برسات کی یہ تصویریں دیکھیے اور نظیر کی قوت مشاہدہ اور قدرت بیان کی داد دیجیے ۔

جو اس ہوا میں یارو دولت میں کچھ بڑے ہیں ہے ان کے سر پہ چھتری، ہاتھی اوپر چڑھے ہیں
ہم سے غریب غربا کیچڑ میں گر پڑے ہیں ہاتھوں میں جوتیاں ہیں اور پائنچے چڑھے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

مدت سے ہو رہا ہے جن کا مکاں پرانا اٹھ کے ہے ان کو مینھ میں ہر آن چھت پہ جانا
کوئی پکارتا ہے ٹک موری کھول آنا کوئی کہے ہے چل بھی کیوں ہوگیا دوانا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

نظیر کی نظموں میں منظر نگاری کے خوبصورت نمونے ملتے ہیں ۔ ان کے پیش کردہ سارے مناظر حقیقی ہیں ۔کوئی بھی تخیلی نہیں ہے۔آگرے کی پیراکی کا یہ منظر دیکھیے جو کلیم الدین احمد کے بیان کی مکمل تائید کرتا ہے ۔

جمنا کا پاٹ گویا صحن چمن ہے بارے پیراک اس میں پیریں جیسے کہ چاند تارے
منہ چاند کے سے ٹکڑے تن گورے پیارے پیارے پریوں سے بھر رہے ہیں منجدھار اور کنارے
کچھ وار پیرتے ہیں کچھ پار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

جاتے ہیں ان میں کتنے پانی پہ صاف سوتے کتنوں کے ہاتھ پنجرے کتنوں کے سر پہ طوطے
کتنے پتنگ اڑاتے کتنے سوئی پروتے حقوں کے دم لگاتے ہنس ہنس کے شاد ہوتے
سو سو طرح کا کرکر بستار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

نظیر کی ساری نظمیں خوش وقتی کا ذریعہ نہیں ان کے ہاں اخلاقی اور ناصحانہ نظمیں بھی خاصی تعداد میں ہیں ۔ ''آدمی نامہ'' نظیر کی چند نمائندہ نظموں میں سے ایک ہے ۔ اس نظم کا مرکزی موضوع انسان کی فطرت ہے ۔ جو بیسیوں رنگوں میں ان گنت روپ اختیار کرتی ہے ۔ اس کے رنگ روپ اچھے بھی ہیں اور برے بھی ۔ خوب بھی ہیں اور خراب بھی ملکوتی بھی ہیں اور شیطانی بھی ۔نظیر نے فطرت انسانی کے ہر روپ کو دیکھا ہے سمجھا ہے اور تخلیقی سطح پر اپنے تجربات کی ترسیل کی ہے ۔

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار و بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی چلا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نظیر کی ایک اہم نظم بنجارہ نامہ ہے جس میں انھوں نے دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا عبرت ناک نقشہ کھینچا ہے ۔ اس قبیل کی دیگر نظموں میں رہے نام اللہ، موت، دنیائے ناپائیدار، عالم گزراں، پھیری کی سواری وغیرہ قابل ذکر ہیں جن میں زندگی اور دنیا کے فانی ہونے کا گہرا احساس نظر آتا ہے ۔غرض یہ کہ نظیر نے اپنی نظموں کو انسانی زندگی اور دنیا کے مختلف رنگوں سے ہم آمیز کرنے کی کوشش کی ۔

نظیر اردو شاعری کی تاریخ میں ایک منفرد مقام کے حامل ہیں ۔ صنف نظم کے نشوونما و ارتقا میں ان کے کارناموں کو کبھی فراموش نہیں

کیا جاسکتا۔ نظیر کے بعد اردو نظم کی تاریخ میں ایک خلا نظر آتا ہے۔ اگرچہ بعد کے دور کے شعرا میں انشاللہ خاں انشا کے ہاں کچھ نظمیں مثلاً ہجو زنبور، کھٹمل نامہ اور مرغ نامہ ملتی ہیں لیکن یہ ظریفانہ نظمیں یا منظوم لطائف ہیں۔ اسی طرح غالب کے کلام میں بھی ''چکنی ڈلی''، ''بیسی روٹی'' اور ''مثنوی در صفت انبہ'' نظم کی تعریف میں آتی ہیں لیکن نظم نگاری کی تاریخ کا اہم کارنامہ نہیں ہیں۔ نظیر کے بعد انجمن پنجاب کے مشاعروں سے اردو میں نظم نگاری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. سوداؔ کی چند اہم نظموں کا ذکر کیجیے۔
2. ہئیت کے اعتبار سے میرؔ نے نظم نگاری میں کیا نیا تجربہ کیا؟
3. نظیر اکبر آبادی نے کن موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں؟

16.4 انجمن پنجاب کا مشاعرہ اور اردو نظم کی تحریک

اردو میں نظم کی روایت کو نشوونما اور فروغ دینے میں انجمن پنجاب کے مشاعروں کا تاریخ ساز رول رہا ہے۔ انجمن پنجاب کا اصل نام ''انجمنِ اشاعتِ مطالبِ مفیدہ پنجاب'' تھا۔ لیکن یہ انجمن پنجاب کے مختصر نام سے مشہور ہوئی۔ انجمن پنجاب 21 جنوری 1865ء کو قائم ہوئی۔ اس میں حکومت کے عہدیدار، روسا اور انگریز پرست افراد شریک تھے۔ ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو لائیٹز کو جو گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس انجمن کے کچھ خاص تعلیمی، تہذیبی، اخلاقی و اصلاحی مقاصد تھے۔ اس کے قیام میں انگریز حکام کی ایما بھی شامل تھی۔ اس کے مقاصد میں یہ بات بھی شامل تھی کہ حاکم و محکوم کے درمیان رشتہ اتحاد و موانست کو مضبوط کیا جائے۔ محمد حسین آزاد کو انجمن کا سکریٹری اور لکچرر منتخب کیا گیا۔ وہ انجمن کے ترجمان رسالہ انجمن اشاعت مطالب کے ایڈیٹر بھی تھے۔ انجمن کے جلسوں میں آزاد نے مختلف علمی موضوعات پر مضامین پڑھے اور لکچر دیے۔ 19 اپریل 1874 کو انجمن کے جلسے میں آزاد نے اردو شاعری پر ایک مدلل تقریر کی اور روایتی شاعری کی کمزوریوں کو واضح کرتے ہوئے نظم نگاری پر زور دیا۔ اور ایک نظم ''شب قدر'' بہ طور نمونہ پیش کی۔ کرنل ہالرائیڈ نے جو محکمہ تعلیمات کے ڈائرکٹر تھے، آزاد کے خیالات کی تائید کی اور تجویز پیش کی کہ ہر ماہ ایک مشاعرہ ہو جس میں مصرع طرح کے بجائے کسی خاص مضمون/ عنوان پر شعرا طبع آزمائی کریں اور اپنی تخلیق مشاعرے میں پیش کریں۔ اس نے اس طرز کے پہلے مشاعرے کے لیے ''برسات'' کا عنوان دیا۔ اس طرح انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے اردو میں نظم نگاری اور موضوعاتی مشاعرے کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کے پیچھے انگریز حکمرانوں کا دماغ کام کر رہا تھا۔ حکومت پنجاب اس سے تعاون کر رہی تھی۔ انگریز حکومت کو سرکاری مدارس میں پڑھانے کے لیے اخلاقی اور نصیحت آمیز نظموں کے ایک انتخاب کی ضرورت تھی۔ قدیم شعرا کے کلام سے اس انتخاب کے مرتب نہ ہو سکنے کی صورت میں حکومت چاہتی تھی کہ اس دور میں موجود شعرا ایسی نظمیں لکھیں۔ حکومت کی اس پالیسی کے پیش نظر کرنل ہالرائیڈ نے موضوعاتی مشاعرے یا ''محفل مناظمہ'' کی تجویز پیش کی۔ ان مشاعروں کا انجمن پنجاب سے بس اتنا تعلق تھا کہ یہ انجمن کے مکان میں منعقد ہوتے تھے اور ان کی روداد انجمن کے رسالے میں شائع ہوتی تھی۔ فی الحقیقت یہ مشاعرے محکمہ تعلیمات کے زیر اہتمام منعقد ہوتے تھے۔ لیکن تاریخ ادب میں یہ انجمن پنجاب کے مشاعروں کے نام سے مشہور ہیں۔

نظم نگاری کی تحریک کی کامیابی میں محمد حسین آزاد کی کاوشوں کا بڑا دخل رہا۔ آزاد کے مضمون ''خیالات در باب نظم اور کلام موزوں'' اور لکچر بہ ضمن مثنوی ''شب قدر'' کو نظم نگاری کے سلسلے میں ایک منشور کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس مشاعرے کے انعقاد میں آزادؔ کی دلچسپی اور ان کی کد و کاوش ناقابل فراموش ہے۔ انھوں نے انجمن کا کوئی مشاعرہ ناغہ نہیں کیا اور ہر مشاعرے میں نظم سنائی۔ انھوں نے نظم نگاری کی شعوری تحریک کی اور شعرا کو ترغیب دے کر نظم کہنے پر آمادہ کیا۔ انجمن کے نو مشاعرے منعقد ہوئے پہلا مشاعرہ 30 مئی 1844ء کو جس میں حالیؔ نے برکھارت، مولوی الطاف علی نے ''آب کرم'' اور آزاد نے ابر کرم کے عنوان سے نظم پڑھی۔ نواں مشاعرہ 3 مارچ 1875ء کو منعقد ہوا

۔اس کا موضوع تہذیب تھا۔ اس کے بعد حکومت کی عدم دلچسپی کی وجہ سے مشاعروں کا سلسلہ مسدود ہوگیا۔ ان مشاعروں میں حالی اور آزاد کے سوا کوئی بڑا شاعر شریک نہ ہوا۔ آزاد نے ان مشاعروں میں جو نظمیں پیش کیں وہ ان کے مجموعے ''نظم آزاد'' میں شامل ہیں۔ ان میں بیشتر مثنوی کی ہئیت میں ہیں جیسے صبح امید' حب وطن' خواب امن' داد انصاف' وداع انصاف' گنج قناعت' ابر کرم' زمستان وغیرہ۔ یہ صرف ہئیت کے اعتبار سے مثنوی ہیں ان میں روایتی مثنویوں جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ ''نظم آزاد'' میں آٹھ مختصر نظمیں بھی شامل ہیں جیسے شرافت حقیقی' معرفت الٰہی' اولوالعزمی کے لیے کوئی سد راہ نہیں' ایک تارے کا عاشق اور محنت کرو وغیرہ۔ نظم معرفت الٰہی کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

سیکڑوں چیزیں اس جہاں میں ہیں — کہ بری خلق کے گماں میں ہیں
صرف ہووے گر اس میں حسنِ خیال — تو ہو پھر نقص اس کا عین کمال
گل و سنبل سے تاخس و خاشاک — خاک سے تابہ گلشن افلاک
رکھتے جو لوگ ہیں نظر عالی — نہیں عبرت سے کوئی شئے خالی
ہر ورق ہے شجر پہ بہر حساب — بہ کف دست موعظت کی کتاب

محمد حسین آزاد کی نظمیں انجمن پنجاب کے ''دستور المقاصد'' کا تخلیقی اظہار ہیں۔ ان نظموں میں خیالات کو حقائق اور واقعات کے مطابق ڈھالنے کی شعوری کوشش نظر آتی ہے۔ ان نظموں میں خارجیت کا عنصر غالب ہے۔ لوگوں کی ذہنی اصلاح بھی آزاد کا مطمح نظر تھی اس لیے ان نظموں میں خطابیہ لہجہ ملتا ہے۔ تخلیقی سطح پر یہ نظمیں اکہری نظر آتی ہیں ان میں معنوی تہہ داری نہیں ہے۔ ہئیت کے اعتبار سے آزاد نے قدیم اصناف میں نئے تجربوں کو آزمایا اور مثنوی کے امکانات کا دائرہ وسیع کردیا۔ بحروں کے انتخاب میں تنوع کو ملحوظ رکھا اور بندوں کی تشکیل نئے انداز میں کی۔ انھوں نے مثنوی کو عشقیہ داستانوں کے کوچے سے نکال کر فطرت نگاری سے آشنا کیا۔ انھوں نے نظم میں ردیف وقوافی کو ترک کرنے کا تجربہ بھی کیا۔ ان کی نظمیں ''جغرافیہ طبعی کی ایک پہیلی'' اور ''جذب دوری'' اردو کی اولین معریٰ نظمیں ہیں۔ اردو شاعری کو نئے اسالیب سے روشناس کرنے کے مقصد سے آزاد نے بعض انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ آزاد کے منظوم ترجموں میں معرفت الٰہی' بڈھا باپ اور ''اولوالعزمی کے لیے کوئی سد راہ نہیں'' شامل ہیں۔

انجمن پنجاب کے مشاعروں کے سب سے اہم شاعر مولانا الطاف حسین حالی ہیں۔ انھوں نے انجمن کے مشاعروں میں چار معرکتہ الآرا مثنویاں ''برکھارت''، ''نشاط امید''، ''مناظرہ رحم وانصاف'' اور ''حب وطن'' پیش کیں۔ زبان کی صفائی' بندشوں کی چستی اور جذبات وکیفیات کی عکاسی کے اعتبار سے حالی کی یہ نظمیں نہایت بلند پایہ ہیں۔ حالی نے اپنی نظموں میں نہ صرف قدیم اور جدید رنگ کی ہنرمندانہ پیوندکاری کی بلکہ موضوعات کی تبدیلی اور نئے خیالات سے اردو نظم کو نئی ڈگر پر ڈال کر اسے نئی شاعری کا امتیازی نشان بھی بنا دیا۔ حالی نے انجمن پنجاب کے چار مشاعروں میں شرکت اس کے بعد وہ لاہور سے دہلی چلے گئے لیکن اس تحریک کے مقاصد' طریق عمل اور پیغام بھی اپنے ساتھ لے کر گئے۔ اس طرح انھوں نے دہلی جیسے شعر و ادب کے مرکزی دبستان میں روایتی شاعری کے برعکس نظم نگاری کے سفیر کا فریضہ انجام دیا۔ حالی کی نظم ''برکھارت'' کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

گرمی کی تپش بجھانے والی — سردی کا پیام لانے والی
قدرت کے عجائبات کی کان — عارف کے لیے کتاب عرفان
وہ شاخ و درخت کی جوانی — وہ مور و ملخ کی زندگانی
وہ سارے برس کی جان برسات — وہ کون ؟ خدا کی شان برسات
آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد — اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد

حالؔی نے بعض انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ ان کی نظمیں ''دوست'' اور ''قدر و منزلت کس جگہ ہوتی ہے'' انگریزی نظموں کا ترجمہ ہیں۔

انجمن پنجاب کے مشاعروں میں آزادؔ اور حالؔی کے علاوہ متعدد دیگر شعرا نے بھی شرکت کی اور مقررہ موضوعات پر نظمیں لکھ کر سنائیں۔ان میں سے بعض شعرا کے نام یہ ہیں۔ الطاف علی، ذوقؔ کاکوروی، انور حسین ہما، مرزا اشرف بیگ خاں اشرف، منشی الٰہی بخش رفیق، محمد مقرب علی، امو جان ولؔی دہلوی (شاگرد غالب) مولوی وقار بخش، مولوی علا الدین محمد کاشمیری، مرزا محمد عبداللہ بیگ مضطرب، مولوی عطا اللہ خاں عطاؔ، پنڈت کرشن لال طالب، مصر رام داس قابلؔ، منشی لچھمن داس برہمؔ، مولوی سلطان علا الدین قریشی اور سید اصغر علی حقیرؔ وغیرہ۔ ان شعرا کے نام اور ان کی نظموں کے جو نمونے موجود ہیں ان کے دیکھنے سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ شعرا بہت زیادہ مقبول یا اہم تھے۔ لیکن ان سب کی اجتماعی کوشش نے اردو شاعری میں ایک نئی راہ روشن کی۔

انجمن پنجاب کے مشاعرے نہایت نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔ ان کے اثرات نے ایک منظم تحریک کی شکل اختیار کی اور لاہور کے علاوہ بعض دوسرے مقامات پر بھی ایسے جلسوں کی بنیاد پڑی۔ مثلاً میرٹھ میں نظم سوسائٹی قائم ہوئی جس نے انھیں خطوط پر مشاعرے منعقد کیے جن پر انجمن پنجاب کے مشاعرے ہو رہے تھے۔ اسی طرح ''دہلی لٹریری سوسائٹی'' کے ایک جلسے میں سیف الحق دہلوی (شاگرد غالب) نے موضوعاتی نظم سنائی۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں کی گونج گورنمنٹ کی کوششوں سے ملک کے کونے کونے میں پہنچی۔ کرنل ہالرائیڈ نے اس تحریک کو مقبول بنانے کے لیے آزاد کے مضمون اور مثنوی ''شب قدر'' کی نقلیں ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے تعلیمی محکموں کو ارسال کیں۔ اس تحریک کے فروغ کے لیے اچھی نظموں پر انعام کی پیش کش بھی کی گئی۔ مختصر یہ کہ انجمن پنجاب کے مشاعروں نے غزل کی مقبولیت کے دور میں نظم کو منظر عام پر لانے کا موقع فراہم کیا اور مستقبل میں نظم کے فروغ کے لیے راہ ہموار کردی۔ مختلف اصحاب (جن میں سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کا خاصا دخل ہے) کی کوششوں کے سبب نظم نگاری کو نہ صرف فروغ حاصل ہوا بلکہ موضوع اور مواد میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ ہیئت و اسلوب میں بھی متعدد تجربے کیے گئے۔

انجمن پنجاب کی تحریک نے اردو میں انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں پر بھی زور دیا۔ محمد حسین آزادؔ اور حالؔی نے بعض انگریزی نظموں کے اردو میں منظوم ترجمے کیے اور بعض نظموں میں انگریزی نظم کے مرکزی خیال یا مطالب کو اردو کا جامہ پہنایا۔ ویسے انجمن پنجاب کے مشاعروں کے آغاز سے قبل مومنؔ دہلوی کے شاگرد قلقؔ میرٹھی نے سرکاری مدارس کے نصاب میں شامل انگریزی نظموں کے پہلے حصے کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ قلقؔ میرٹھی کی ترجمہ کی نظموں کی اصلاح غالبؔ نے کی تھی (بحوالہ ڈاکٹر حسن الدین احمد 'انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ' حیدرآباد 1984۔ صفحہ 117) قلقؔ کی ترجمہ کی ہوئی نظموں کا مجموعہ ''جواہر منظوم'' کے نام سے 1864 میں شائع ہوا۔ اسے اردو میں منظوم ترجموں کا پہلا مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔ سرکاری مدارس کے نصاب میں شامل انگریزی کی بیس نظموں پر مشتمل دوسرے حصے کا ترجمہ دو الگ الگ شاعروں نے کیا۔ پہلے بانکے بہاری لال گوہرؔ نے ان منتخب نظموں کا ترجمہ ''گوہر شب تاب'' کے نام سے کیا جو 1869ء میں شائع ہوا۔ پھر مراد آباد کے عربی و فارسی اسکول کے مدرس رحیم اللہ نے بھی انہی بیس نظموں کا ترجمہ کیا جو 1872ء میں شائع ہوا۔ یہ ترجمے اردو نظم کو انگریزی نظموں کے مزاج اور منہاج سے متعارف کرنے میں نہایت اہم ثابت ہوئے۔ بعد کے زمانے میں اسماعیل میرٹھی، نظم طباطبائی، اقبال اور سرور جہاں آبادی وغیرہ نے منظوم ترجموں کی روایت کو آگے بڑھایا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. انجمن پنجاب کا اصل نام کیا تھا؟ اس کا قیام کب عمل میں آیا؟
2. انجمن پنجاب کا پہلا مشاعرہ کب اور کس موضوع پر منعقد ہوا؟
3. انجمن پنجاب کے مشاعروں کی اہم خصوصیت کیا تھی؟
4. ان مشاعروں میں کن شعرا نے حصہ لیا؟

16.5 علی گڑھ تحریک اور اردو نظم

علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید احمد خان کو انجمن پنجاب کے موضوعاتی مشاعروں سے گہرا تعلق خاطر تھا۔ اردو شاعری میں وہ جس قسم کی تبدیلی چاہتے تھے انجمن کے مشاعروں سے اس کی تکمیل ہو رہی تھی چنانچہ محمد حسین آزاد کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں ''میری نہایت قدیم تمنا اس مجلس مشاعرہ سے بر آئی ہے۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی ''خواب امن'' پہنچی دل بہت خوش ہوا۔ (بحوالہ ڈاکٹر منظر اعظمی۔ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ' لکھنو 1996ء ص155)

سرسید احمد خان نے اپنے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' میں بھی انجمن پنجاب کے نظم اردو کے مشاعروں کی بھرپور حمایت کی۔ ایک مضمون میں انھوں نے لکھا۔ ''اردو زبان کے علم و ادب کی تاریخ میں 1874ء کا وہ دن جب لاہور میں نیچرل پوئٹری کا مشاعرہ ہوا ہمیشہ یادگار رہے گا۔ (مضامین تہذیب الاخلاق' جلد دوم' ص 555)

سرسید شعر و ادب میں ترقی پسندانہ اقدامات کے حامی تھے۔ وہ شاعری کو سماجی و تہذیبی تعمیر کا ہتھیار بنانا چاہتے تھے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں کے لیے وہ شعرا کو تاکید کیا کرتے تھے کہ ایسی نظمیں لکھیں اور سنائیں جن سے قوم میں ترقی کا خیال اور بیداری کی لہر پیدا ہو۔ سرسید کے خیالات ہی کے زیر اثر اردو شاعری میں اخلاقی اور سماجی بلکہ سیاسی موضوعات تک پر شعر کہنے کا رجحان پیدا ہوا اور نیچرل اور قومی نظموں کو فروغ حاصل ہوا۔ حالی علی گڑھ تحریک کے سب سے نمایاں سخنور تھے۔ حالی نے نئی شاعری کا آغاز لاہور میں کیا اور اسے دہلی میں پروان چڑھایا۔ علی گڑھ تحریک کے عروج کے زمانے میں حالی کی کچھ نظمیں بے حد مقبول ہوئیں۔ ان میں مسدس مد و جزر اسلام' مناجات بیوہ' چپ کی داد اور مرثیہ غالب قابل ذکر ہیں۔ مسدس مد و جزر اسلام کو ایک عظیم شہ پارے کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ نظم انھوں نے سرسید کی فرمائش پر لکھی۔ یہ ایک طویل نظم ہے جس میں حالی نے مسلمانوں کے عروج و زوال کا نقشہ کھینچا ہے۔ حالی کے ہاں مختصر نظمیں بھی ہیں جیسے ''قوم کی پاسداری''۔ ''عقل اور نفس کی گفتگو''۔ ''روسائے عہد کی فیاضی''۔ ''خودستائی''۔ ''شائستہ لوگوں کا برتاو سائل کے ساتھ''۔ ''جواں مردی کا کام'' وغیرہ حالی نے نظم نگاری میں ان روایات کو فروغ دینے کی کوشش کی جو انگریزی سے ماخوذ ہیں۔ یہ روایات فارسی کی عشقیہ روایات سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کی نظموں میں زندگی سے تعلق اور سماج کی اصلاح کا جذبہ رواں دواں نظر آتا ہے۔ حالی نے قومی شعور' حب وطن' علم کی اہمیت' آزادی اور خودداری جیسی اعلیٰ اقدار پیدا کرنے پر زور دیا۔ ان کی نظمیں مروجہ روایت سے انحراف کی علامت بن گئیں۔

حالی کے معاصرین میں شبلی نعمانی نے نثر کے میدان میں شہرت حاصل کی لیکن وہ ایک قادر البیان شاعر بھی تھے۔ شبلی مذہبیت کو زندگی کا سب سے اہم جزو سمجھتے تھے۔ وہ سرسید کی غیر متوازن عقلیت کے قائل نہیں تھے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی وہ علی گڑھ تحریک کے ہم نوا تھے۔ ان کی قومی اور سیاسی نظموں پر اس تحریک کے اثرات نمایاں ہیں۔ محمڈن ایجوکیشن کانفرنس کے جلسوں میں انھوں نے جو نظمیں پیش کیں ان میں جذبات کا وفور اور بیان کا جوش پایا جاتا ہے۔ انگریزی راج کے خلاف اظہار جذبات میں وہ کسی سے پیچھے نہ تھے۔ ان کے کلام میں طنز کا عنصر حاوی ہے۔ کلیات شبلی میں مذہبی و اخلاقی نظموں کی ذیل میں ہجرت نبویؐ' اہل بیت رسولؐ کی زندگی' مساوات اسلام' عدل فاروقی کا ایک نمونہ اور خواتین عرب کا ثبات و استقلال نہایت دلکش نظمیں ہیں۔ شبلی کی سیاسی اور قومی نظموں میں شہر آشوب اسلام' ہم کشتگان معرکہ کانپور ہیں۔ مذہب یا سیاست' خطاب بہ اصرار' علمائے زندانی اور جنگ یوروپ اور ہندوستانی قابل ذکر ہیں۔ شبلی نے اردو نظم کو سیاسی طنز کے نئے رنگ سے روشناس کیا۔

اکبر الہ آبادی حالی کے معاصر تھے۔ انھیں اردو میں طنز و مزاح کے سب سے بڑے شاعر کی حیثیت حاصل ہے۔ ابتدا میں وہ سرسید کی جدیدیت اور مغرب پرستی کے قائل نہیں تھے۔ انھوں نے سرسید کے خلاف طنزیہ نظمیں لکھیں۔ بعد میں وہ سرسید کے اخلاص اور قومی ہمدردی کے قائل ہوگئے۔ اکبر نے نظم کی نشوونما اور ترویج میں اہم حصہ لیا۔ نظم نگاری میں اکبر کا طرز فکر اور اسلوب بیان دونوں منفرد ہیں۔ نظم قومی' برق کلیسا' جلوۂ دربار دہلی' ایک بوڑھا نحیف و خستہ زار' گرمی بحث میں' دریا کی روانی اور دو تتلیاں ہوا میں اڑتی دیکھیں اکبر کی اہم نظمیں ہیں۔ ''دریا کی روانی میں'' پانی کے بہاؤ کی بڑی جاندار تصویر کشی کی ہے۔ یہ نیچرل شاعری دلوں کو موہ لیتی ہے۔

پہاڑوں سے سر کو پٹکتا ہوا　　چٹانوں سے دامن جھٹکتا ہوا
وہ گاتا ہوا وہ بجاتا ہوا　　یہ لہروں کو پیہم نچاتا ہوا
سدھرتا ہوا اور سنورتا ہوا　　تھرکتا ہوا رقص کرتا ہوا

اکبر نے اپنے ظریفانہ رویے سے ہمیں اپنے تہذیبی ورثے کی اہمیت کا احساس دلایا اور روایات کی زندہ و تابناک اقدار سے محبت کرنا سکھایا۔ اکبر کے ہاں نظم معرّیٰ کی ہیت میں دو نظمیں ملتی ہیں جن کے عنوان نہیں ہیں۔ ایک نظم کا پہلا مصرع ہے: ''اجسام کے فنون کا کرتے ہیں خود عمل''۔ اور دوسری نظم کا مصرع اول یوں ہے: ''چلا جاتا تھا اک ننھا سا کیڑا رات کاغذ پر''۔ اکبر کی نظم دو تتریاں مثنوی کی ہئیت اور رباعی کی بحر میں ہے۔ رباعی کی بحر میں نظم لکھنے کا یہ پہلا تجربہ ہے۔

دو تیتریاں ہوا میں اڑتی دیکھیں　　اک جست میں سو طرف کو مڑتی دیکھیں
بھولی خوش رنگ چست نازک پیاری　　پہنے ہوئے فطرتی منقش ساری
پھُرتی ہے کہ برق کی طبیعت کا ابھار　　تیزی ہے کہ آنکھ کو تعاقب دشوار

.....

کس بزم میں ایسا ناچ سیکھ آتی ہیں　　پریاں اِندر کی جس سے شرماتی ہیں

علی گڑھ کے دیگر رہنماؤں میں ڈپٹی نذیر احمد بلند پایہ نثر نگار تھے۔ انہوں نے شاعری بھی کی لیکن وہ حالی اور شبلی کے درجے کے شاعر نہیں تھے۔ علی گڑھ تحریک کے پیغام اور اصلاحی کوششوں کی اشاعت کے لیے وہ نظم نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں کے لیے ان سے موضوعاتی نظموں کی فرمائش کی جاتی اور وہ نظمیں لکھتے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے سرسید کے لیے ''قوم کا مسیحا''، ''سید احمد خاں کے احسانات'' اور ''مرثیہ سید احمد خاں'' جیسی نظمیں لکھیں۔ ''مرثیہ مبتلا'' انہوں نے شبلی کی ''صبح امید'' سے متاثر ہو کر لکھی۔ ان کی نظم ''اتمام حجت'' سے علی گڑھ تحریک کے مزاج اور انداز فکر کی غمازی ہوتی ہے۔

علی گڑھ تحریک سے براہ راست تعلق رکھنے والے دیگر شعرا میں مولوی ذکاء اللہ، خوشی محمد ناظر اور وحید الدین سلیم بھی شامل ہیں لیکن یہ لوگ اعلیٰ پایے کے شاعر نہیں تھے۔ البتہ انھیں صنف نظم کی افادیت کا احساس تھا۔ ان کی نظموں میں ادبی حسن کم اور خیالات کو نظم کرنے کا انداز نمایاں ہے۔

مولوی اسماعیل میرٹھی کا علی گڑھ تحریک سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا لیکن وہ اس تحریک سے متاثر تھے۔ جدید نظم کے معماروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے موضوعاتی نظموں میں شعریت کا اضافہ کر کے انھیں ادبی قدروں سے مالا مال کیا۔ انہوں نے دیہاتی ماحول پر نظمیں لکھ کر اردو نظم کو ایک نیا افق دیا۔ ان کی متعدد نظموں کے موضوعات دیہاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور ان نظموں کی فضا بھی دیہی ہے۔ ''صبح کی آمد''۔ ''پن چکی''۔ ''کاشتکاری'' اور ''ہماری گائے'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں دیہاتی زندگی کی سادگی، معصومیت اور دلکشی کا احساس ہوتا ہے۔ ''شفق''۔ ''تاروں بھری رات''۔ ''گرمی کا موسم''۔ ''برسات'' اسماعیل میرٹھی کی اہم نظمیں ہیں۔ ان میں انہوں نے مشاہدے کی باریکی اور جزئیات نگاری کے ذریعے قدرتی مناظر کی متحرک تصویریں پیش کی ہیں۔ نظم ''جریدہ عبرت'' میں انہوں نے شعرا کی قدیم روش ترک کر کے شاعری کو حقیقی زندگی سے روشناس کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے نہایت دل نشیں اور خوبصورت نظمیں لکھیں جیسے ''بچہ اور ماں''، ''ماں اور بچہ''، ''میرا خدا میرے ساتھ''، ''کوشش کیے جاؤ''، ''دال کی فریاد''، ''خدا کی قدرت''، ''ایک پودا''، ''گھانس'' اور ''تھوڑا تھوڑا بہت ہو جاتا ہے'' وغیرہ۔ انہوں نے کئی انگریزی نظموں میں کا اردو ترجمہ کیا۔ ان کی نظموں کے مجموعے ''ریزۂ جواہر'' میں شامل درج ذیل چھے نظمیں انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ ہیں:

1- کیڑا　2- ایک قانع مفلس　3- موت کی گھڑی　4- فادر ولیم　5- حب وطن　6- انسان کی خام خیالی

اسماعیل میرٹھی نے اور بھی منظوم ترجمے کیے جن میں بیشتر بچوں کے لیے ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کے منظوم ترجمے آزاد اور حالی کی ادبی

تحریک کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں ۔ جدید نظم کے فروغ میں آزاد اور حالی کے ساتھ اسماعیل میرٹھی کا نام آتا ہے ۔ انھوں نے اردو نظم میں ہئیت کے تجربے بھی کیے ۔ چڑیا کے بچے اور تاروں بھری رات ان کی معریٰ نظمیں ہیں ۔ نظم تاروں بھری رات Ann Taylar کی نظم Twinkle Twinkle Little Star کا ترجمہ ہے ۔ اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں ۔

ارے چھوٹے چھوٹے تارو
کہ چمک دمک رہے ہو
تمہیں دیکھ کر نہ ہووے
مجھے کس طرح تحیر
کہ اس اونچے آسماں پر
جو ہے کُل جہاں سے اعلیٰ
ہوے روشن اس روش سے
کہ کسی نے جڑ دیے ہیں
گہر اور لعل گویا

حالی اور آزاد کے معاصرین علی حیدر نظم طباطبائی بھی اردو کے ایک بلند پایہ نظم نگار شاعر تھے ۔ نظم نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھیں جیسے مناظر قدرت، اخلاقیات اور تاریخی روایات وغیرہ ۔ ان نظموں میں نظم نے تخیل اور حقیقت کے ساتھ شاعری کے حسن اور لطف کو بھی پوری طرح برقرار رکھا ہے ۔ ''گلاب کا پھول'' ایک مختصر سی نظم ہے مگر دنیا کی بے ثباتی اور انجام کی اثر آفریں تصویر پیش کرتی ہے ۔ نظم طباطبائی کا ''ساقی نامہ شقشقیہ'' بھی روانی و برجستگی اور طرز بیان کے حسن کی وجہ سے کافی مشہور ہوا ۔ نظم نے انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں کی طرف بھی کافی توجہ دی ۔ ان کے منظوم ترجموں میں سب سے طویل اور اہم نظم ''گور غریباں'' ہے ۔ یہ انگریزی کے مشہور شاعر تھامس گرے کی نظم Elegy written in the Country Churchyard کا منظوم ترجمہ ہے ۔ یہ منظوم ترجمہ پہلی مرتبہ رسالہ ''دل گداز'' جولائی 1897 میں شائع ہوا ۔ نظم نے اس ترجمے میں انگریزی نظم کے قافیوں کی ترتیب کو برقرار رکھا ۔ اس نظم کے تعارفی نوٹ میں دل گداز کے ایڈیٹر مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں ''ایسی جاں گداز اور موثر نظمیں اور بیخل طور پر بھی اردو میں کم لکھی گئی ہیں نہ کہ ترجمہ اور پھر اس پابندی کے ساتھ کہ جس طرح پہلے مصرع کا قافیہ تیسرے مصرع سے اور دوسرے مصرع کا چوتھے مصرع سے انگریزی میں ملتا ہے اسی طرح ہمارے مولانا [نظم طباطبائی] نے بڑے لطف سے اپنی طرز قافیہ بندی کو چھوڑ کر اردو میں ملایا ہے ۔ اردو میں اسٹانزا کہنے کی ابتدا اس نظم سے ہوتی ہے ۔ ''گور غریباں'' کے چند اشعار درج ذیل ہیں :

وداع روزِ روشن ہے گجر شام غریباں کا — چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے
قدم گھر کی طرف کس شوق سے اٹھتا ہے دہقاں کا — یہ ویرانہ ہے، میں ہوں اور طائر آشیانوں کے

.....

اندھیرا چھا گیا دنیا نظر سے چھپتی جاتی ہے — جدھر دیکھو اٹھا کر آنکھ اُدھر اک ہو کا عالم ہے
مگس لیکن کسی جا بھیرویں بے وقت گاتی ہے — جرس کی دور سے آواز آتی ہے کبھی پیہم

نظم طباطبائی نے یہ ترجمہ اس خوبی سے کیا ہے کہ اصل نظم کا جذباتی تاثر، سوز و گداز اور عبرت خیزی کی کیفیت پوری طرح ترجمے میں سمٹ آئی ہے ۔ ''گور غریباں'' نے اردو میں منظوم ترجمے کا ایک معیار قائم کیا ۔ نظم کے دیگر منظوم تراجم میں زمزمۂ فصل بہار، رحم، نغمہ زندگی، یادرفتگاں، دعوت زہرا اور ہمدردی و ثابت قدمی وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔ مغربی خیالات اور ادب سے متاثر ہوکر نظم نے اردو نظم میں ہئیت کے تجربے کیے ۔ انھوں نے ''بلینک ورس یعنی نثر مرجز بوزن رباعی'' کے عنوان سے نظم معریٰ کی ہئیت میں ایک نظم لکھی ۔ وہ نظم معریٰ کو نثر مرجز

کہتے ہیں جس میں وزن تو ہے لیکن قافیہ نہیں ۔ نظم کی یہ تخلیق رسالہ دل گداز نومبر 1900ء میں شائع ہوئی ۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. حالی کی چند اہم نظموں کے نام بتائیے ۔
2. شبلی نے اردو نظم میں کن باتوں کا اضافہ کیا ؟
3. اکبر الہ آبادی کی نظم نگاری کی اہم خصوصیات کیا ہیں ؟
4. اسماعیل میرٹھی نے نظم میں کیا تجربے کیے ؟
5. میر علی حیدر نظم طباطبائی کے منظوم تراجم پر روشنی ڈالیے ۔

16.6 علی گڑھ تحریک کے اثرات کا تسلسل اور اردو نظم

علی گڑھ تحریک ایک طاقتور اور موثر تحریک تھی جس نے زندگی اور ادب کے متعدد گوشوں کو متاثر کیا ۔ اردو شعر و ادب پر 1936ء تک اس کے اثرات کی کارفرمائی نظر آتی ہے ۔ 1936ء میں ترقی پسند تحریک کے آغاز کے بعد علی گڑھ تحریک کے نقوش دھندلے ہونے لگتے ہیں لیکن اس دوران اردو میں کئی نظم نگار شعرا ابھرے جنھوں نے اپنے فکر و فن کے ذریعے ایک طرف علی گڑھ تحریک کے اثرات کی توسیع و تسلسل کو جاری رکھا اور دوسری طرف شمالی ہند میں اردو نظم کے فروغ و ارتقا میں اہم حصہ لیا ۔ ان شعرا میں نظر ، سرور جہاں آبادی ، اقبال ، چکبست ، نادر کاکوری ، مہر اور شرر وغیرہ اہم ہیں ۔ ذیل میں ان شعرا کی نظم نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ اس دور میں نوبت رائے نظر ایک کامیاب نظم نگار شاعر تھے ۔ ان کی نظموں میں جوش و فکر کے ساتھ جذبات نگاری اور خیال آفرینی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں ۔ نظر کی بعض نظمیں انگریزی سے ترجمہ ہیں ۔ ''بہار و خزاں'' ۔ ''یاران بے ہنگم'' اور ''گلاب'' نظر کی نمائندہ نظمیں ہیں ۔ نظر کی نظموں میں مناظر فطرت کی دلکش مرقع کشی نظر آتی ہے ۔ بعض نظموں میں انہوں نے دانش افروز نکات پیش کیے ۔ نظر کی نظموں میں وطن پرستی کے جذبات بھی ہیں ۔ ''تیغ ہندی'' ۔ ''وطن دوستی'' ۔ ''سیتا جی'' جیسی نظموں میں حب الوطنی اور وطن کی عظمت رفتہ کا احساس نمایاں ہے ۔ نظر کی بعض نظمیں مسدس کی ہئیت میں ہیں ۔ مسدس کی ہئیت کو انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے برتا ہے ۔

درگا سہائے سرور جہاں آبادی نے بھی نظم نگاری کو نئی جہتوں سے روشناس کیا ۔ انہوں نے اپنی نظموں میں ہندوستانی ماحول ، رسوم و عقائد ، ہندوستانی روایات و اساطیر اور ہندوستانی طرز فکر کی ترجمانی کی ۔ ان کی نظموں میں ہندوستانی مٹی کی مہک رچی ہوئی محسوس ہوتی ہے ۔ سرور نے مناظر قدرت پر جو نظمیں لکھیں ہیں ان میں اپنی تخلیقی توانائی اور احساسی رجحان کے ذریعہ نے نئے بصری اور سماعی پیکر تراشے ہیں ۔ اس خصوص میں سرور کی نظمیں ''عروس برشگال'' ۔ ''یاد طفلی'' ۔ ''یاد بچپن'' اور ''صحرا اور بیر بہوٹی'' وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔ سرور کے موضوعات میں بڑا تنوع اور رنگا رنگی پائی جاتی ہے ۔ انھوں نے اچھوتے موضوعات پر نظمیں لکھیں جیسے ''مہاراجہ دشرتھ کی بے قراری'' ۔ ''پریاگ کا سنگم'' ۔ ''سارس کا جوڑا'' ۔ ''بھونرے کی بے قراری'' ۔ ''سیتا جی کی گریہ وزاری'' ۔ ''ادائے شرم'' وغیرہ ۔ سرور کو ہندوستان کی عظمت رفتہ اور اس کے تہذیبی ورثے کا شدید احساس تھا ۔ اسی احساس نے ان سے ''پدمنی'' ۔ ''لکشمی جی'' ۔ ''نور جہاں'' ۔ ''دربار اکبر'' ۔ ''نیرنگ زمانہ'' اور ''چتوڑ کی گزشتہ عظمت'' جیسی نظمیں لکھوائیں ۔ سرور نے ایک سچے قوم پرست شاعر کی طرح اپنی نظموں میں حب الوطنی اور سیاسی شعور کی ترسیل کی ۔ ''یادوطن'' ، ''شکوہ صیاد'' ۔ لالہ لجپت رائے'' ۔ ''سوامی رام تیرتھ'' ۔ ''شہر آشوب'' اور ''ایک جلا وطن محب قوم کا گیت'' ان کی ایسی نظمیں ہیں جو اردو کی قومی اور وطنی شاعری کا بیش قیمت اثاثہ ہیں ۔

اقبال کو اردو کا سب سے بڑا نظم نگار کہا جاسکتا ہے ۔ انہوں نے اردو نظم کو فکر و خیال کا ایک نیا جہاں دیا ۔ وہ حکیمانہ خیالات اور فلسفیانہ افکار کی ترسیل کے لیے غزل کی ہئیت کو ناکافی سمجھتے تھے ۔ اس لیے انھوں نے اپنے شعری ملہمات اور تخلیقی تجربات کے اظہار کے لیے نظم کی ہئیت کو شعوری طور پر اختیار کیا ۔ اقبال نے نظم کی روایتی ہئیت میں بعض تجربے بھی کیے ۔ ان کی بیشتر اہم نظمیں ترکیب بند کی ہئیت میں ہیں ۔

ان کی متعدد غزلیں ایسی ہیں جو تسلسل خیال کے اعتبار سے نظم ہیں اور بعض نظموں میں بند کے بند ایسے ہیں جو بہ ادنی تغیر غزل کہلائے جاسکتے ہیں۔

اقبال کے یہاں ایک اچھی خاصی تعداد ان نظموں کی ہے جو مغربی شعرا کی نظموں سے ماخوذ ہیں۔ اقبال کے منظوم ترجمے اردو نظم کا گراں بہا سرمایہ ہیں۔ یہ ترجمے زبان و بیان کی لطافت اور روانی کے اعتبار سے اس قدر توانا اور پر اثر ہیں کہ ترجمہ نہیں بلکہ اصل تخلیق معلوم ہوتے ہیں۔ ایک مکڑا اور مکھی' ایک پہاڑ اور گلہری' ایک گائے اور بکری' بچے کی دعا' ہمدردی' ماں کا خواب' پیام صبح' عشق اور موت اور رخصت اے بزم جہاں' اقبال کے اہم منظوم تراجم ہیں۔ ان میں بیشتر نظمیں بچوں کے ادب کا حصہ ہیں۔

ابتدائی دور میں اقبال نے قومی اور ملکی موضوعات پر بھی خوبصورت نظمیں لکھیں۔ جیسے ہمالہ' نیا شوالہ' تصویر درد' ترانہ ہندی اور ہندوستانی بچوں کا قومی گیت وغیرہ۔ ان نظموں میں حب الوطنی' قوم پرستی اور اتحاد و یکجہتی کے جذبے کو ابھارا گیا ہے۔ بعد کے دور میں اقبال نے ایسی نظمیں لکھیں جن میں قومیت کے بجائے عالمی امت اسلامیہ پر اصرار کیا گیا ہے۔ ان نظموں میں ملی اور بین الاقوامی مسائل اور زندگی کے حقائق پر فکر انگیز اور بصیرت افروز اشارے ملتے ہیں۔ ذوق و شوق' شکوہ' جواب شکوہ' خضر راہ' طلوع اسلام' مسجد قرطبہ' ابلیس کی مجلس شوریٰ اور ساقی نامہ اقبال کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں اقبال نے اپنے خاص فلسفیانہ خیالات اور نصب العین کی ترسیل کی ہے۔

اقبال ایک عہد آفریں شاعر تھے۔ خیالی محبوب مصنوعی عشق بازی اور فرضی بادہ و ساغر کے مضامین کے بجائے انھوں نے اسرار حیات کی پردہ کشی اور عالمی سیاست کے مسائل نیز تہذیب حاضر کی خود فریبیوں کو اس خوبی سے شاعری کا حصہ بنایا کہ اردو شاعری بالخصوص نظم کے موضوعات ہی بدل گئے۔ انھوں نے اردو نظم کو بین الاقوامی معیار عطا کیا۔

اقبال کے معاصرین میں نادر علی خاں عباسی کاکوری ایک منفرد نظم نگار شاعر تھے۔ انہوں نے انگریزی زبان و ادب کا اچھا مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے کئی انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کیے۔ ان میں حسب ذیل ہیں۔ گھنٹہ نہیں بجے گا' گزرے زمانے کی یاد' آنسو' شاعر کا دل' مرحومہ کی یاد میں' حسن کامل اور خواب نوشین وغیرہ۔ یہ ترجمے نہایت دلکش اور بلند پایہ ہیں۔ نادر نے ان ترجموں میں اس قدر صفائی اور روانی پیدا کی ہے کہ ترجمے پر طبع زاد تخلیق کا گمان ہوتا ہے۔ انگریزی نظموں کے ترجمے کے ذریعے نادر نے مغربی شاعری کے لطیف مذاق کو اردو میں روشناس کرنے کی کوشش کی' نادر نے متعدد طبع زاد نظمیں بھی لکھیں ان کی طبع زاد نظموں پر بھی انگریزی شاعری کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔

اردو نظم کو نئی شناخت بخشنے والوں میں پنڈت برج نرائن چکبست کا نام اہم ہے۔ چکبست ایک قوم پرست اور محب وطن شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے اہل ہند کو مادر وطن کی عظمت کی یاد دلائی اور ملک کی عزت و ناموس کے تحفظ کے لیے جان قربان کرنے پر آمادہ کیا۔ ''خاک ہند'' ان کی مشہور نظم ہے جس میں ہندوستان کی عظمت کا بیان نہایت جوش اور عقیدت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسن ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوج عزوشاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

چکبست نے ہندو مسلم اتحاد اور حب الوطنی سے متعلق اتنی پرزور تخلیقات پیش کی ہیں کہ اردو شاعری میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ قومی رہنماؤں کی اسیری یا وفات پر انہوں نے بڑی پر اثر نظمیں لکھی ہیں۔ گوکھلے اور تلک پر ان کی تعزیتی نظمیں رثائی اور حزنیہ عناصر سے معمور ہیں۔ انہوں نے مذہبی اور اخلاقی اصلاح سے متعلق نظمیں بھی لکھیں۔ ''مرقع عبرت'' اور ''آب انگور'' ان کی اہم اصلاحی نظمیں ہیں۔ وہ رامائن کا

کے موضوع پر طبع آزمائی کی جاسکتی ہے۔ گیت میں محبت اور نغمگی کے عناصر کی آمیزش ہوتی ہے اور اس کا مزاج ان عناصر سے تشکیل پاتا ہے جن میں نسائیت ہوتی ہے۔ غنائیت' گیت کے لیے لازمی ہے اور ترنم' جھنکار اور تھاپ اس کی خصوصیات ہیں۔ اس کا اپنا ایک تہذیبی مزاج ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ پڑھنے کی نہیں سننے کی چیز ہے۔ یہی سبب ہے کہ نظموں کے مقابلہ میں گیت گائے زیادہ جاتے ہیں۔ پروفیسر مسعود حسین خان کا یہ گیت دیکھیے:

چاند ستارو جاؤ
میرا سویرا لاؤ

رات کے اس کالے آنچل سے
رتنوں کے اس شیش محل سے
ڈھونڈ کے لاؤ مت شرماؤ

جاؤ ستارو جاؤ
میرا سویرا لاؤ

چاند سے بھی کہہ دینا دیکھے
لیکن تم آنا سنگ لے کے
رات گوڑی لاکھ چھپائے
آنچل دھیرے سے سرکاؤ

جاؤ ستارو جاؤ
میرا سویرا لاؤ

17.3.2 دوہا

دوہا بھی ہندی شاعری کی ممتاز اور مقبول صنف ہے جو زمانہ قدیم سے تا حال اعتبار رکھتی ہے۔ اس کا آغاز ساتویں اور آٹھویں صدی کا زمانہ بتایا جاتا ہے۔ دوہرا اور دوپدا اس کے دوسرے نام ہیں۔ دوہے کے دونوں مصرعے مقفیٰ ہوتے ہیں۔ اپ بھرنش میں قافیہ کا رواج دوہے سے شروع ہوا' ورنہ اس سے پہلے سنسکرت اور پراکرت میں قافیہ نہیں تھا۔ دوہا' دو مصرعوں کی اپنی مختصر ترین ہیئت کی وجہ سے انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ مختصر ہیئت کے باعث اس میں الفاظ اور ان کی نشست برمحل ہونی چاہیے۔ اسی طرح مضمون میں بھی دلکشی اور ندرت ضروری ہے ورنہ دوہے میں تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ دوہے میں لے کی بھی اہمیت ہے۔ معنوی تہہ داری اور برجستہ کلامی سے دوہے میں بانکپن پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح ایک عمر کی مشق و مزاولت کے بعد رباعی پر قدرت حاصل ہوتی ہے اچھے اور فنی طور پر کامیاب دوہے' مشاق اور زبان و بیان اور فن پر قدرت رکھنے والے شاعر ہی کہہ سکتے ہیں۔ اردو میں دوہا نگاری میں فی زمانہ جو نام ملتے ہیں ان میں سے چند ہیں: جمیل الدین عالی' ندا فاضلی' بھگوان داس اعجاز' اور پرتو روہیلہ۔ ندا فاضلی کے دو' دوہے درج ذیل ہیں:

سیدھا سادھا ڈاکیہ' جادو کرے مہان ..... ایک ہی تھیلے میں بھرے' آنسو اور مسکان
برکھا سب کو دان دے جس کی جتنی پیاس ..... موتی سی یہ سیپ میں' مٹی میں یہ گھاس

17.3.3 ماہیا

ماہیا' پنجابی شاعری کی صنف اور پنجابی تہذیب کا حصہ ہے۔ ''ماہیے'' بھی گائے جاتے ہیں۔ اس کا صحیح عمل دو اوزان پر مشتمل ہے جو یہ ہیں:

1- فعلن فعلن فعلن / فعلن فعلن فع / فعلن فعلن فعلن
2. مفعول مفاعیلن / فعل مفاعیلن / مفعول مفاعیلن

دوسرے مصرعے میں ایک سبب کم ہوتا ہے۔ اگر تینوں مصرعے برابر ہو جائیں تو پھر ثلاثی ہو جائے گا۔ اردو میں ماہیوں کی روایت 1939ء سے ملتی ہے۔ ہمت رائے شرما' ساحر لدھیانوی' قمر جلال آبادی ابتدائی ماہیہ نگار ہیں۔ قمر ساحری' نذیر فتح پوری' ناوک حمزہ پوری' قمر ساحری' شاہد ناز اور افضل

عاقل نے ادھر خوب ماہیے لکھے ہیں۔ ذیل کے تین ماہیے ملاحظہ ہوں۔

دل لے کے دغا دیں گے
یار ہیں مطلب کے
یہ دیں گے تو کیا دیں گے

(ساحر لدھیانوی)

بارود پہ بیٹھی ہے
میرے زمانے کی
یہ فاختہ کیسی ہے

(نذیر فتح پوری)

وہ دور ہراساں ہے
آپ نہیں حضرت
ہر شخص پریشاں ہے

(قمر ساحری)

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ہندوستان کی دیگر زبانوں سے اردو میں کون سی ہیئتیں اختیار کی گئی ہیں؟
2. دوہے کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ لکھیے۔
3. ماہیہ کیا ہے؟ مثال دیتے ہوئے لکھیے۔

17.4 بیرونی زبانوں کی ہیئتیں

اردو نے اپنے لچکدار رویے کے باعث ہندوستانی زبانوں ہی سے نہیں بیرونی ملک کی زبانوں سے بھی الفاظ، اصناف، اسالیب اور آداب کے تعلق سے لین دین کیا ہے جس سے اردو کے شعری سرمایہ میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ یہ بھی درست کہ بیشتر بیرونی ہیئتوں نے اردو میں اعتبار نہیں پایا لیکن یہ کوشش محض رائیگاں بھی نہیں گئیں اردو کا شعری منظر نامہ بھرپور، منور اور معطر ضرور ہوا۔ آیئے ہم اردو میں ایسی بیرونی ہیئتوں کا بھی جائزہ لیں۔

17.4.1 معریٰ نظم

معریٰ نظم ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں وزن بھی ہوتا ہے اور ارکانِ بحر کی پابندی بھی کی جاتی ہے۔ البتہ اس میں قافیہ اور ردیف سے کام نہیں لیا جاتا۔ چونکہ یہ قافیے سے عاری ہوتی ہے اس لیے ابتداً اس کو غیر مقفّع کہا گیا لیکن بعد میں معریٰ نظم کی اصطلاح کو سب نے تسلیم کرلیا۔ اردو میں پہلی بار 1875ء میں لاہور میں انجمن اسلام کے جلسے میں ایسا مشاعرہ منعقد ہوا جس میں طرح مصرعہ دینے کی بجائے موضوع دیا گیا اور قافیہ ردیف کی تحدید ختم کردی گئی۔ اردو میں معریٰ شاعری کا پہلا نمونہ مولانا محمد حسین آزاد کے یہاں ملتا ہے۔ بعد میں ترقی پسند شاعروں نے بھی ردیف اور قافیوں کا استعمال ترک کیا اور معریٰ نظمیں بھی کہنے لگے۔ اور پھر تو یہ ایک مزاج، ایک رواج سا بن گیا۔ اردو میں معریٰ نظم کا سرمایہ اتنا وافر نہ سہی لیکن خاطر خواہ ضرور ہے اور ہمارے ممتاز اور صف اول کے شاعروں نے بھی اس ہیئت کو اختیار کیا۔ اختر الایمان کی یہ نظم ''کل کی بات'' ملاحظہ ہو:

ایسے بیٹھے تھے ادھر بھیا تھے دائیں جانب — ان کے نزدیک بڑی آپا شبانہ کو لیے
اپنی سسرال کے کچھ قصے، لطیفے، باتیں — یوں سناتی تھیں ہنسے پڑتے تھے سب

اقبال کے ہم عصر شعرا میں نادر علی خاں عباسی کاکوری بھی ایک اہم نظم نگار شاعر تھے۔ انھوں نے طبع زاد نظمیں بھی لکھیں اور کئی انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ ان کے ترجمے نہایت دل کش، رواں اور بلند پایہ ہیں۔ گھنٹہ نہیں بجے گا، گزرے زمانے کی یاد، آنسو، شاعر کا دل اور حسن کامل وغیرہ ان کے اہم ترجمے ہیں۔

اردو نظم کو نئی شناخت دینے میں پنڈت برج نرائن چکبست کا اہم حصہ ہے۔ چکبست ایک قوم پرست اور محبِ وطن شاعر تھے انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ ہندو مسلم اتحاد، سیاسی شعور اور قومی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ خاکِ ہند، مرقع عبرت اور رامائن کا ایک سین، ان کی اہم نظمیں ہیں۔ اس دور میں نوبت رائے نظر بھی ایک کامیاب نظم نگار شاعر تھے۔ انھوں نے بعض انگریزی نظموں کو اردو کا جامہ پہنایا، تیغ ہندی، وطن دوستی اور سیتاجی ان کی یادگار نظمیں ہیں۔ اسی عہد میں سورج نرائن مہر نے بھی نظم نگاری کی طرف خاص توجہ دی۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر طبع زاد نظمیں بھی لکھیں اور انگریزی نظموں کے منظوم اردو ترجمے بھی کیے۔ اردو نظم کو نئے ہیئتی اور عروضی تجربوں سے مالا مال کرنے والوں میں مولوی عبدالحلیم شرر نہایت اہم مقام کے حامل ہیں۔ انھوں نے اردو میں نظم معریٰ کو رائج کرنے کی باقاعدہ تحریک چلائی۔ انھوں نے فلورانڈا اور مظلوم ورجینا کے نام سے دو ڈرامے لکھے جو نظم معریٰ کی ہیئت میں ہیں۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں اور علی گڑھ تحریک کے بعد رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے دور میں بھی اردو نظم کے ارتقا کا سفر جاری رہا اور اب مابعد جدیدیت دور میں بھی اردو نظم کی روایت نئے امکانات اور نئی جہتوں کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔

16.8 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے۔

1. نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔
2. اردو نظم کے فروغ میں انجمن پنجاب کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
3. ''اقبال نے اردو نظم کو فکر و فلسفے سے روشناس کیا'' اس بیان پر تبصرہ کیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. میر اور سودا کی نظم نگاری پر روشنی ڈالیے۔
2. نظم طباطبائی کی نظم نگاری پر تبصرہ کیجیے۔
3. سرور جہاں آبادی کی نظموں کے موضوعات کا جائزہ لیجیے۔

16.9 فرہنگ

الفاظ	= معنی	الفاظ	= معنی	الفاظ	= معنی
بسیط	= کشادہ۔ وسیع	بوقلمونی	= رنگا رنگ کیفیت	بصیرت افروز	= عقل کو روشن کرنے والی
بادہ	= شراب	بسمل	= مجروح۔ زخمی۔ مراداً عاشق	ابتذال	= بیہودگی۔ ناشائستگی
انحطاط	= نیچے اترنا۔ زوال	اساسی	= بنیادی	اولوالعزمی	= بہادری۔ بلند حوصلگی
اتمام حجت	= حجت پوری کرنا	انحراف	= پھر جانا۔ حکم عدولی کرنا	ابلاغ	= پہنچانا۔ بھیجنا
ترسیل	= روانہ کرنا۔ بھیجنا۔ نامہ بھیجنا	منہا کرنا	= تفریق کرنا	متنوع	= طرح طرح اور قسم قسم کا
ابعاد	= بُعد کی جمع دوری۔ پہلو	قبا	= پوشاک	ساغر	= پیالہ۔ جام

سدراہ = راستے کی رکاوٹ　　مطمح نظر = مرکز نظر، مقصد　　ملکوتی = فرشتوں کا

موانست = باہم دوستی کرنا　　ناموس = عصمت ۔عفت　　یدطولیٰ = مہارت ۔کمال

غنائیت = نغمگی ۔موسیقیت　　سوقیت = بازاری پن ۔ بدتہذیبی　　پرضیا = روشن ۔پُر نور

چراغ کشتہ = بجھا ہوا چراغ　　ثقہ = معتبر ۔جس پر بھروسہ کیا جاسکے

گل سرسبد = سب سے بڑا اور سب سے اچھا پھول جو ٹوکری میں سب سے اوپر رکھا جاتا ہے ۔ پھکڑ باز = بیہودہ گفتگو کرنے والا

مگس = مکھی ۔شہد کی مکھی

16.10 سفارش کردہ کتابیں

1. ڈاکٹر جمیل جالبی　　تاریخ ادب اردو جلد دوم ۔ دہلی 2000ء
2. پروفیسر سیدہ جعفر　　تاریخ ادب اردو ۔عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک ۔ حیدرآباد 2002
3. ڈاکٹر حنیف کیفی　　اردو میں معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947ء تک) ۔ دہلی 1982ء
4. پروفیسر سید احتشام حسین　　عکس اور آئینے ۔لکھنو 1962
5. ڈاکٹر انور سدید　　اردو ادب کی تحریکیں ۔ کراچی 1985
6. ڈاکٹر منظر اعظمی　　اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ ۔لکھنو 1996

اکائی 17 : نظم کی مختلف ہیئتیں

ساخت

17.1 تمہید

17.2 اردو کی عام ہیئتیں

17.2.1 پابند نظم

17.2.2 مثنوی

17.2.3 رباعی

17.3.4 قطعہ

17.3.5 ثلاثی

17.3 ہندوستانی زبانوں کی ہیئتیں

17.3.1 گیت

17.3.2 دوہا

17.3.3 ماہیہ

17.4 بیرونی زبانوں کی ہیئتیں

17.4.1 معریٰ نظم

17.4.2 آزاد نظم

17.4.3 سانیٹ

17.4.4 ترائیلے

17.4.5 ہائیکو

17.4.6 نثری شاعری

17.5 خلاصہ

17.6 نمونہ امتحانی سوالات

17.7 فرہنگ

17.8 سفارش کردہ کتابیں

17.1 تمہید

اس اکائی میں ہم آپ کو اردو نظم کی مختلف ہیئتوں سے واقف کرائیں گے۔ اردو میں زیادہ تر ہیئتیں فارسی سے لی گئی ہیں۔ کہیں کہیں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ اب وہ اردو ہی کی ہیئتیں متصور کی جاتی ہیں۔ ہندوستان کی دیگر زبانوں اور بیرونی ممالک کی زبانوں سے بھی اردو نے کئی ہیئتیں لی ہیں ہم ان ہیئتوں کی وضاحت کریں گے' ان کی مثالیں دی جائیں گی اور اس اکائی کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔ بطور نمونہ' امتحانی سوالات بھی درج کیے گئے ہیں۔ اپنی معلومات کی جانچ کا موقع بھی فراہم کیا گیا ہے۔ فرہنگ کے تحت نئے الفاظ کے معنی دیے گئے ہیں اور آپ کے مزید مطالعہ کے لیے سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی دی جارہی ہے۔ توقع ہے ان سب سے استفادہ کیا جائے گا۔

17.2 اردو کی عام ہیئتیں

اردو شاعری پر فارسی شاعری کے اثرات ہیں۔ اردو نے فارسی شاعری سے کئی ہیئتوں کو من وعن لے لیا ہے۔ رباعی، قطعہ، مثنوی اور پابند نظم وغیرہ۔ ہمارے شاعروں نے ان ہیئتوں میں اپنے طور پر کہیں کہیں تبدیلی ضروری کر لی ہے، جیسے قطعات میں اپنے ذوق و ذہن کے مطابق تھوڑی بہت تبدیلی سے کام لیا گیا ہے تو رباعی کے چوبیس اوزان اپنی جگہ۔ بعض شاعروں اور ایسے ویسے شاعروں کی نہیں غالب اور اقبال کی بعض رباعیاں متنازعہ فیہ ہیں کہ ان کو رباعی کہا جائے یا نہیں۔ بہر کیف ان ہیئتوں کے بارے میں علحدہ علحدہ اختصار کے ساتھ لیکن جامع انداز میں گفتگو کی جائے گی۔ یہاں ایک بات کی صراحت ضروری ہے۔ ہمارا موضوع یہاں تکنکی ہیئتیں ہیں، موضوعی ہیئتیں نہیں۔ قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ موضوعی ہیئتیں ہیں۔ ان کا تکنک سے تعلق نہیں۔ جیسے مرثیہ: مرثیہ روایتی طور پر مسدس کی صنف سے وابستہ ہو چکا ہے لیکن غالب، حالی اور اقبال وغیرہ نے غزل اور پابند نظم کی صورت میں مراثی کہے ہیں۔ یہی حال قصیدے کا بھی ہے۔ ایک اور بات یہ کہ اردو میں کئی تکنکی ہیئتیں ہیں، مستزاد اور ترجیع بند وغیرہ۔ چونکہ ان کا رواج فی زمانہ کم ہے اس لیے ان سے صرف نظر کیا گیا ہے۔ تو آیئے اب ہم مروجہ ہیئتوں کے بارے میں گفتگو کریں۔

17.2.1 پابند نظم

پابند نظم اس نظم کو کہتے ہیں جس میں ردیف، قافیہ اور بحر کے مقررہ اوزان کی پابندی کی جاتی ہے۔ پابند نظم میں نہ موضوعات کی قید ہوتی ہے اور نہ اشعار کی تعداد کی۔ شاعر کسی بھی موضوع پر اور کتنی ہی تعداد میں اشعار کہہ سکتا ہے۔ بعض شاعروں نے چار چھ اشعار پر مشتمل پابند نظمیں بھی کہی ہیں۔ اردو شاعری کا بڑا حصہ پابند نظموں پر مشتمل ہے۔ ابتدا سے لے کر تا حال تقریباً تمام شاعروں نے پابند نظم نگاری کی ہے اور آج بھی آزاد اور معریٰ نظموں کے باوجود پابند نظم نگاری ہی زیادہ ہے۔ ہم یہاں جوش ملیح آبادی کی ایک پابند نظم ''بدلی کا چاند'' درج کر رہے ہیں۔

خورشید وہ دیکھو ڈوب گیا، ظلمت کے نشان لہرانے لگے
مہتاب وہ ہلکے بادل سے چاندی کے ورق برسانے لگا

وہ سانولے پن پر میداں کے، ہلکی سی صباحت دوڑ چلی
تھوڑا سا ابھر کر بادل سے، وہ چاند جبیں جھلکانے لگا

لو ڈوب گیا پھر بادل میں، بادل میں وہ خط سے دوڑ گئے
تو پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں، ظلمت کا قدم تھرانے لگا

بادل میں چھپا تو کھول دیئے، بادل میں دریچے ہیرے کے
گردوں پر جو آیا، تو گردوں، دریا کی طرح لہرانے لگا

سمٹی جو گھٹا، تاریکی میں چاندی کے سفینے لے کے چلا
سنکی جو ہوا، تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا

غرقوں سے جھانکا گردوں کے، امواج کی نبضیں تیز ہوئیں
حلقوں میں جو دوڑا بادل کے، کہسار کا سر چکرانے لگا

پردہ جو اٹھایا بادل کا، دریا پہ تبسم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی، میدان کا دل گھبرانے لگا

ابھرا تو تجلی دوڑ گئی، ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
الجھا تو سیاہی دوڑا دی، سلجھا تو ضیا برسانے لگا

کیا کاوش نور و ظلمت ہے، کیا قید ہے، کیا آزادی ہے
انسان کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

17.2.2 مثنوی

مثنوی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے لغوی طور پر مراد ہے دو جز والی چیز..... شاعری میں مثنوی ایسی نظم کو کہتے ہیں، جس کے اشعار ہم وزن ہوں لیکن قافیہ اور ردیف کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا ہوں۔ مثنوی کے اشعار معنوی طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ یہ ایک مقبول صنف ہے۔ اس میں کوئی طویل قصہ، مناظر قدرت کا بیان، رزم و بزم کی کیفیت، موسموں کا بیان اور سیاسی و معاشرتی حالات نظم کیے جاتے ہیں۔ مثنوی میں اشعار کی تعداد معین نہیں ہوتی۔ کئی ہزار اشعار پر بھی مثنویاں مشتمل ہیں۔ اپنی انہی خصوصیات کی وجہ سے حالی نے مثنوی کو دیگر اصناف سخن پر ترجیح دی ہے۔ دیا شنکر نسیم، میر حسن اور مرزا شوق ہمارے معروف ترین مثنوی نگار ہیں۔ ظاہر ہے یہاں مکمل مثنوی درج کرنے کی گنجائش نہیں۔ میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' کے آغاز داستان کے اشعار یہاں پر پیش کیے جاتے ہیں:

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ — کہ تھا وہ شہنشاہِ گیتی پناہ
کسی طرح کا وہ نہ رکھتا تھا غم — مگر ایک اولاد کا تھا الم
اسی بات کا اس کے دل پہ تھا داغ — نہ رکھتا تھا وہ اپنے گھر کا چراغ
وزیروں کو اک روز اس نے بلا — جو کچھ دل کا احوال تھا ' سو کہا
کہ میں کیا کروں گا یہ مال و متاع — فقیری کا ہے میرے دل کو خیال
فقیر اب نہ ہوں تو کروں کیا علاج — نہ پیدا ہوا وارث تخت و تاج
جوانی تو میری گئی اب گزر — نمودار پیری ہوئی سر بسر
بہت ملک پر جان کھویا کیا — بہت فکر دنیا میں رویا کیا
وزیروں نے کی عرض ' اے آفتاب — نہ ہو تجھ کو ذرہ کبھی اضطراب
مگر ہاں یہ اولاد کا ہے جو غم — سو اس کا تردد بھی کرتے ہیں ہم
عجب کیا کہ ہووے تمہارے خلف — کرو تم نہ اوقات اپنی تلف

17.2.3 رباعی

ربع' عربی میں چار کو کہتے ہیں۔شاعری کی اصطلاح میں رباعی ایسی صنف کو کہتے ہیں جس میں چار مصرعے ہوں اور ان چار مصرعوں میں فکر و خیال کے لحاظ سے ایک مکمل مضمون ادا کیا جائے۔رباعی میں پہلا' دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتے ہیں اور تیسرا مصرعہ بے قافیہ۔رباعی کا چوتھا مصرعہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔اس کو پہلے تین مصرعوں کا نچوڑ کہیے۔شاعر رباعی میں جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ دراصل اختصار کے ساتھ چوتھے مصرعے میں کہہ دیتا ہے۔اس میں ہر طرح کے لیکن زیادہ تر اخلاقی اور مذہبی مضامین نظم کیے جاتے ہیں۔رباعی کو دوبیتی یا ترانہ بھی کہتے ہیں۔انیس' دبیر' حالی' اکبر' امجد' جوش' یگانہ اور فراق کی رباعیاں زیادہ مشہور ہیں۔ہم یہاں انیس اور امجد کی ایک ایک رباعی پیش کر رہے ہیں۔

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے — بلبل کی زبان پر گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا — جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے
(انیس)

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے — مانندِ حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات پر فخر خسیس — تنکا بھی تھوڑی سی ہوا سے اڑ جاتا ہے
(امجد)

17.2.4 قطعہ

قطعہ کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں۔اصطلاح شعر میں قطعہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں ایک خیال یا واقعہ دو یا اس سے زاید اشعار میں موزوں کیا گیا ہو۔اس کے قافیے کا تعین پہلے شعر کے دوسرے مصرعے سے ہوتا ہے۔یعنی بعد کے تمام اشعار کے دوسرے مصرعے پہلے شعر کے دوسرے مصرعے کے ہم قافیہ ہوں گے۔غزل میں سوائے مطلع کے تمام اشعار کی یہی ہیئت ہوتی ہے۔غزل سے یہ یوں مختلف ہوتا ہے کہ غزل کا ہر شعر علحدہ علحدہ موضوع و مفہوم رکھتا ہے جب کہ قطعہ متحد المعنی ہوتا ہے۔یعنی قطعہ میں صرف ایک ہی موضوع یا خیال ہوتا ہے اور نظم کی طرح مسلسل ہوتا ہے۔قطعہ الگ بھی کیا جا سکتا ہے اور کسی غزل کا ایک حصہ بھی ہو سکتا ہے۔یہاں میر اور فیض کا ایک ایک قطعہ ملاحظہ ہو:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کردیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

(میر تقی میر)

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زبان پہ مہر بھی کردی تو کیا کہ رکھ دی ہے ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

17.2.5 ثلاثی

ثلاثی کو مثلث اور تثلیث بھی کہا گیا ہے۔ یہ تین مصرعوں پر مشتمل صنف سخن ہے جس کے تینوں مصرعے برابر ہوتے ہیں۔ البتہ کبھی پہلا اور دوسرا، کبھی پہلا اور تیسرا اور کبھی تینوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور یہ تینوں مصرعے مل کر ایک اکائی بنتے اور مثلث کہلاتے ہیں۔ یہ اکائی ایک مکمل معنوی نظام کی حامل ہوتی ہے اور کئی تین مصرعوں کی اکائیاں مل کر بھی مثلث کہلاتی ہیں۔ اردو میں ثلاثی ایک با قاعدہ فنی ہئیت کی حیثیت سے مقبول رہی ہے۔ حمایت علی شاعر، اجتبیٰ رضوی اور مشتاق جاوید وغیرہ کے ثلاثی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

مشتاق جاوید کے یہ دو ثلاثی دیکھیے:

جلتا ہوا صحرا ہے کس طرح بھلا کھلتا
اب صحن گلستاں میں مفلس کی صداؤں سے
سبزہ ہے نہ سایہ ہے مغرور کا دروازہ

اپنی معلومات کی جانچ

1. اردو نظم کی چند عام ہیئتوں کے نام لکھیے۔
2. پابند نظم یا رباعی کی تعریف کیجیے۔
3. ثلاثی سے کیا مراد ہے؟ لکھیے۔

17.3 ہندوستانی زبانوں کی ہیئتیں

اردو لسانی طور پر ہی نہیں، شعری اور ادبی طور پر بھی کافی لچکدار زبان ہے۔ اس میں اخذ و اکتساب اور رد و قبول کی صلاحیتیں زیادہ ہیں۔ چنانچہ اردو میں جہاں ملک کی دیگر زبانوں کے حروف اور الفاظ وغیرہ ملتے ہیں دیگر زبانوں کی ہیئتوں کو بھی ہم نے فراخدلی کے ساتھ اپنا لیا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ ان میں ہمارے شاعروں نے نمایاں مرتبت بھی حاصل کرلی ہے۔ ہندی سے گیت اور دوہا اور پنجابی سے ماہیہ جیسی ہیئتوں نے اردو میں مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ ہم یہاں ان اصناف پر اظہار خیال کریں گے۔

17.3.1 گیت

گیت ہندی الاصل صنف شاعری ہے۔ اردو پر ہندی کے جو اثرات ترتیب پائے ہیں اس کا ایک نتیجہ گیت بھی ہے جس کو اردو میں بخایت مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ اردو میں گیت ہندی بحروں ہی میں لکھے جاتے ہیں۔ نظم کی طرح گیت میں کسی موضوع کی کوئی پابندی نہیں۔ اس میں ہر نوع

منظوم ترجمہ کرنا چاہتے تھے لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ ''رامائن کا ایک سین'' چکبست کی معرکتہ الآرا نظم ہے جس میں انھوں نے رام چندر جی کی بن باس کو روانگی کی کیفیت بیان کی ہے۔ چکبست کی نظموں میں انقلابیت اور ترقی پسندی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ انھوں نے اپنی نظم نگاری کو سیاسی شعور کی بیداری کا ترانہ بنایا۔

جب اردو کی فضا میں غزل کا نغمہ گونج رہا تھا اور نظم کی طرف شعرا کا التفات کم تھا' سورج نرائن مہر نے نہ صرف طبع زاد نظمیں لکھیں بلکہ انگریزی نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا۔ یہ نظمیں زیادہ تر لفظی ترجمے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں ہر مزاج کی نظمیں شامل ہیں جیسے اخلاق' فلسفہ' مزاح اور عشق وغیرہ۔ مہر کی طبع زاد نظموں کا ذخیرہ بھی کافی ضخیم ہے۔ ان کے یہاں دنیا بے زاری' ترک دنیا اور تمنائے مرگ کا اظہار ملتا ہے۔ مہر نے اپنی نظموں میں تصوف کے مضامین بھی بیان کیے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے سبق آموز نظمیں لکھیں۔

جدید اردو نظم کی ہئیت کو نئی سمت اور نئے راستوں سے آشنا کرنے میں مولوی عبدالحلیم شرر کا اہم حصہ ہے۔ اردو کی روایتی اصناف سخن میں تبدیلی لانے اور شاعری کو قافیے و ردیف کی پابندیوں سے آزاد کر کے اس میں ندرت اور تازگی پیدا کرنے کے لیے شرر نے بڑی کوشش کی۔ وہ مغرب کی شعری صنف نظم معرّیٰ (Blank verse) کو پسند کرتے تھے۔ اردو میں اس صنف کو رائج کرنے کے لیے انھوں نے باقاعدہ تحریک چلائی۔ شرر بہ حیثیت ناول نگار مشہور ہوئے لیکن وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھیں۔ شب وصل' شب غم' زمانہ اور اسلام' فلورنڈا (فتح اندلس) مظلوم ورجینا اور اسیر بابل ان کی اہم نظمیں ہیں۔ ان میں فلورانڈا اور مظلوم ورجینا ڈرامے ہیں جو نظم معرّیٰ کی ہئیت میں لکھے گئے ہیں۔ شرر کی نظموں میں مناظر قدرت اور انسانی جذبات کی دلکش ترجمانی ملتی ہے۔ شرر کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہئیت سے نیا کام لیا اور عروضی تجربے کیے۔

حالی اور ان کے معاصرین کے بعد بھی اردو نظم ارتقا پذیر رہی۔ مابعد دور میں اردو نظم کے فروغ و نشوونما میں مختلف افراد' تحریکوں اور رجحانات نے اہم حصہ لیا۔ انفرادی سطح پر نظم کی روایت کو آگے بڑھانے میں اقبال کا نام سب سے روشن اور نمایاں ہے۔ اقبال نے اردو نظم کو فکر و ذہن اور فلسفہ و دانش سے ہم کنار کیا۔ انھوں نے اپنی حکیمانہ شاعری کے ذریعہ اردو نظم کو بین الاقوامی معیار عطا کیا۔ اقبال کے بعد رومانی تحریک' ترقی پسند تحریک۔ اور حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ شعرا نے نظم کو اپنے فکر و فن کی جولان گاہ بنایا اور اسے نئی وسعتوں' نئے امکانات اور نئے موضوعات سے مالا مال کیا۔ اسی طرح جدیدیت اور مابعد جدیدیت دور میں بھی اردو نظم کی روایت کا تسلسل برقرار ہے۔ اردو نظم کی ہئیت میں متعدد تجربے کیے جا رہے ہیں اور ان کے ذریعہ نظم کے نئے ابعاد کی تلاش جاری ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. سرور جہاں آبادی کی نظموں کی اہم خصوصیات کیا ہیں؟
2. اقبال کی نظموں کے موضوعات پر روشنی ڈالیے۔
3. چکبست کی چند اہم نظموں کے نام بتائیے۔
4. اردو نظم کی تاریخ میں شرر کا اہم کارنامہ کیا ہے؟

16.7 خلاصہ

اٹھارویں صدی میں شمالی ہند میں اردو شاعری کا چرچا شروع ہوا تو شمالی ہند کے اولین اردو شعرا مثلاً میر جعفر زٹلی نے چند اردو نظمیں لکھیں۔ بعد کے دور میں فائز نے نظم نگاری کی طرف توجہ کی۔ تعریف بنگھٹ' وصف بھینگون اور تعریف جوگن وغیرہ ان کی قابل ذکر نظمیں ہیں۔ فائز کے ہم عصر شاہ مبارک آبرو نے بھی ایک نظم لکھی۔ اسی دور میں شاہ حاتم نے کئی نظمیں لکھیں جیسے حقہ' قہوہ اور نیرنگی زمانہ وغیرہ۔ ان نظموں میں حاتم نے مثنوی کے علاوہ مخمس کی ہئیت بھی استعمال کی۔

سودا و میر کے عہد میں بھی اردو نظم ارتقا پذیر رہی۔ سودا کی بعض مثنویاں' مخمس شہر آشوب اور ہجویں نظم کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔

اسی طرح میرؔ نے بھی بعض خوبصورت نظمیں لکھی ہیں جیسے موہنی بلی' درمیانِ مرغ بازاں' دربیان ہولی وغیرہ ۔نظیر اکبر آبادی اس دور کے سب سے بلند پایہ نظم نگار ہیں جنھوں نے مخمس ۔ مسدس اور ترکیب بند کی ہیئت میں بے مثال نظمیں لکھیں ۔نظیر نے اپنے گرد و پیش کی زندگی اور مقامی ماحول سے نظموں کے لیے مواد حاصل کیا ۔ ان کی نظمیں موسم کی کیفیات' تہواروں' عوامی مشاغل اور دیگر متنوع اور رنگا رنگ تجربات پر مبنی ہیں ۔ بنجارہ نامہ' آدمی نامہ' ہنس نامہ' تندرستی نامہ' ریچھ کا بچہ' ککڑی' تربوز' ہولی' بسنت' دیوالی' راکھی اور برسات وغیرہ انکی اہم نظمیں ہیں

اردو نظم کے ارتقا میں انجمن پنجاب کے موضوعاتی مشاعروں کی بڑی اہمیت ہے ۔ان مشاعروں میں مصرع طرح کے بجائے موضوعات دیئے جاتے تھے اور شاعروں سے ان موضوعات پر نظم لکھنے کی فرمائش کی جاتی تھی ۔ ڈاکٹر جی ۔ ڈبلیو لائٹز' کرنل ہالرائیڈ اور مولوی محمد حسین آزاد انجمن کے مشاعروں کے سرگرم عہدیدار تھے ۔ آزاد نے ان مشاعروں کے لیے جو نظمیں لکھیں ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں : صبح امید۔ حب وطن ۔ خواب امن ۔ دادانصاف ۔ ابر کرم ۔ زمستان وغیرہ ۔ ان نظموں میں خیالات کو حقائق اور واقعات کے مطابق پیش کیا گیا ہے ۔انجمن پنجاب کے مشاعروں میں مولانا حالؔی نے بھی شرکت کی اور بعض معرکتہ الآرا نظمیں پیش کیں ان میں نشاط امید' برکھارت' مناظرہ رحم و انصاف اور حب وطن شامل ہیں ۔

علی گڑھ تحریک اردو کی ایک اہم ادبی تحریک ہے ۔ اس تحریک کے دوران نظم نگاری کو کافی فروغ حاصل ہوا ۔علی گڑھ تحریک کے سب سے اہم شاعر حالی تھے ۔ انھوں نے سرسید کی فرمائش پر مسدس مدوجزر اسلام لکھا جسے حد درجہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ۔ چپ کی داد' مناجات بیوہ بھی ان کی اہم نظمیں ہیں ۔ حالی کی نظموں میں سماجی اصلاح کا جذبہ غالب ہے ۔ حالؔی کے معاصرین میں مولانا شبلی نعمانی بھی ایک قادر البیان شاعر تھے ۔ انھوں نے قومی' سیاسی' مذہبی اور اخلاقی نظمیں لکھیں ۔ اسی دور میں اکبر الہ آبادی نے طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے ذریعہ مغربی تہذیب کی خامیوں کو واضح کیا ۔ برق کلیسا' جلوہ دربار دہلی اور نظم قومی ان کی اہم نظمیں ہیں ۔ انھوں نے نظم معریٰ کا تجربہ بھی کیا۔ مولوی اسماعیل میرٹھی بھی اسی عہد کے بلند مرتبہ نظم نگار شاعر ہیں ۔ انھوں نے بچوں کے لیے خوب صورت نظمیں لکھیں ۔بعض انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا ۔صبح کی امید' پن چکی' ہماری گائے' جریدہ عبرت' شفق اور گرمی کا موسم وغیرہ ان کی اہم نظمیں ہیں ۔

میر علی حیدر نظم طباطبائی اس دور کے ایک باکمال نظم نگار شاعر تھے ۔جنھوں نے طبع زاد نظمیں بھی لکھیں اور انگریزی نظموں کا ترجمہ بھی کیا ۔ انھوں نے تھامس گرے کی نظم المیجی کا گورغریباں کے نام سے ترجمہ کیا جسے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ۔ انھوں نے نظم معرا کا بھی تجربہ کیا اور اس ہیئت میں ایک نظم لکھی ۔ وہ نظم معرا کو نثر مرجز سمجھتے تھے ۔

علی گڑھ تحریک نہایت دیرپا اور دوررس اثرات کی حامل رہی ۔ ترقی پسند تحریک آغاز (1936ء) تک اردو نظم علی گڑھ تحریک کے زیر اثر رہی ۔ اس اثنا میں متعدد نظم نگار شاعر ابھرے جنھوں نے نظم کو فکر وفن کی نئی جہتوں سے ہم کنار کیا ۔نظم نگاری میں علی گڑھ تحریک کی روایات کو آگے بڑھانے میں نوبت رائے نظرؔ کا اہم حصہ ہے ۔ نظرؔ کی نظموں میں مناظر فطرت کی دل کشی' حب الوطنی اور ہندوستان کی عظمت رفتہ کا احساس نظر آتا ہے ۔ درگا سہائے سرور جہاں آبادی نے بھی نظم نگاری کو نئے موضوعات اور نئے امکانات سے ہم کنار کیا ۔ ان کی نظموں میں ہندوستانی ماحول' رسوم وعقائد' ہندوستانی روایات اور ہندوستانی طرز فکر کی عکاسی نظر آتی ہے ۔ سرور کے موضوعات میں بڑا تنوع اور رنگا رنگی پائی جاتی ہے ۔ عروس برشگال' یاد طفلی اور بیر بہوٹی وغیرہ سرورؔ کی اہم نظمیں ہیں ۔ سرور نے ہندوستان کی بعض شخصیتوں پر نظمیں لکھیں جیسے ''پدمنی''، ''لکشمی جی' نور جہاں' لالہ لجپت رائے' سوامی رام تیرتھ وغیرہ ۔

اقبال اردو کے صف اول کے نظم نگار شاعر ہیں ۔ انھوں نے اردو نظم کو فکر اور موضوعات کی نئی دنیا سے روشناس کرایا ۔ ابتدائی زمانے میں اقبال نے قومی نظمیں لکھیں جن میں حب الوطنی قوم پرستی اور اتحاد و یکجہتی کی تاکید کی گئی ہے ۔ ہمالہ' نیا شوالہ' ترانہ ہندی' تصویر درد اور ہندوستانی بچوں کا قومی گیت وغیرہ اقبال کی نمائندہ قومی نظمیں ہیں ۔ بعد کے زمانے میں اقبال نے ایسی نظمیں لکھیں جن میں ملی اور بین الاقوامی مسائل اور زندگی کے حقائق پر فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ۔ ذوق وشوق' خضر راہ' طلوع اسلام' مسجد قرطبہ' ابلیس کی مجلس شوریٰ اور ساقی نامہ اقبال کی شاہ کار نظمیں ہیں جن میں ادبی لطف اور فلسفیانہ فکر کا حسین امتزاج نظر آتا ہے ۔ اقبال نے بعض انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے جن میں زیادہ تر بچوں کی نظمیں ہیں ۔ اقبال نے اردو نظم کو نہایت بلند معیار اور وقار عطا کیا ۔

سامنے اماں وہیں کھولے پٹاری اپنی
جھنجھلاتی تھیں کبھی طنز سے کچھ کہتی تھیں
وقفے وقفے سے کبھی دونوں میں چشمک ہوتی
منجھلی آپا کبھی آتی تھیں کبھی جاتی تھیں
کاغذات اپنی اراضی کے لیے بیٹھے تھے
اور اک آن میں محفل ہوئی درہم برہم
تقویت ذہن نے دی، ٹھہرو، نہیں خون نہیں

منھ بھرے پانی سے سمدھن کی انہی باتوں پر
ہم کو گھیرے ہوئے بیٹھی تھیں 'نعیمہ' شہناز
حسب معمول سنبھالے ہوئے خانہ داری
ہم سے دور ابا اسی کمرے کے اک کونے میں
یک بیک شور ہوا 'ملک نیا' ملک بنا
آنکھ جو کھولی تو دیکھا کہ زمیں لال ہے سب
پان کی پیک ہے یہ اماں نے تھوکی ہوگی

17.4.2 آزاد نظم

آزاد نظم بھی مغرب سے لی گئی ہئیت ہے اور اردو میں یہ ہئیت بے حد قبولیت رکھتی ہے۔ اس میں قافیہ ردیف کی پابندی نہیں ہوتی، بحر کی بھی تحدید نہیں لیکن ایسا نہیں کہ اس میں بحر نہیں ہوتی۔ بحر کے ارکان اور اس کے اوزان یا صوتی بندشوں کی پابندی ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ معریٰ نظم میں بحر کے مقررہ اوزان استعمال ہوتے ہیں یعنی اگر پہلے مصرعہ میں بحر کے چار ارکان استعمال ہوئے ہیں تو اس کی پابندی نظم کے ہر مصرعے میں ہوتی ہے جب کہ آزاد نظم میں ارکان بحر کی تعداد ہر مصرعے میں متعین نہیں ہوتی جس کی وجہ سے مصرعے چھوٹے بڑے ہو جاتے ہیں۔ فرض کیجیے کسی نظم کے پہلے مصرعے کی بحر میں چار بار فاعلن کی تکرار ہوئی ہے۔ نظم آزاد میں بعد کے مصرعوں میں کہیں ایک کہیں دو، کہیں تین، کہیں چار اور کہیں چھ بار فاعلن کا استعمال ہو سکتا ہے۔ مخدوم محی الدین کی نظم ''سناٹا''

کوئی دھڑکن
نہ کوئی چاپ
نہ سنچل
نہ کوئی موج
نہ ہلچل
نہ کسی سانس کی گرمی
نہ بدن
ایسے سناٹے میں اک آدھ تو پتا کھڑکے
کوئی پگھلا ہوا موتی
کوئی آنسو
کوئی دل
کچھ بھی نہیں
کتنی سنسان ہے یہ راہ گزر
کوئی رخسار تو چمکے، کوئی بجلی تو گرے

17.4.3 سانیٹ

سانیٹ مغرب میں غنائی داخلی شاعری کی ایک قدیم صنف ہے۔ یہ چودہ (14) مصرعوں کی ایک ایسی نظم ہے جس میں ایک بنیادی جذبہ یا خیال کو دو بندوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ پہلے بند میں آٹھ اور دوسرے بند میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ پہلے بند میں خیال کا پھیلاؤ ہوتا ہے اور دوسرے میں اس کی

تکمیل کی جاتی ہے۔ کہیں کہیں پہلا بند 12 مصرعوں پر اور دوسرا بند 2 مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے مگر کل مصرعوں کی تعداد 14 سے زیادہ نہیں ہوتی۔ سانیٹ میں قافیہ کی پابندی ہے لیکن یہاں تفصیل میں گئے بغیر یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ قافیوں کی یہ ترتیب بدلتی رہتی ہے۔ سانیٹ میں بحر کی پابندی نہیں لیکن اطالوی اور انگریزی شعرا نے خصوصاً ایسی بحریں استعمال کی ہیں جو نہ طویل ہیں اور نہ مختصر۔ کیونکہ چھوٹی بحروں میں خیال کا ارتقا دشوار ہو جاتا ہے تو طویل بحروں میں تعقید یا تکرار کے پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اردو میں عظمت اللہ خاں، اختر شیرانی، راشد اور میراجی وغیرہ نے اس طرف توجہ دی۔ عزیز تمنائی بھی اہم نام ہے جن کے سانیٹوں کا مجموعہ ''برگ نوخیز'' شائع ہو چکا ہے۔ ''برگ نوخیز'' میں ''ٹیگور'' کے زیر عنوان یہ سانیٹ شامل ہے:

سفید ریش مسافر نے گیت گائے تھے
سرائے دہر کے اک پر بہار گوشے میں
تصورات کے افسوں طراز سایے میں
بیک نگاہ فسانے کئی سنائے تھے
لرزتے ہاتھ میں مطرابِ شاخ گل لے کر
وفور شوق میں ساز حیات چھیڑا تھا
حریم ناز کا اک ایک راز کھولا تھا
پروئے سلک تخیل میں تابدار گہر

نہ جانے کونسی بستی کو چل دیا راہی
ابھی بہاروں کے ہونٹوں پہ اس کے نغمے ہیں
کلی کلی کے تبسم میں شوخ جلوے ہیں
چمن چمن ہے اسی کی صدائے صبح آگہی
سرائے دہر میں ہر ایک سمت گونجیں گے
سفید ریش مسافر کے سرمدی نغمے

17.4.4 ترائیلے

ترائیلے فرانسیسی شاعری کی مقبول صنف ہے۔ یہ ایک طرح کا بند ہے اور اس ایک ہی بند میں نظم مکمل ہو جاتی ہے۔ ترائیلے صرف آٹھ مصروں پر مشتمل نظم ہوتی ہے اور اس میں صرف دو قافیے استعمال ہوتے ہیں اور وہ بھی ایک خاص ترتیب سے۔ یہ ترتیب کچھ ایسی ہوتی ہے۔ الف، ب، الف الف الف، ب، الف، ب۔ اس ترتیب سے ہم قافیہ مصرعوں کی یہ صورت سامنے آتی ہے۔ پہلا، تیسرا، چوتھا، پانچواں، ساتواں / دوسرا، چھٹا، آٹھواں۔ اردو میں ترائیلے کو خاص مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ رؤف خیر کا یہ ترائیلہ ہے۔ ''پس و پیش'':

مجھے گھر لوٹ جانا چاہیے تھا
(مگر اب لوٹ کر بھی کیا کروں گا؟)
یہی نا، آب و دانہ چاہیے تھا
مجھے گھر لوٹ جانا چاہیے تھا
تھکن میں کچھ ٹھکانہ چاہیے تھا
کہیں سائے میں رک جایا کروں گا
مجھے گھر لوٹ جانا چاہیے تھا
(مگر اب لوٹ کر بھی کیا کروں گا؟)

17.4.5 ہائیکو

ہائیکو ایک قدیم جاپانی صنف ہے لیکن یہ اردو میں انگریزی کے توسط ہی سے آئی۔ یہ صرف تین مصرعوں پر مشتمل ہے اور شرط یہ ہے کہ تینوں مصرعوں کے جملہ 17 ارکان (Syllable) ہوں اور ان کی ترتیب 5+7+5 ہو۔ بعض نے ارکان کی ترتیب 5+8+4 بھی قرار دی ہے۔ اختصار کے باوجود ہائیکو میں ایسا لفظی پیکر پیش کیا جاتا ہے کہ دیکھی ہوئی یا محسوس کی ہوئی کوئی شئے نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ جہاں تک مواد اور موضوع کا تعلق ہے ہائیکو ابتدا ہی سے فطرت، مظاہر فطرت اور مشاہدہ فطرت سے جڑی ہوئی ہے۔ اردو میں علیم صبا نویدی، اظہر ادیب، محمد امین، بشیر سیفی اور نصیر احمد ناصر کے ہائیکو پڑھنے کو ملتے ہیں۔ علیم صبا نویدی کے دو ہائیکو پڑھیے:

روشنی میں سیاہیوں کا سفر
آسمانوں پر لاش سورج کی
وقت کے ہاتھ میں کھلا خنجر

آنگن آنگن خلوص کے چہرے
گھر کی دہلیز تک وفا کی بات
اور بازار میں غلط چہرے

17.4.6 نثری شاعری

نثری شاعری، انگریزی کی Prose Poetry کی تقلید ہے۔ نثری شاعری میں ردیف، قافیہ، وزن اور بحر کسی کی قید نہیں۔ ہاں ایک آہنگ ضروری ہے جس سے نثری شاعری پر رنگ آتا ہے۔ بعض اوقات غیر ارادی طور پر مصرعے اوزان کے تحت آجاتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں۔ باس شعریت اور غنائیت ضروری ہے اور یہ شاعر کے شعری رویے پر منحصر ہوتی ہے۔ اردو میں نثری شاعری پر یوں تو کئی نے توجہ دی لیکن علی، سجاد ظہیر اور خورشید الاسلام کے نام نمایاں ہیں جن کے مجموعے علی الترتیب ''کاسۂ روح''، ''پگھلا نیلم'' اور جستہ جستہ ہیں۔ علی اور خورشید الاسلام کی ایک ایک تخلیق دیکھیے:

ننگوں
اور بھوکوں کا
یہ انسانی کوڑا کرکٹ
سڑک پر
کس نے بکھیرا ہے؟

(علی)

اگر
انسان کی
آنکھ نہ ہوتی
تو کائنات اندھی ہوتی

(خورشید الاسلام)

اپنی معلومات کی جانچ:

1. بیرونی ممالک کی زبانوں سے لی گئی چند شعری ہیئتوں کے نام لکھیے۔
2. نثری شاعری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تحریر کیجیے۔
3. ہائیکو کس زبان کی ہیئت ہے؟ اس کے بارے میں لکھیے۔

17.5 خلاصہ

اردو شعر و ادب بالخصوص شاعری پر فارسی شعر و ادب کے اثرات نسبتاً زیادہ ہیں۔ اردو شاعری نے فارسی سے کئی ہیئتوں کو من و عن لے لیا ہے اور کسی میں تھوڑی بہت تبدیلی کر لی ہے۔ اردو کی شعری ہیئتوں میں غزل سے صرف نظر کر لیں تو پابند نظم کو اردو شاعری پر حاوی پائیں گے۔ پابند نظم میں ردیف، قافیہ اور بحر وغیرہ کی پابندی کی جاتی ہے لیکن اس میں موضوعات اور اشعار کی کوئی قید نہیں۔ مثنوی میں ہر شعر ہم وزن ہوتا ہے لیکن ہر شعر کے ردیف اور قافیے جدا جدا ہوتے ہیں۔ ہاں اشعار کا معنوی طور پر مربوط ہونا شرط ہے۔ طویل قصہ، مناظر قدرت کا بیان، رزم و بزم کی کیفیات اور رسم و رواج وغیرہ مثنوی کے موضوعات ہیں۔ رباعی میں چار مصرعے ہوتے ہیں جس میں ایک مکمل مضمون ادا کیا جاتا ہے۔ اس کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔ رباعی کے چوتھے مصرعے کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ اس میں پہلے تین مصرعوں کا نچوڑ پیش کیا جاتا ہے۔ رباعی میں زیادہ تر اخلاقی اور مذہبی مضامین ادا کیے جاتے ہیں۔ قطعہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں ایک خیال یا واقعہ دو یا اس سے زاید شعروں میں موزوں کیا گیا ہو۔ اس کے قافیہ کا تعین پہلے شعر کے دوسرے مصرعے سے ہوتا ہے۔ غزل سے یہ یوں مختلف ہوتا ہے کہ غزل کا ہر شعر علحدہ علحدہ مفہوم رکھتا ہے جب کہ قطعہ متحد المعنی ہوتا ہے۔ ثلاثی، تین مصرعوں پر مشتمل ہیئت شعری ہے۔ اس کے تینوں مصرعے برابر ہوتے ہیں۔ کبھی پہلا دوسرا، کبھی پہلا اور تیسرا کبھی تینوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور تینوں مل کر ایک معنوی اکائی ہوتے ہیں۔

یہ تو اردو کی اپنی ہیئتیں تھیں۔ اردو نے دیگر زبانوں سے بھی ہیئتیں لی ہیں۔ مثلاً ہندی سے گیت کی ہیئت لی گئی۔ اردو میں گیت، ہندی یا ہندی الاصل بحروں میں لکھے جاتے ہیں۔ اس میں موضوع کی کوئی قید نہیں۔ اس کے مزاج میں نسائیت ہے۔ اس میں محبت اور نغمگی کی آمیزش ہوتی ہے۔ اس کا ایک تہذیبی مزاج ہے اور یہ پڑھنے ہی نہیں سننے کی چیز ہے۔ دوہا بھی ہندی سے لی گئی ہیئت ہے۔ دوہا، دو مصرعوں کی اپنی مختصر ترین ہیئت کے باعث انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ اس میں الفاظ کے انتخاب اور ان کی نشست و برخاست کی اہمیت ہے۔ معنوی تہہ داری اور برجستہ کلامی سے بھی دوہے میں بانکپن آجاتا ہے۔ ماہیا پنجابی شاعری کی ہیئت اور پنجابی تہذیب کا حصہ ہے۔ اس کا صحیح عمل دو اوزان پر مشتمل ہوتا ہے اور دوسرے مصرعے میں ایک سبب کم ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح گائی جانے والی ہیئت ہے۔

یہ تو ہندوستانی زبانوں کی شعری ہیئتیں تھیں۔ ان کے علاوہ بیرونی ممالک کی زبانوں کی ہیئتوں کو بھی اردو میں اپنایا گیا ہے۔ جیسے معریٰ نظم، جس کے مصرعوں میں وزن بھی ہوتا ہے اور ارکان بحر کی پابندی بھی۔ البتہ اس میں قافیہ اور ردیف کی پابندی نہیں ہوتی جب کہ آزاد نظم میں نہ صرف یہ کہ ردیف اور قافیہ نہیں ہوتا بلکہ ان معنوں میں بحری پابندی بھی نہیں ہوتی۔ ارکان بحر کی تعداد معین نہ ہونے کی وجہ سے مصرعے چھوٹے بڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ آزاد نظم ہے۔ سانیٹ چودہ (14) مصرعوں کی ایسی نظم ہے جس میں ایک بنیادی خیال یا جذبہ کو دو بندوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ بالعموم پہلے بند میں آٹھ اور دوسرے بند میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ پہلے بند میں خیال کا پھیلاو اور دوسرے بند میں خیال کی تکمیل ہوتی ہے۔ ترائیلے فرانسیسی شاعری کی مقبول صنف ہے۔ یہ آٹھ مصرعوں پر مشتمل ایک طرح کا بند ہے اور اس میں صرف دو قافیے ایک خاص ترتیب سے ہوتے ہیں اور ہائیکو جو جاپانی صنف ہے لیکن انگریزی کے توسط سے اردو میں آئی، صرف تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں جملہ 17 سا لمے ہوتے ہیں۔ جن کی ترتیب کہیں 5+7+5 اور کہیں 5+8+4 ہے۔ اس میں اختصار کے باوجود مکمل لفظی پیکر پیش کیا جاتا ہے۔ نثری شاعری میں ردیف، قافیہ اور بحر کسی کی قید نہیں لیکن آہنگ ضروری ہے۔ اسی طرح اس میں مصرعوں اور موضوعات کی قید نہیں لیکن شعریت یا غنائیت سے کام لینا ہوگا۔ اسی سے نثری شاعری پر نکھار آتا ہے۔

17.6 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے۔

1. ہندی اور پنجابی کی جو ہیئتیں اردو میں رائج ہیں ان پر اظہار خیال کیجیے۔
2. اردو میں بیرونی ممالک کی ہیئتوں کے بارے میں لکھیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. اردو کی چند مروجہ ہیئتوں کے بارے میں اظہار خیال کیجیے۔
2. اردو میں دیگر زبانوں کی کون کون سی ہیئتیں رائج ہیں؟ لکھیے۔

17.7 فرہنگ

الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی
من وعن	=	حرف بہ حرف، جوں کا توں	اخذ واکتساب	=	کسی سے لے لینا حاصل کرنا	رد	=	انکار۔ واپس کرنا
مزاولت	=	کسی کام کو ہمیشہ کرنا	تحدید	=	پابندی	وافر	=	زیادہ
رائیگاں	=	بیکار						

17.8 سفارش کردہ کتابیں

1. علیم صبا نویدی — اردو شاعری میں نئے تجربے
2. عنوان چشتی — اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے
3. شمیم احمد — اصناف سخن اور شعری ہیئتیں

اکائی 18 : ترقی پسند تحریک اور نظم نگاری ۔

ساخت

18.1 تمہید

18.2 نظم نگاری..... ترقی پسند تحریک سے قبل

18.3 ترقی پسند تحریک اور نظم نگاری

18.3.1 وقتی اور ہنگامی موضوعات

18.3.2 حب الوطنی

18.3.3 انقلاب اور آزادئ وطن

18.4 نظم نگار شعرا

18.4.1 مخدوم محی الدین

18.4.2 علی سردار جعفری

18.4.3 کیفی اعظمی

18.4.4 ساحر لدھیانوی

18.4.5 اسرار الحق مجاز

18.4.6 فیض احمد فیض

18.4.7 اختر الایمان

18.4.8 جاں نثار اختر

18.4.9 احمد ندیم قاسمی

18.4.10 شاد عارفی

18.4.11 منیب الرحمٰن

18.4.12 ظہیر کاشمیری

18.5 خلاصہ

18.6 نمونہ امتحانی سوالات

18.7 فرہنگ

18.8 سفارش کردہ کتابیں

18.1 تمہید

ادب میں ترقی پسند تحریک ایک عالم گیر تحریک تھی ۔ بین الاقوامی حالات نے ترقی پسند تحریک کو فروغ دیا ۔ دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے

کیونکہ میراجی صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ نقاد بھی بہت اچھے تھے۔ حلقے کو زیادہ متحرک بنانے میں ان کی مختلف تجاویز نے بہت بڑا حصہ ادا کیا۔ میراجی نے حلقے میں شرکت کے فوری بعد یہ تجویز پیش کی کہ حلقے میں جو تخلیقات پیش کی جائیں اس کی صرف تعریف و تحسین ہی نہیں ہونی چاہیے بلکہ جو خامیاں اور کوتاہیاں ہوں ان کی بھی نشان دہی کرنی چاہیے۔ یہ تجویز بڑی موثر ثابت ہوئی اور حلقہ اس پر عمل پیرا ہوا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. حلقۂ ارباب ذوق کا قیام کب عمل میں آیا؟
2. حلقۂ ارباب ذوق کا پہلے کیا نام تھا؟
3. میراجی کی کس تجویز نے حلقۂ ارباب ذوق کو متاثر کیا؟

19.3 جدید نظم نگاری کا فروغ اور حلقۂ ارباب ذوق

حلقۂ ارباب ذوق نے میراجی کی سرکردگی میں نظم نگاری کو خاص طور پر فروغ دیا۔ جدید نظم اس وقت بہت مقبول ہو رہی تھی اور جدید نظموں کے انتخاب بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جا رہے تھے۔ حلقۂ ارباب ذوق نے جدید نظموں کا ایک انتخاب ''1941 کی بہترین نظمیں'' کے عنوان سے شائع کیا۔ اس مجموعے میں میں چوبیس (24) نظمیں تھیں۔ یہ صرف جدید شعرا کی نظموں کا انتخاب تھا۔ اس لیے اس میں کل 24 نظموں کو شامل کیا گیا۔ اس میں ترقی پسند شعرا کی بھی نظمیں شامل تھیں اور حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا کی بھی۔ اس کے مرتب میراجی تھے۔ ذیل میں چند مشہور نظموں کے عنوانات اور شعرا کے نام پیش کیے جا رہے ہیں:

''ازلی مسرتوں کی ازلی منزل'' (احمد ندیم قاسمی) ''انتباہ'' (فیض احمد فیض) ''خودکشی'' (ن۔م۔راشد) ''تو گر واپس آئی'' (جوش) ''جواب تغافل'' (عدم) ''ننھا قاصد'' (اختر شیرانی) ''ڈرائنگ روم'' (سلام مچھلی شہری) ''تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے (مطلبی فرید آبادی) ''انوکھا پیار'' (مخمور جالندھری) ''دسہرا اشنان'' (شاد عارفی) ''دھوبی کا گھاٹ'' (میراجی) ''نقش پا'' (اختر الایمان) ''جنت کی سیر'' (مہدی علی خان) ''رقص'' (یوسف ظفر) ''خاکے'' (وشوامتر عادل)۔

کتابی صورت میں آنے سے پہلے یہ جدید نظمیں اس زمانے کے اہم اور موقر ادبی رسالوں میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان رسالوں میں ''ساقی'' (دہلی) ''نگار'' (لکھنو) ''جامعہ'' (دہلی) ''ادب لطیف'' (لاہور) ''ہمایوں (لاہور) ''ادبی دنیا (لاہور) ''داستان'' (لاہور) جیسے رسالے شامل تھے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. حلقۂ ارباب ذوق نے پہلے پہل اپنی منتخبہ نظموں کا مجموعہ کب شائع کیا؟ اس کا عنوان کیا تھا؟
2. 1941 کی بہترین نظموں میں شامل چند شعرا اور ان کی نظموں کے نام بتائیے۔

19.4 حلقۂ ارباب ذوق کا نظریہ

رسالوں میں ان نظموں کی اشاعت کے بعد کتابی صورت میں ان نظموں کا فروخت ہو جانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ نظمیں اس زمانے میں کتنی مقبول تھیں۔ ''1941 کی بہترین نظمیں'' کے ابتدائیہ میں اس کے مرتب میراجی نے اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے پہلے کے مصنفین اور شعرا کو وہ ''کل والے'' اور ترقی پسند مصنفین کو ''آج والے'' کہتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ترقی پسند مصنفین اپنے سے پہلے کے مصنفین کو فن برائے فن کا قائل سمجھتے تھے اور اس بنا پر ان کے ادب کو زندگی سے تعلق نہ رکھنے والا کہتے ہیں اور جس ادب کا زندگی سے تعلق نہ ہو وہ مفید نہیں ہو سکتا۔ ترقی پسند اپنے ادب کو ''فن برائے زندگی'' پر کاربند بتاتے ہیں اور اسے مفید قرار دیتے ہیں۔

میراجی کا استدلال یہ ہے کہ کوئی بھی ''فن'' اسی وقت ''فن'' کہلائے گا جب کہ وہ فنی تقاضوں اور فنی قدروں پر پورا اترے گا۔ جب وہ فنی قدروں کو

پورا نہ کرے تو اسے فن نہیں کہا جا سکتا۔ اور جب وہ فن نہیں ٹھہرتا تو پھر اسے ''فن برائے حیات'' کہنا بالکل لغو بات ہے۔ وہ اسی دیباچہ میں اپنے آپ کو یعنی حلقۂ ارباب ذوق کو صحیح معنوں میں ترقی پسند کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک ''صحیح اور صحت مند ترقی پسندی مختصر لفظوں میں، خیال افروزی کا دوسرا نام ہے۔'' وہ آخر میں اس انتخاب میں شامل تمام نظموں کو ترقی پسند قرار دیتے ہیں، خواہ وہ ترقی پسند شعرا کی ہوں یا حلقۂ ارباب ذوق سے تعلق رکھنے والوں کی ہوں یا کسی اور کی وہ لکھتے ہیں:

> ''نثر اور نظم دونوں میں اصناف سخن کے متعلق اب تک حلقۂ ارباب ذوق کا نقطہ نظر یہی رہا ہے اور اس نقطۂ نظر کی وسعت بہ آسانی زندگی سے وہ ہم آہنگی حاصل کر سکی ہے جس کا اظہار آج کی نظموں کا انتخاب بھی ہے۔''

حلقۂ ارباب ذوق کا یہ انتخاب ان کی غیر جانبداری اور انصاف پسندی کا مظہر ہے۔ کیونکہ انہوں نے باوجود نظریاتی اختلاف کے ترقی پسند شاعروں کی نظموں کو پیش کیا۔ حلقے کے جلسوں میں بھی تنقید بے لاگ اور غیر جانبدارنہ ہوتی تھی۔ موضوع کے تعلق سے جہاں تنقید ہوتی تھی وہیں ہیئت کے تجربے کیے جاتے تھے اور ان کی کامیابی اور ناکامی کا محاسبہ بھی کیا جاتا تھا۔ اسی طرح عروض اور قافیے پر بھی حلقے میں بحثیں ہوا کرتی تھیں۔

''1941 کی بہترین نظمیں'' کی پذیرائی ادبی حلقوں میں بہت حوصلہ افزا رہی۔

1942ء میں پھر ایک انتخاب منظر عام پر آیا۔ اس انتخاب میں بھی حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا کے علاوہ ترقی پسند شاعروں کی بھی بہت سی نظمیں ملتی ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

''فرار'' (ذی۔ ایم۔ تاثیر) ''زنجیر'' (ن۔ م۔ راشد) ''اندھیر نگری'' (شاد عارفی) ''بھگوان'' (عبدالمجید بھٹی) ''برفانی چوٹیوں سے گزرتے ہوئے سپاہیوں کا راگ'' (حفیظ جالندھری) ''تفاوت راہ'' (میراجی) ''فریاد'' (مسعود پرویز) ''خواب گراں'' (قیوم نظر) ''شکاری'' (احمد ندیم قاسمی) ''بے بسی'' (انجم رومانی) ''بسنت'' (شاد عارفی) ''تصور کے دھندلکے میں'' (احتشام حسین) ''فیصلہ'' (اختر الایمان) ''بھینٹ'' (سلام مچھلی شہری) ''سکھ میں دکھ'' (مختار صدیقی) ''کلرک'' (مسعود قریشی) ''آدرش'' (میراجی) ''فریب مجاز'' (ماہر القادری) ''آخری سجدہ'' (احمد ندیم قاسمی) ''ساون کا سپنا'' (مسعود پرویز) ''رسوائی'' (مختار صدیقی) ''موت'' (یوسف ظفر) ''محلکے'' (اختر الایمان) ''فردوس گوش'' (یوسف ظفر) ''طوائف'' (معین احسن جذبی) ''برسات'' (ضیا جالندھری) ''بھوکی جوانیاں'' (مخمور جالندھری) ''ساتھی'' (مجید امجد) ''سونے سے پہلے'' (تصدق حسین خالد) ''سر راہ (مکین احسن کلیم) ''جوانی'' (قیوم نظر) ''تسلی'' (طالب شیرازی) ''شہنائی'' (فکر تونسوی) ''سویرا'' (محمد صفدر)

1942ء کی نظموں کے انتخاب کے تعلق سے مرتبین نے حلقۂ ارباب ذوق کا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''جدلیاتی فلسفہ، سیاسی کشمکش، جنسی فشار'' ان نظموں کا موضوع ہے۔ اور یہ کہ ان تمام باتوں سے ''پیدا شدہ مسائل'' لاشعوری دھندلکے سے ابھر کر شاعروں کی مخصوص انفرادیت میں ڈھل رہے ہیں۔''

جدید نظموں میں نسوانی مسائل کو بھی پیش کیا گیا تھا۔ ابتدا میں نسوانی تعلیم، پردہ اور نئی تہذیب کے تقاضوں کو پیش کیا گیا۔ بعد میں نسوانی آزادی اور سیاسی زندگی میں عورتوں کی شرکت اور ضرورت کو بیان کیا گیا۔ سماجی زندگی کی پابندیوں اور جکڑ بندیوں کا حل حلقے کے شعرا نہ تو سماج سے بغاوت کو قرار دیتے ہیں نہ ہی اشتراکیت کو وہ نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے پاس رومانیت ملتی ہے یعنی وہ ایک ایسی دنیا کی تمنا کرتے ہیں جو ان مسائل سے پاک ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پُر آشوب زمانے کی وجہ سے وہ داخلیت اور جنسیت میں پناہ لے رہے ہیں، خاص طور پر میراجی کی نظم ''تفاوت راہ''۔ مختار صدیقی کی نظم ''سکھ میں دکھ''۔ انجم رومانی کی ''بے بسی'' اور تصدق حسین خالد کی نظم ''سونے سے پہلے'' میں جنسیت اور داخلیت بے حد ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. میراجی کا ادب کے تعلق سے نقطہ نظر کیا تھا؟
2. 1942ء کی جدید نظموں میں کن کن مسائل کو پیش کیا گیا؟

19.5 میراجی

میراجی کی نظم ''تفاوت راہ'' میں اشاریت اور ابہام بھی حد سے زیادہ ہے۔ یہاں اس نظم کا کچھ حصہ پیش کیا جا رہا ہے:

ایک طرح کی ''ادبی دہشت گردی'' اور ''ذہنی اور جذباتی بلوہ'' ہے۔ایک انقلاب پرست نوجوان کے لیے جائز ہوتو ہولیکن ''ایک اشتراکی شاعر'' کو اس سے دور رہنا چاہیے۔انقلاب کے لیے جنگ میں حصہ لینے والے کے لیے ''ڈسپلن'' لازمی ہے اور ''اپنے پر قابو پانا ضروری ہے''۔ انہوں نے آخر میں کہا کہ ''اس آگ میں ہمیں کودنا ہے لیکن اسے گلزار بنانے کے لیے''۔سجاد ظہیر کا یہ مضمون بہت کارگر ثابت ہوا اور تمام اہم شاعروں نے یہی متوازن رویہ اختیار کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. معریٰ نظم سے کیا مراد ہے؟
2. آزاد نظم کی خصوصیت کیا ہے؟

18.4 نظم نگار شعرا

اس تحریک کی نظم نگاری کو بلند مقام عطا کرنے والے ترقی پسند شعرا کی ایک بڑی تعداد ہے لیکن ان میں سے جو بہت اہم ہیں ان کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔

18.4.1 مخدوم محی الدین

مخدوم محی الدین ترقی پسند شعرا میں بے حد امتیاز اور بلند مقام رکھتے ہیں۔وہ ان گنے چنے شعرا میں سے ہیں جنھوں نے 'سرخ سویرا' کا نعرہ بلند کر کے صرف آزادی کے گیت ہی نہیں گائے بلکہ حیدرآباد کے شاہی دور میں سرخ انقلاب لانے کے لیے عملی طور پر اس میں شامل ہوئے۔اس جدوجہد کی خاطر انہیں روپوش ہو جانا پڑا۔انہوں نے جہاں محبت کے گیت گائے وہیں آزادی کے ترانے بھی اُردو شاعری کو دیے۔اسی وجہ سے انہیں ''محبت اور محنت'' کا شاعر کہا جاتا ہے۔ان کی نظم ''یہ جنگ ہے جنگ آزادی'' آزادی کے پرچم کے تلے ایک ترانے کی طرح گائی گئی۔ان کی انقلابی شاعری میں جہاں للکار اور گھن گرج ہے وہیں وہ بڑے مدھر اور خوب صورت انداز میں ''انقلاب'' کا انتظار بھی کرتے ہیں۔مخدوم کی عشقیہ نظموں میں سجدہ' انتظار' محبت کی چھاؤں' نامہ حبیب' وہ' تورس' چارہ گر اور چاند تاروں کا بن بڑی شگفتہ اور شاداب نظمیں ہیں۔

18.4.2 علی سردار جعفری

علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک میں کئی حیثیتوں سے بڑا اہم مقام رکھتے ہیں۔وہ نہ صرف بہت بڑے انقلابی شاعر تھے بلکہ اعلیٰ درجے کے خطیب' نقاد اور نثر نگار بھی تھے۔ان کی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' ان کا شعری کارنامہ ہے۔اس کے علاوہ رومان سے انقلاب تک' اودھ کی خاک حسین' اور 'نیند' ان کی بہت اچھی نظمیں ہیں۔'رومان سے انقلاب تک' ان کی مشہور ترین نظم ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اُن کی شاعری نے رومان سے انقلاب تک کا جو سفر طے کیا ہے' یہ نظم اُس کی بہت سچی تصویر پیش کرتی ہے۔

18.4.3 کیفی اعظمی

کیفی اعظمی ترقی پسند شعرا میں صف اول کے شاعر ہیں۔کیفی کی بہت سی نظمیں ہنگامی اور وقتی موضوعات سے متعلق ہیں جو ان نظموں کے عنوانات سے بھی ظاہر ہے مثلاً ''گاندھی جناح کی ملاقات پر' سویت یونین اور ہندوستان' سلام اے روس' فتح برلن' قومی حکمران وغیرہ۔لیکن ان نظموں میں ایک خاص کیفیت ہوتی ہے۔کیفی نے ہنگامی موضوعات والی نظموں کے ساتھ رومانی اور عشقیہ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ان میں ان کی نظم ''بوسہ'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔اس رنگ کی دوسری نظموں میں اندیشہ' پشیمانی' پامسٹ' حوصلہ اور تبسم شامل ہیں۔

18.4.4 ساحرلدھیانوی

ترقی پسند شعرامیں ساحرلدھیانوی کونوجوان طبقے میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ان کی نظم ''تاج محل'' بے حد مشہور ہوئی جس کا مشہور شعر ہے:

اک شہنشاہ بے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

اس نظم کے علاوہ گریز، چکلے، لمحۂ غنیمت، بنگال کل اور آج، ایک شام، خودکشی، ساحر کی ایسی اہم نظمیں ہیں جن میں خلوص اور بے ساختگی ملتی ہے۔بعد میں ساحرلدھیانوی فلمی دنیا سے ایسے وابستہ ہوئے کہ ادبی میدان سے گویا کنارہ کشی کرلی لیکن ان کے فلمی گیتوں میں بھی ترقی پسندی کی جھلک ملتی ہے۔

18.4.5 اسرارالحق مجاز

نوجوان طبقے کوایک اورشاعر نے بہت زیادہ متاثر کیا اوروہ ہے اسرارالحق مجاز۔عزیز احمد، مجاز کی شاعری کے تعلق سے کہتے ہیں کہ وہ انقلاب اورتغزل کا حسین امتزاج ہے۔مجاز کی شاعری میں والہانہ انداز اور وارفتگی ملتی ہے۔ان کی نظموں میں طفلی کا خواب، نذرِ دل، نورا، کس سے محبت ہے، ایک غمگین یاد، آج کی رات، اندھیری رات کا مسافر، رات اور ریل، آہنگ نو ان کی ایسی نظمیں ہیں جن میں صحت مند جذباتیت ہے۔ان کی پوری شاعری میں نغمگی ملتی ہے۔اسی وجہ سے فیض نے انہیں ''انقلاب کا مطرب'' کہا ہے۔

18.4.6 فیض احمد فیض

فیض احمد فیض تمام ترقی پسند شعرامیں بے حد منفرد اس لیے ہیں کہ انہوں نے اُردو کلاسیکی شاعری کی روایات کو قائم رکھتے ہوئے نئے مسائل اور نئے موضوعات پیش کیے۔اُنہوں نے اپنی نظم نگاری کوغزل کے رموز وعلائم سے قریب کیا ہے۔ان کی شاعری میں ''قندیل غم'' بھی حرف غزل معلوم ہوتی ہے۔ان کی نظموں میں دوعشق، ملاقات، لوح وقلم، سرمقتل، زنداں کی ایک صبح، زنداں کی ایک شام، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، لیلیٰ وطن، اے دلِ بیتاب ٹھہر، طوق ودار کا موسم اور دوسری بیشتر نظمیں احساس کی شدت، رموز وعلائم کی تہہ داری اور فنکاری کا مظہر ہیں۔

18.4.7 اختر الایمان

اختر الایمان، میراجی کے رفیق تھے اور دونوں میں گہری دوستی تھی۔اسی وجہ سے ابتدا میں ترقی پسند انہیں شبہے کی نظر سے دیکھتے رہے۔لیکن وہ بنیادی طور پر ترقی پسند تھے۔انہوں نے اپنے دور کے مسائل کوسلیقے اور شاعرانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ایک سوال، خاک وخوں، نئی صبح، ایک کہانی، پندرہ اگست، آزادی کے بعد، اندوختہ، سوالیہ نشان اور دوسری کئی نظموں میں انہوں نے اپنے دور کے مسائل پیش کیے ہیں۔اختر الایمان نے پابند نظمیں بھی لکھی ہیں اور معرّا نظمیں بھی۔ان کی نظم ''ایک لڑکا'' بہت مشہور اور مقبول ہوئی۔

18.4.8 جاں نثار اختر

جاں نثار اختر ابتدا میں رومانی اور عشقیہ شاعری کرتے تھے۔ان کی نظمیں گرلز کالج کی لاری وغیرہ اس بات کی گواہی دیتی ہیں۔وہ مختلف شاعروں سے متاثر ہوتے رہے ہیں اوران کے رنگ میں نظمیں کہی ہیں۔جوش سے متاثر ہوکرانہوں نے خانہ بدوش، بگولا اور دوسری کئی نظمیں لکھیں۔فیض سے متاثر ہوئے تو زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم، یا میں بہت دور چلا جاؤں گا، اقبال کے رنگ کواپنایا تو ''ساقی نامہ'' کی طرز پر ''امن نامہ'' ستاروں کی سزا اور دوسری نظمیں لکھیں۔جاں نثار کا انفرادی رنگ ان نظموں میں اُبھرتا ہے جوانہوں نے اپنی رفیقۂ حیات کے انتقال پر لکھی ہیں۔ان میں ''خاک دل'' اور ''خاموش آواز'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

18.4.9 احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی ترقی پسند شعرا میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار بھی ہیں' شاعر بھی ہیں اور صحافی بھی۔ انہوں نے اپنی نظموں میں پنجاب کی دیہی زندگی کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ ان کی ایسی نظموں میں ''دیہات کی شہزادی'' ''جب آنکھ کھلی تو'' ''دھڑکن'' ''پرواز جنوں'' وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی ترقی پسند نظموں میں ''تاریخ کی آواز'' ''طلوع'' ''جبر و اختیار'' ''آزادی کے بعد'' اور دوسری کئی نظمیں شامل ہیں۔ ان میں فکری وقار بھی ہے اور فنی نکھار بھی۔ قاسمی ترقی پسند نظم نگاروں میں اپنی ایک انفرادی آواز رکھتے ہیں۔

18.4.10 شاد عارفی

شاد عارفی نے ترقی پسند تحریک سے پہلے شہرت حاصل کر لی تھی۔ انہوں نے اپنی نظموں میں زندگی کے مسائل ہی نہیں بلکہ ان کے رنگا رنگ پہلوؤں کو بھی پیش کیا جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں بڑا تنوع ملتا ہے۔ وہ ڈرامائی اور مکالماتی انداز میں نظم نگاری کرتے ہیں۔ انہوں نے جاگیردارانہ نظام کی زوال پذیری کو پیش کرتے ہوئے 'رنگیلے راجا کی موت' 'ان اونچے اونچے محلوں میں' اور 'پرانا قلعہ' جیسی نظمیں لکھیں۔ ان کی طنزیہ نظموں میں 'پیر دہقاں' 'دسہرا اشنان' 'بیٹے کی شادی' 'ساس بہو' اور دوسری بہت سی نظمیں شامل ہیں۔ شاد عارفی نے منظوم خاکے بھی لکھے ہیں۔ یہ نظمیں ''آپ کی تعریف'' کے عنوان سے لکھی گئی ہیں۔

18.4.11 منیب الرحمٰن

منیب الرحمٰن ابتدا میں حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ رہے لیکن بعد میں انہوں نے ترقی پسند انداز فکر کو اپنا لیا۔ انگلستان میں انہوں نے دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جس کے بعد انہوں نے اجتماعی زندگی اور اس کے مسائل اپنی شاعری میں پیش کیے۔ دوسری جنگ عظیم پر انہوں نے ''جنگ'' کے نام سے جو نظم لکھی اس کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ یہ اس موضوع پر سب سے اچھی نظم ہے۔

18.4.12 ظہیر کاشمیری

ظہیر کاشمیری مخدوم کی طرح مزدوروں اور کسانوں کی جدوجہد میں عملی طور پر شامل رہے۔ ظہیر کاشمیری کی شاعری میں انفرادیت نہیں ملتی وہ کبھی اقبال کے انداز کو اپناتے ہیں تو کبھی فیض' ندیم یا سردار جعفری کے انداز میں شعر کہتے ہیں۔ ان کی طویل نظم ''ایشیا'' کو اس سلسلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ترقی پسند تحریک سے وابستہ کوئی چار اہم نظم نگاروں کے نام بتایئے۔
2. مخدوم کو ''محبت اور محنت'' کا شاعر کیوں کہا جاتا ہے؟
3. مندرجہ ذیل شعر ساحر کی کس نظم سے لیا گیا ہے:

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

4. فیض احمد فیض کی دو مشہور نظموں کے عنوان لکھیے۔

18.5 خلاصہ

مجموعی طور پر ترقی پسند شاعری نے اس زمانے کی شعری فضا کو جس درجہ متاثر کیا اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ شاعر جو ترقی پسند

تحریک سے وابستہ نہیں تھے انہوں نے بھی کسی قدر اسی رنگ میں شاعری کی ہے۔ایسے شاعروں میں جگر مرادآبادی' آنند نرائن ملا' ساغر نظامی' روش صدیقی' جمیل مظہری' گوپال متل' عرش ملسیانی' جگن ناتھ آزاد اور حفیظ جالندھری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔لیکن ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں ترقی پسند مصنفین نے جو بے لچک انداز اپنایا اور ساری ادبی قدروں سے صرف نظر کر کے سیاسی مطمح نظر ہی کو سامنے رکھا تو اس کی وجہ سے تحریک کو زبردست نقصان پہنچا اور وہ روبہ زوال ہوگئی۔ بھیمڑی میں 1949ء میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقد ہوئی۔اس میں انہوں نے نیا منشور بنایا جو ادبی سے زیادہ سیاسی تھا۔ کیونکہ اس میں ادیبوں کے لیے یہ اصول بنائے گئے کہ وہ صرف غم دوراں کو موضوع بنائیں۔صرف آزادی اور انقلاب کے لیے شاعری کریں۔فن کی جمالیاتی قدروں کو پیش نظر نہ رکھیں۔ یہ کہا گیا کہ ترقی پسند شاعروں کی پروپگنڈہ شاعری کی مخالفت کرنے والے سرمایہ دارانہ نظام کے حامی ہیں۔شاعری میں رمزیت' اشاریت' تشبیہ اور استعارے کو جگہ نہ دیں۔ ہر صورت میں رجائیت کی بات کریں۔عوامی جدوجہد ہی کو شاعری کا موضوع بنائیں۔جن شاعروں نے اس منشور پر عمل کیا ان کی شاعری کو زبردست نقصان پہنچا کیونکہ وہ ادبی قدر و قیمت' لذت اور چاشنی سے محروم ہوگئی۔اس کے باوجود 1947ء کے بعد بھی ایسے شاعر ابھرے جن کو ترقی پسند کہا جاسکتا ہے' ان میں ابن انشا' تیغ الہ آبادی' نریش کمار شاد' راہی معصوم رضا' اختر پیامی' منظر شہاب' بلراج کومل' حسن نعیم' باقر مہدی' قاضی سلیم' وحید اختر' شاذ تمکنت' عمیق حنفی' عزیز قیسی' کمال احمد صدیقی' منظر سلیم' رفعت سروش' شفیق فاطمہ شعریٰ' حمایت علی شاعر' زبیر نعیم' جاوید کمال اور انور معظم کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر پہنچ کر زوال پذیر ہوگئی۔گو اب بھی ترقی پسند مصنفین کا ایک حلقہ موجود ہے لیکن یہ محدود اور مختصر ہو چکا ہے۔ترقی پسند تحریک کے بعد 1960 کے لگ بھگ جدیدیت کا رجحان اُردو میں فروغ پانے لگا جس میں اشتراکیت اور اجتماعیت کے برخلاف انفرادیت پر زور دیا جانے لگا۔

سرسید تحریک کے بعد ترقی پسند تحریک اُردو کی سب سے بڑی اور اہم تحریک ہے۔اس نے اُردو شعر و ادب میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں اور اس کے دامن کو وسیع کیا۔

18.6 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. ترقی پسند تحریک کی نظم نگاری کی مقبولیت کے اسباب بیان کیجیے۔
2. مخدوم' سردار جعفری' کیفی اعظمی اور فیض کی نظم نگاری کا جائزہ لیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

3. ساحر لدھیانوی' مجاز اور اختر الایمان کی نظم نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔
4. ترقی پسند تحریک سے قبل کی نظم نگاری پر روشنی ڈالیے۔
5. نظم معریٰ اور آزاد نظم میں کیا فرق ہے؟ وضاحت کیجیے۔

18.7 فرہنگ

عالم گیر = عالم پر چھایا ہوا

سرگرداں = حیران' پریشان

متحمل = برداشت کرنے والا

علائم = علامت کی جمع

فروغ دینا = ترقی دینا

ارفع = بلند

منشور = بنیادی قانون، آئین

کوتاہیاں = کمزوریاں

18.8 سفارش کردہ کتابیں

عزیز احمد : ترقی پسند ادب

سردار جعفری : ترقی پسند ادب

قمر رئیس، عاشور کاظمی : ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر

خلیل الرحمٰن اعظمی : ترقی پسند ادبی تحریک

یعقوب یاور : ترقی پسند تحریک اور اُردو شاعری

اکائی:19 حلقہ ارباب ذوق کی نظم نگاری

ساخت

19.1 تمہید

19.2 حلقۂ ارباب ذوق کی ابتدا

19.3 جدید نظم نگاری کا فروغ اور حلقہ ارباب ذوق

19.4 حلقۂ ارباب ذوق کا نظریہ

19.5 میراجی

19.6 ن۔م۔راشد

19.7 حلقۂ ارباب ذوق کے دوسرے اہم شعرا

19.8 خلاصہ

19.9 نمونہ امتحانی سوالات

19.10 فرہنگ

19.11 سفارش کردہ کتابیں

19.1 تمہید

حلقۂ ارباب ذوق کا قیام 1939ء میں عمل میں آیا۔ ترقی پسند تحریک 1936ء میں شروع ہوئی۔ ابتدا میں کئی سال تک دونوں میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ بلکہ سالہا سال تک ترقی پسند ادیب اور شاعر حلقے کے جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ابتدائی چند اجلاس تک حلقۂ ارباب ذوق کا نام ''بزم داستاں گویاں'' رہا۔ ابتدا میں کوئی خاص مقصد پیش نظر نہیں تھا۔ صرف چند ادیب دوست آپس میں مل کر بیٹھنا چاہتے تھے تاکہ ''اپنے اپنے ادب پارے'' ایک دوسرے کو سنا کر اس پر تبادلۂ خیال کریں۔ 41-1940ء میں حلقے کے ممبروں میں بیدی، ہنس راج رہبر، کنہیالال کپور اور بیگم محمود شامل تھے۔ میراجی نے ترقی پسند تحریک کے نقطۂ نظر ''فن برائے زندگی'' سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا تھا ''فن برائے فن کے بغیر فن ہی نہیں ہوسکتا۔ پھر یہ برائے حیات کا دُم چھلا کیسا؟''۔ حلقۂ ارباب ذوق اور ترقی پسند مصنفین میں یہ ایک بنیادی اختلاف تھا۔ حلقے کے ارباب ''ادب برائے ادب'' کو اہمیت دیتے تھے اور ترقی پسند مصنفین ''ادب برائے زندگی'' کو۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ یہ اختلاف بڑھتا گیا۔ حلقۂ ارباب ذوق کی نظم نگاری بنیادی طور پر ''ادب برائے ادب'' کے نظریے کی حامل ہے۔

19.2 حلقۂ ارباب ذوق کی ابتدا

حلقۂ ارباب ذوق کی ابتدا اتفاقی طور پر ہوئی۔ چند ادبی ذوق رکھنے والے دوستوں نے یہ طے کیا کہ وہ مل بیٹھیں گے اور اپنی تخلیقات ایک دوسرے کو سنائیں گے۔ نصیر احمد جامعی اور شیر محمد اختر حلقۂ ارباب ذوق کے بانیوں میں سے تھے۔ پہلا جلسہ ''بزم داستان گویاں'' کے نام سے 1939ء میں منعقد کیا گیا۔ لیکن چند ہی مہینے بعد 1939ء ہی میں ''بزم داستان گویاں'' کا نام بدل کر ''حلقۂ ارباب ذوق'' کر دیا گیا۔ بزم داستان گویاں میں ظاہر ہے کہ صرف مختصر کہانیاں یا افسانوی ادب ہی پڑھا جاسکتا تھا لیکن یہ بزم جب بزم داستان گویاں سے ''حلقۂ ارباب ذوق'' بنی تو اس کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا اور اس میں ہر قسم کی ادبی تخلیق اور تنقید جگہ پانے لگی۔ حلقۂ ارباب ذوق اور زیادہ فعال اس وقت ہوا جب میراجی اس میں شامل ہوئے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ حلقہ، میراجی کی شخصیت سے زیادہ متاثر ہوا یا ان کی شاعری سے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں باتیں حلقے پر اثر انداز ہوئیں۔

سے پہلے ہٹلر نے فاشزم کے نظریے کو اپنا لیا۔ فاشزم کے نظریے میں صرف اپنے ہی نظریے کو صحیح سمجھا جاتا ہے اور اس کے خلاف جو کوئی نظریہ ہوا سے تشدد کے ساتھ کچل دیا جاتا ہے۔ فاشزم میں مٹھی بھر لوگ ہی سب کچھ ہوتے ہیں۔ ہر جمہوری اصول اور نظریے کو سختی سے ختم کر دیا جاتا ہے۔ اپنی برتری منوانے اور اپنی ہی نسل کو اعلیٰ اور ارفع قرار دینے کے لیے ہر نسل کو نفرت اور حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ ہٹلر نے فاشزم کے ساتھ اپنی ڈکٹیٹر شپ قائم کی تو فاشزم اپنی بدترین اور بھیانک ترین صورت میں دنیا کے سامنے آئی۔ فاشزم کی نفی اور اس کو رد کرنے کے لیے ساری دنیا سرگرداں ہوگئی اور ایسے نظریے کی تلاش ہوئی جو فاشزم کے بالکل برعکس ہو۔ دُنیا کو اشتراکیت یا کمیونزم کے نظریے میں فاشزم کو رد کرنے کی طاقت نظر آئی۔ کارل مارکس نے اشتراکیت یا کمیونزم کا نظریہ پیش کیا تھا۔ اسی وجہ سے اسے مارکسزم (Marxism) بھی کہا جاتا ہے۔ فاشزم کے برخلاف ہر چیز اجتماعی یا کمیونٹی کی ہوتی ہے۔ سیاست سے لے کر معیشت تک ہر بات اور ہر چیز مشترک ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے دنیا بھر کے دانشوروں نے اس نظریے کو ذہنی طور پر قبول کیا اور ایسے ہی دانشوروں نے ترقی پسند مصنفین کی تحریک شروع کی۔ سجاد ظہیر، ملک راج آنند اور بعض دوسرے ہندوستانی دانشور اس زمانے میں انگلستان ہی میں تھے۔ اسی وجہ سے انگلستان ہی میں 1935ء میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑی اور وہیں ایک اعلان نامہ یا منشور بھی بنایا گیا۔ 1936 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منشی پریم چند کی صدارت میں لکھنؤ میں منعقد ہوئی اور ہندوستان میں باقاعدہ طور پر ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔

ترقی پسند تحریک نے اُردو شعر و ادب میں بڑی انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔ سرسید تحریک کے بعد یہی اُردو ادب کی اہم اور بڑی تحریک ہے۔ اس تحریک نے کئی نئی اصناف کو رواج دینے میں اور اُردو شعر و ادب کو نئے امکانات سے روشناس کرنے میں بہت بڑا حصہ ادا کیا۔ ترقی پسند تحریک کی وجہ سے اُردو شاعری میں اور خاص طور پر اُردو نظم نگاری میں بڑی اہم اور دور رس تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اُردو نظم نگاری کو اس تحریک کی وجہ سے بڑا فروغ بھی حاصل ہوا اور بہت مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

18.2 نظم نگاری ترقی پسند تحریک سے قبل

ترقی پسند تحریک کی وجہ سے اُردو نظم نگاری کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کے لیے اصل میں پہلے سے زمین تیار تھی۔ انجمن پنجاب نے اُردو میں نظم نگاری کو فروغ دینے میں سب سے پہلے کام کیا۔ غزل کے لیے مصرع طرح دینے کی بجائے نظم کے عنوانات دیے گئے۔ حالی جیسا شاعر انجمن پنجاب سے وابستہ تھا۔ حالی نے ایسی مختصر اور طویل نظمیں لکھیں جن سے اس عصر کے تقاضے اور مسائل سامنے آتے ہیں۔ شاعری کو عصری زندگی سے مربوط کرنے کا کام سب سے پہلے حالی نے کیا۔ بعد میں ان ہی کی وجہ سے اقبال جیسے عظیم شاعر نے نظم نگاری کو معراج پر پہنچا دیا۔ اس کے بعد جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی نے اُردو نظم کو مقبولیت بخشنے میں عہد آفریں کام انجام دیے۔ ان شاعروں نے ایسی زرخیز زمین تیار کر دی کہ ترقی پسند تحریک کی نظم نگاری فوراً ہی برگ و بار لانے لگی۔ اس زمانے کی سیاسی فضا بھی نظم نگاری کے لیے بے حد سود مند تھی۔ ہندوستان میں آزادی کی جنگ چھڑی ہوئی تھی اور اس کے تقاضے بھی ایسے تھے کہ تنگنائے غزل اس کو پورا کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ نظم میں البتہ ایسی گنجائش تھی، اسی وجہ سے رئیس المتغزلین جگر مرادآبادی تک نے یہ کہہ دیا:

شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

کیونکہ اس زمانے میں ''فکرِ جمیل''، ''خوابِ پریشاں'' بنی ہوئی تھی۔ ان تمام باتوں کے علاوہ ہر شخص شعر و ادب کا ذوق رکھتا تھا۔ اسی کی وجہ سے صحافتی سرگرمیوں کو بھی بڑا فروغ حاصل ہوا۔ ادبی رسالے اس زمانے میں ہر گھرانے میں پڑھے جاتے تھے۔ ان رسالوں نے بھی اُردو شاعری اور نظم نگاری کو فروغ دینے میں بڑا کام کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. نظم نگاری کو کس انجمن نے سب سے پہلے فروغ دینے کا کام کیا؟

2. ترقی پسند تحریک سے پہلے کن شاعروں نے نظم نگاری کو فروغ دینے میں اہم حصہ ادا کیا؟

18.3 ترقی پسند تحریک اور نظم نگاری

ترقی پسند تحریک نے جب ہندوستانی زندگی کے بنیادی مسائل کو موضوع سخن بنانے کو اپنے اعلان نامے میں شامل کرلیا تو انہیں اپنے 'بیان' کے لیے کچھ وسعتوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسی وجہ سے انہوں نے بے قافیہ و ردیف نظمیں، جنہیں معریٰ نظمیں کہا جاتا ہے کہنی شروع کیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آزاد نظم کو بھی فروغ دیا جس میں بحر تو ایک رہتی ہے لیکن بحر کے ارکان اپنی ضرورت کے مطابق گھٹائے اور بڑھائے جاتے ہیں۔ ابتدا میں ایسی نظموں کی بڑی مخالفت ہوئی لیکن متوازن انداز فکر رکھنے والوں نے کہا کہ شاعری میں اس طرز کی نظموں کی مخالفت نہیں ہونی چاہیے۔ ان مفکرین کا کہنا تھا کہ اگر ان نظموں میں دم خم ہوگا تو وہ مقبولیت حاصل کرلیں گی۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان میں چونکہ جان تھی اسی وجہ سے ان نظموں نے اُردو شاعری میں اپنی مستقل جگہ بنالی ہے۔

18.3.1 وقتی اور ہنگامی موضوعات

ترقی پسند تحریک کے منشور میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ہندوستانی زندگی کے بنیادی مسائل کو ادب اور شاعری میں لازمی طور پر جگہ دی جائے گی۔ اس لیے ترقی پسند تحریک سے متاثر بہت سے شاعروں نے وقتی اور ہنگامی موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ان شاعروں میں رضی عظیم آبادی، شہاب ملیح آبادی، وقار انبالوی، شمیم کرہانی اور دوسرے کئی نام ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض بہت بڑے اور اچھے شاعروں نے وقتی اور ہنگامی موضوعات پر نظمیں لکھیں۔ ان میں علی جواد زیدی، سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کے نام شامل ہیں۔ ان شاعروں کا سرمایہ سخن صرف وقتی اور ہنگامی موضوعات تک محدود نہیں تھا اس وجہ سے ان کا نام اور کام آج بھی زندہ ہے لیکن دوسرے شعرا جن کا سرمایہ صرف وقتی اور ہنگامی موضوعات سے متعلق تھا، ایک خاص زمانے اور عرصے تک مقبول رہے اور اہم بھی سمجھے گئے لیکن آج ان کے نام اور کام اُردو شاعری کی تاریخ میں اہمیت نہیں رکھتے۔

18.3.2 حب الوطنی

وقتی اور ہنگامی موضوعات کے ساتھ ایک اور رجحان ترقی پسند شعرا میں ملتا ہے جس میں وہ اپنے محبوب سے یہ کہتے ہیں کہ وہ جس راستے پر چل رہے ہیں اس میں عشق و محبت کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ عشق و محبت کے گیتوں کی جگہ حب الوطنی اور آزادی کے ترانے گانا چاہتے ہیں۔ علی جواد زیدی کی نظم ''میری راہ''، سردار جعفری کی نظم ''انتظار نہ کرنا'' اور اس سلسلے کی سب سے خوبصورت اور بے حد معروف نظم، فیض کی ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور رجحان یہ بھی ملتا ہے کہ وہ محبوب سے یہ خواہش کرتے ہیں کہ وہ اس آزادی کی جدوجہد میں شامل ہو جائے اور ان کے دوش بدوش چلے۔ ایسے خیالات کی سب سے بہترین اور بے حد کامیاب نظم مجاز کی ''نوجوان خاتون سے خطاب'' ہے جس کا ایک شعر تو ضرب المثل کی طرح مشہور ہوا ہے۔

تیرے ماتھے کا یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

18.3.3 انقلاب اور آزادی وطن

بغاوت اور آزادی کی نظمیں لکھتے ہوئے اس زمانے کے کئی اہم شاعروں نے انقلاب کا ''خونی تصور'' پیش کیا۔ مجاز کی نظم ''انقلاب''، جاں نثار اختر کی نظم ''ساقی''، سردار جعفری کی نظم ''جوانی'' اور ''جنگ و انقلاب''، معین احسن جذبی کی ''دعوت جنگ''، مخدوم محی الدین کی ''موت کا گیت'' اور ''مشرق'' ان تمام نظموں میں خون آشامی اور ''ادبی دہشت انگیزی'' ملتی ہے۔ اسی وجہ سے سجاد ظہیر نے اس رجحان کو روکنے کے لیے ''اُردو کی جدید انقلابی شاعری'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اور اس انداز کی نظموں کی کوتاہیوں پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے کہا کہ یہ انقلاب کا ''خونی تصور'' ہے اور

اس زمانے میں کہ جنگل تھا یہ باغ
گلے بانوں نے ستاروں سے لگایا تھا سراغ
بھولے رستوں کا، جو بے دھیانی میں کھو جاتے ہیں
ایک اک لمحہ ستاروں ہی کا دھیان آتا ہے
ہر ستارہ مجھے لے جاتا ہے
اسی چوپال کے بے نام کنارے کی طرف
جس میں بیٹھے ہوئے انسان یوں ہی بے مصرف
میری ناکامی ترے نام کی رسوائی ہے
تلخ باتوں میں ہر اک رات بسر کرتے ہیں
بھولا ہوا رستہ کسی ڈوبی ہوئی کشتی کی طرح سطح پر اک پل میں ابھر آتا ہے
آنکھ میں اشک جھلکتے ہیں مگر اشکوں میں
وہ چمن، وہ مکاں اور وہ روزن -------- تینوں
گھلتے رنگوں کی طرح عکس بنا کرتے ہیں
ایک انساں کا جو تقدیر کی بے راہی سے
کبھی مالی، کبھی عاشق تھا، کبھی دیہاتی
گلے بانی میں جسے یاد جب آتے ماضی
بنسری اپنی بجاتے ہوئے رو دیتا ہے

یہ نظم کافی طویل ہے۔ اس نظم میں ابہام اس قدر ہے کہ نظم ناقابل فہم معلوم ہوتی ہے۔ اس نظم کو سمجھنے کے لیے ''کئی لوگ سر جوڑ کر بھی بیٹھے'' وہ بھی کسی ایک نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ خود میرا جی سے جب مفہوم بتانے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے جو مفہوم بتایا وہ نظم کے الفاظ سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔

میرا جی نہ صرف حلقۂ ارباب ذوق کے روح رواں تھے بلکہ حلقے کے سب سے زیادہ نمائندہ شاعر بھی تھے۔ وہ ہندوستانی ماحول اور ہندوستان کو جس انداز میں پیش کرتے ہیں وہ کسی اور اُردو شاعر کے ہاں نہیں ملتا گو کہ ان کی نظم ''تفاوت راہ'' میں بڑا ابہام اور اشاریت ہے، لیکن اس نظم کی پوری فضا خالص ہندوستانی ہے۔ میرا جی کے کلام کی یہ خصوصیت ایسی ہے جو انہیں اُردو شاعری میں منفرد بناتی ہے۔

میرا جی کی شاعری کی اس خصوصیت کے ساتھ ان کی شاعری کی بعض ایسی خصوصیات رہی ہیں، جن پر اعتراض ہوا ہے۔ ایک تو وہ جنسی احساس اور جذبات کا برملا اظہار کرتے ہیں دوسرے یہ کہ وہ بعض اخلاقی اقدار کا پاس و لحاظ نہیں کرتے۔ ان کی ایک نظم ''حرامی'' ہے جس میں ناجائز تعلقات کو سراہا گیا ہے۔

ترقی پسند ادیبوں نے اسی وجہ سے حلقۂ ارباب ذوق کے ادبا و شعرا کو ''ہئیت پرست، ابہام پرست اور جنس پرست ادیب'' کہا ہے۔ سردار جعفری نے 1951ء میں جب اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' لکھی تو حلقہ ارباب ذوق'' سے شدید اختلاف کیا اور کہا کہ ''اس زمانے میں ایک ایسے گروہ نے سر اٹھایا ہے جو ہئیت پرست، ابہام پرست اور جنس پرست ہے۔ اس گروہ کے مشہور نمائندے میرا جی، یوسف ظفر، ممتاز مفتی اور مختار صدیقی وغیرہ ہیں۔ یہ وہ ذہین اور ہوشیار لوگ ہیں جو یورپ کے انحطاطی ادب سے متاثر رہے اور شعور کے بجائے تحت الشعور پر اور معنویت اور مواد کو چھوڑ کر ہئیت اور اسلوب پر زور دیتے ہیں۔ یہ لوگ کھلم کھلا ترقی پسند تحریک کے مخالف ہیں۔''

سردار جعفری نے حلقۂ ارباب ذوق کی سخت مذمت کرتے ہوئے بھی حلقے کی بعض خوبیوں کا اعتراف کیا۔ انہوں نے حلقۂ ارباب ذوق سے تعلق رکھنے والوں کو ''ذہین'' کہا اور زیادہ منظم ثابت کیا۔ سردار جعفری نے حلقے کے لوگوں کو ہیئت، ابہام اور جنس پرست کہا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا کہ اس حلقے کی

بنیاد یہ ہے کہ ''ادب کا سماج سے کوئی تعلق نہیں۔'' سردار جعفری نے حلقے کی رومانیت کو ''مجہول اور گندی'' قرار دیا اور حلقے کو ''جاگیردار اور بورژوا انحطاط کی گندگی کا بدرو'' کہا۔ یوں ترقی پسندوں اور حلقے کے مصنفین کے درمیان شدید اختلاف قائم ہوگیا۔ ''فن برائے فن'' اور ''فن برائے زندگی'' کا یہ نظریاتی اختلاف کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. میراجی کی نظموں کی خصوصیات بتائیے۔
2. شاہد احمد دہلوی نے میراجی کی شاعری کے بارے میں کیا رائے ظاہر کی؟
3. حلقۂ ارباب ذوق پر سردار جعفری کا اعتراض کیا ہے؟

19.6 ن۔م۔راشد

حلقۂ ارباب ذوق پر لاکھ اعتراضات کیے جائیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حلقے نے اُردو ادب کو اور خاص طور پر اُردو شاعری کو نئے امکانات سے روشناس کرنے میں اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ جدید اُردو نظم کو ایک خاص موڑ دینے میں میراجی کے ساتھ ن۔م۔راشد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ایک خاص دور میں آزاد نظم کو اُردو میں استحکام اور وقار بخشنے میں انہوں نے جو کام کیا وہ حد درجہ اہم ہے۔ ن۔م۔راشد کی شاعری میں 'ندرت' کے ساتھ 'جدت' بھی ملتی ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون ''ہیئت کی تلاش میں'' لکھتے ہیں:

> ''ہر ندرت اس قابل نہیں کہ اسے آنکھیں بند کر کے قبول کر لیا جائے۔ جب تک ندرت کے ساتھ جدت بھی شامل نہ ہو وہ محض تکنیک کی بے جان نمائش بن کر رہ جاتی ہے۔ شاعری کی ترقی محض خلا میں قلابازیاں لگانے سے نہیں ہوسکتی بلکہ پرانے اور نئے اسکولوں کو آپس میں سمو کر نئی تخلیق کرنے سے ہوتی ہے۔''

پرانے اور نئے اسکولوں کو ملا کر نئی تخلیق کرنے کی ن۔م۔راشد نے صرف بات ہی نہیں کہی ہے بلکہ اپنی شاعری میں انہوں نے ان دونوں اسکولوں کو سمو کر اپنی شاعری میں ''ندرت'' کے ساتھ ''جدت'' بھی پیدا کی ہے جس کی روشن مثال ان کی نظم ''اسرافیل کی موت'' ہے۔ اس کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:

مرگِ اسرافیل پر آنسو بہاؤ
مرگ اسرافیل سے
اس جہاں میں بند آوازوں کا رزق
مطربوں کا رزق اور سازوں کا رزق
اب مغنی کس طرح گائے گا اور گائے گا کیا
سننے والوں کے دلوں کا تار چپ
اب کوئی رقاص، کیا تھرکے گا لہرائے گا کیا
بزم کے فرش و در و دیوار چپ
اب خطیب شہر فرمائے گا کیا
مسجدوں کے آستان و گنبد و مینار چپ
فکر کا صیاد اپنا دام پھیلائے گا کیا
طائرانِ منزل و کہسار چپ

مندرجہ بالا نظم کی ہیئتی ترتیب یہ بتاتی ہے کہ یہ آزاد نظم ہے لیکن اس کے باوجود اس میں پابند نظم کا انداز بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ ہر مصرعے میں

ایک سوال ملتا ہے اور دوسرے مصرعے میں جواب ہے۔ سوال کے مصرعوں میں ایک ہی ردیف و قافیہ ملتا ہے اور جواب میں بھی اس کا التزام رکھا گیا ہے۔ یوں اس نظم میں جدید و قدیم اسکولوں کو سمویا گیا ہے اور جدت کے ساتھ ندرت بھی پیدا کی گئی ہے۔ راشد کی نظموں میں اس طرح سے ''دونوں اسکولوں کو آپس میں سمو کر نئی تخلیق'' کی گئی ہے۔ ان کے کلام میں ہیئتی تجربوں کے ساتھ فکر و نظر میں ندرت بھی ملتی ہے۔ اور ان کی فکر کا ایک منفرد انداز ہے۔ ان کی نظموں میں زور بیان بھی ملتا ہے۔ یہ تمام باتیں ان کو اُردو شاعری میں ایک خاص مقام عطا کرتی ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ن۔م۔ راشد نے آزاد نظم کو کن نئے امکانات سے روشناس کروایا؟
2. نظم ''اسرافیل کی موت'' کی ہیئتی ترکیب کیا ہے؟
3. راشد نے کن دو اسکولوں سے استفادہ کیا ہے؟

19.7 حلقۂ ارباب ذوق کے دوسرے اہم شعرا

مختار صدیقی ارباب ذوق کے اہم شاعروں میں شامل ہیں۔ ان کی نظم ''بازیافتہ'' میں ایک ایسی عورت کو موضوع بنایا گیا ہے جو فرقہ وارانہ فساد کے دوران اغوا کر لی گئی تھی اور اب اس ہنگامے سے متاثر ہو کر یکا و تنہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ بچ گئی لیکن سوال یہ ہے کہ اب اس کی زندگی کی ناؤ کو کھینے والا کون ہوگا۔ یعنی اس کا ناخدا کون ہوگا؟ حلقۂ ارباب ذوق کے ایک اجلاس میں یہ بات زیر بحث آئی تھی کہ فرقہ وارانہ فسادات میں جو عورتیں متاثر ہوتی ہیں ان کو سماج میں ایک باعزت مقام دلانے میں ادیبوں کو بھی اپنا زور قلم صرف کرنا چاہیے۔ مختار صدیقی نے اپنی درج ذیل نظم میں اسی مسئلہ کے حل کی طرف سماج کو متوجہ کیا ہے:

اچھا خاصا سبک سا نقشہ
چہرہ پیلا لباس سادہ
ماحول سے جیسے تھک چکی ہو
تنہا تنہا' بلا ارادہ
آنکھیں جو کبھی رسیلی ہوں گی
اب ان کی اداسیوں کی تہہ میں
کیا کیا نہ تھے جاں گسل خانے
ہم آپ کو بے سنیں ہی سہمیں
طوفان میں جو ناؤ کھو گئی تھی
پھر آن لگی ہے اس کنارے
یوں تو ہے خدا کا شکر واجب
لیکن کسے نہ خدا پکارے

یوسف ظفر بھی حلقۂ ارباب ذوق کے اہم شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی شاعری کا انداز بہت منفرد ہے۔ ان کے کلام میں جذبات کی شدت اور گرمی ملتی ہے۔ بعض وقت ان کی شاعری میں علامات اور اشارات مبہم ہوتے ہیں لیکن بعض وقت وہ بہت صاف اور واضح انداز میں اپنا مافی الضمیر پیش کرتے ہیں۔ اس بیان کی تصدیق ان کی نظم ''زندان'' کے ان اشعار سے ہوتی ہے:

اب مرا عزم ہے فولاد کی مضبوط چٹان
اب یہاں کانچ کی تلواریں نہیں رہ سکتیں
اب میں خود آگ ہوں ہر شے کو جلا سکتا ہوں
مجھ سے اب ہاتھ اٹھالو کہ میں جا سکتا ہوں

(زنداں)

یوسف ظفر کے کلام میں زندگی کے مختلف مسائل اور ان مسائل سے پیدا ہونے والے جذبات اور احساسات ملتے ہیں۔ وہ عام الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے ان میں نئے معنی پیدا کرتے ہیں۔

قیوم نظر بھی حلقۂ ارباب ذوق کے سربرآوردہ شاعروں میں سے ایک ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں داخلی واردات کو معنی خیز انداز میں بیان کرتے ہیں۔ گو ان کی شاعری کا محور و مرکز داخلی دنیا ہے لیکن وہ خارجی دنیا کے حالات اور ماحول کو داخلی احساسات میں تبدیل کر کے بیان کرتے ہیں۔ ان کی ایک نظم ''اپنی کہانی'' ہے اس نظم میں ہندوستان کی غلامی کے دور کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ ہندوستان کی گویا قید کا زمانہ ہے۔ آزادی اگر حاصل نہ ہو تو زندگی قید ہی ہو جاتی ہے۔ اس نظم میں ہندوستان کے لیے شیر کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ وہ شیر جو قید میں رکھا گیا ہے۔ یہ قیدی شیر لوہے کی سلاخوں کے پیچھے ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان قید کی دیواروں کو گرا دے گا اور لوہے کی سلاخوں کو توڑ ڈالے گا۔ نظم میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ نظم کے چند شعر یہاں پیش کیے جا رہے ہیں:

تنگ و تاریک ہے اب روزن زنداں کی طرح
تلخی جبر میں لپٹا ہوا پامال کچھار
جس میں وہ بھورا سا اک ڈھیر پڑا ہو جیسے
اس کی آنکھوں میں ایک اتر ہے احساس کا خون
سرد لوہے کی سلاخیں ..... یہ گراں دیواریں
توڑ ہی ڈالے گا اب ٹھان چکا ہو جیسے (اپنی کہانی)

اس نظم میں ابہام اور اشاریت ملتی ہے۔ ترقی پسند مصنفین کو اسی ابہام اور اشاریت پر اعتراض تھا۔

حلقۂ ارباب ذوق کے ایک اور اہم شاعر ضیا جالندھری ہیں۔ وہ زندگی کے اس پہلو کو خاص طور پر موضوع سخن بناتے ہیں جو حزن و یاس سے مملو ہے۔ چونکہ ان کے انداز فکر میں قنوطیت ہے اس وجہ سے وہ زندگی کے خوش گوار پہلوؤں کو وقتی اور ناپائیدار سمجھ کر اس کی طرف التفات نہیں کرتے البتہ وہ غم اور ملال کو جاوداں سمجھتے ہیں اس لیے اپنی شاعری میں ان ہی کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ لیکن وہ ان ساری کیفیات کو حسن کارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ضیا کی شاعری میں جو درد و کرب کی کیفیت ہے اس کے بارے میں وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''یوں لگتا ہے جیسے یہ شاعر اپنے ہی کرب کی آگ میں جل کر کندن ہو گیا ہے اور اس کا داخلی نظام لمحے کے آشوب کی ماہیت کو پوری طرح پا گیا ہے۔ آغاز کار ہی میں اس کے سامنے روایتی عارفانہ تصورات کا ایک ڈھیر موجود تھا اور وہ چاہتا تو محض ہاتھ بڑھا کر اس سے اپنی پسند کی چیز اٹھا سکتا تھا..... آخر آخر میں اس جز و اور کل، قطرہ اور بحر کا راز منکشف ہوا تو قیاس کہتا ہے کہ وہ ان واردات سے خود گزرا ہے۔''

(نظم جدید کی کروٹیں۔ صفحہ ۱۷۱)

ضیا جالندھری نے بڑے شاعروں کے کلام کا مطالعہ تو کیا لیکن ان کی کورانہ تقلید نہیں کی بلکہ اپنے ہی تجربات اور واردات کو قلم بند کیا۔ ان کی ایک نظم ''آنسو'' کے چند اشعار سے ان کی شاعرانہ انفرادیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

سنوسنو آنسوؤں کی آواز سارے عالم پہ چھا رہی ہے
مگر میں کب سے ترس رہا ہوں
کہ میری پتھرائی خشک آنکھوں سے بھی کچھ آنسو
ابھرتی لہروں کی طرح ابھریں
اور ان کی حدت میں ڈھل کے بہہ جاتے میرے سینے کا درد سنگیں

دل پر جب غم کی گھٹا اس طرح چھائی ہوئی ہوتی ہے جو کھلتی ہے نہ برستی ہے۔ ایسی ہی کیفیت کو ضیا نے بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس طرح حلقۂ ارباب ذوق کے مختلف شاعروں نے اُردو شاعری کے دامن کو وسیع کرنے میں اپنا حصہ ادا کیا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. حلقۂ ارباب ذوق کے چند اہم شعرا کے نام بتائیے؟
2. قیوم نظر کی شعری خصوصیات بیان کیجیے۔
3. ضیا جالندھری کے کلام کی انفرادیت کیا رہی ہے؟

19.8 خلاصہ

حلقۂ ارباب ذوق 1939ء میں قائم ہوا۔ حلقۂ ارباب ذوق کا ابتدا میں نام ''بزم داستان گویاں'' تھا۔ ابتدا میں کوئی خاص مقصد پیش نظر نہیں تھا۔ چند احباب اپنی تخلیقات ایک دوسرے کو سنانے کے لیے ایک جگہ جمع ہوتے تھے۔ چند ہی نشستوں کے بعد ''بزم داستان گویاں'' کی جگہ ان احباب نے ''حلقۂ ارباب ذوق'' کا نام اختیار کیا۔ میراجی کے حلقے میں شامل ہونے سے حلقے کی سرگرمیوں میں نئی جان پڑ گئی اور وہ بہت جلد اس حلقے کے روح رواں بن گئے۔ میراجی بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن وہ نقاد بھی بہت اچھے تھے۔ میراجی کی شمولیت سے حلقے میں شعری تخلیقات پر خاص طور پر توجہ کی گئی۔ 1941ء میں حلقے نے جدید نظموں کا انتخاب ''1941ء کی بہترین نظمیں'' کے عنوان سے شائع کیا۔ اس انتخاب کی ادبی حلقوں میں اتنی پذیرائی ہوئی کہ سالہا سال تک سال کے ختم پر جدید منتخب نظمیں شائع ہونے لگیں۔ 1941ء ہی کی بہترین نظموں کے انتخاب میں حلقے نے اپنا نظریۂ ادب پیش کیا۔ اس میں میراجی نے ترقی پسند مصنفین کے ''ادب برائے زندگی'' یا ''فن برائے زندگی'' کے نظریے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''فن برائے فن'' یا ''ادب برائے ادب'' کے بغیر فن یا ادب پیدا نہیں ہوسکتا تو پھر اس کو ادب یا فن برائے زندگی کہنا بالکل ہی بے بنیاد بات ہے۔ جب تک فن یا ادب، فنی یا ادبی اصولوں کو پورا نہیں کرے گا اس وقت تک فن یا ادب پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ جب وہ فن یا ادب ہی سرے سے باقی نہیں رہے گا تو اسے ''برائے زندگی'' کہنا ایک مہمل سی بات ہے۔ میراجی نے اسی دیباچے میں اپنے آپ کو اور ان منتخب نظموں کو صحیح معنوں میں ترقی پسند کہا تھا کیونکہ ان کے نزدیک ''صحیح اور صحت مند ترقی پسندی مختصر الفاظ میں خیال افروزی کا دوسرا نام ہے''۔ جدید نظموں کے اس انتخاب میں جس کسی نظم میں انہیں ''خیال افروزی'' ملی ہے اس کو انہوں نے جدید نظموں کے انتخاب میں شامل کرلیا ہے خواہ اس کے لکھنے والے ترقی پسند شعرا ہوں یا حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا یا پھر دوسرے کوئی بھی شاعر ہوں۔

میراجی حلقۂ ارباب ذوق کے سب سے نمائندہ شاعر تھے۔ وہ اُردو نظم نگاری میں اپنا ایک منفرد انداز رکھتے ہیں۔ سردار جعفری نے حلقہ کے دوسرے شاعروں کے لیے خاص طور پر میراجی کی شاعری کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں ''ہیئت پرست' ابہام پرست اور جنس پرست'' قرار دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میراجی کی شاعری میں یہ تمام باتیں ملتی ہیں لیکن یہ تمام باتیں منفی قدر و قیمت نہیں رکھتیں۔ ہیئت کی شاعری میں بڑی اہمیت ہے کہ جب تک کوئی ہیئت اختیار نہ کی جائے شاعری ممکن نہیں۔ اسی طرح ہیئت کے تجربے شاعری میں ہمیشہ کیے گئے ہیں اور خود ترقی پسندوں نے بھی یہ تجربے کیے ہیں۔ ابہام کی اہمیت ادب اور شاعری میں بے حد ہے۔ تشبیہ' استعارے اور علامتیں سب شاعری اور ادب کی لازمی شرطیں ہیں۔ جنسیت بھی شاعری میں ہمیشہ سے رہی ہے لیکن اس سلسلے میں یہ کہنا ضروری ہے کہ یہ باتیں حد سے زیادہ ہوں تو قابل اعتراض بن جاتی ہیں۔ میراجی کی شاعری میں بھی یہ باتیں

بعض وقت ضرورت سے زیادہ ملتی ہیں۔اس کے باوجود میراجی کی شاعری میں ایک خاص طرح کی جاذبیت ملتی ہے۔جیسا کہ شاہد احمد دہلوی نے کہا ہے کہ میراجی کی شاعری ایک خاص کشش رکھتی ہے۔اور اس میں وہ اسی طرح دلچسپی لیتے تھے جیسے ایک معمے میں دلچسپی لی جاتی ہے۔ان تمام باتوں کے علاوہ میراجی کی شاعری میں جیسا کہ وزیر آغا نے کہا ہے 'ہندوستانیت ملتی ہے' جو اُردو کے دوسرے شاعروں میں کم ہی نظر آتی ہے۔

ن۔م۔راشد حلقۂ ارباب ذوق کے بے حد اہم شاعر ہیں۔انہوں نے اُردو نظم نگاری کو ایک خاص موڑ دیا۔آزاد نظم کو وقار اور استحکام دینے میں ن۔م۔راشد کی اہمیت ہمیشہ اُردو شاعری میں رہے گی۔وہ ''ندرت'' کے ساتھ ''جدت'' کو شاعری میں ضروری سمجھتے ہیں اور اسی پر کاربند بھی رہتے ہیں۔ان کی شاعری میں فکر انگیزی بھی ملتی ہے۔ان کے پاس ہیئت کے نئے تجربے بھی ملتے ہیں۔مثلاً ''اسرافیل کی موت'' میں انہوں نے آزاد نظم اور پابند نظم کے عناصر کو ملا کر ایک نیا تجربہ کیا۔وہ اُردو شاعری اور خاص طور پر اُردو نظم نگاری میں بہت ہی ممتاز اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔

حلقۂ ارباب ذوق کے دوسرے اہم شاعروں میں مختار صدیقی' یوسف ظفر' قیوم نظر اور ضیا جالندھری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

19.9 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. حلقۂ ارباب ذوق کا نظریہ ادب کیا تھا؟
2. حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ چند شعرا کی شاعری پر روشنی ڈالیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. حلقۂ ارباب ذوق کی ابتدا کب اور کیوں کر ہوئی؟ تفصیل سے لکھیے۔
2. میراجی کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجیے۔
3. ن۔م۔راشد کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

19.10 فرہنگ

موقر = توقیر والا۔عزت والا

لاشعور = فرائیڈ نے عمقی نفسیات (Depth Psychology) کا نظریہ پیش کیا ہے۔وہ انسانی ذہن کو تین حصوں میں بانٹتا ہے۔اس کے اوپری حصے کو وہ Super Ego یا شعور کہتا ہے۔اس کے نیچے کا حصہ Ego ہے جس کو تحت الشعور کہا گیا ہے۔Ego کے نیچے Id لاشعور ہوتا ہے۔اِڈ یا لاشعور میں انسان کی ساری جبلتیں دبی ہوئی ہوتی ہیں۔جبلت ایسی خواہش ہے جس پر ہمیں اختیار نہیں ہوتا۔مثلاً بھوک' پیاس' نفرت' محبت وغیرہ یعنی ہم اگر یہ چاہیں کہ ہمیں بھوک یا پیاس نہ لگے تو یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ ہم بھوک کے باوجود کھانا نہ کھائیں اور پیاس لگنے پر پانی نہ پئیں۔بھوک اور پیاس ہمارے نہ کھانے سے ختم نہیں ہوجاتے خواہش کو ہم دبا لیتے ہیں۔لاشعور میں اس طرح سے دبائی ہوئی خواہشیں یا جبلتیں موجود رہتی ہیں اور جب بھی موقع ملتا ہے اپنی تشفی کر لیتی ہیں۔اس طرح بے شمار جبلتیں اور خواہشیں ہمارے لاشعور میں موجود ہوتی ہیں۔فرائیڈ کا کہنا ہے کہ ہمارا ایگو' اڈ پر اس طرح مسلط رہتا ہے جس طرح گھڑ سوار' گھوڑے پر ہوتا ہے۔شعور' تحت الشعور اور لاشعور کے بارے میں فرائیڈ کا کہنا ہے کہ شعور کے مقابلے میں تحت الشعور اور لاشعور بہت وسیع اور بڑے ہوتے ہیں۔برف جس طرح پانی میں ہوتا ہے کہ اس کا صرف تھوڑا سا حصہ پانی کی سطح کے اوپر ہوتا ہے لیکن پانی کی سطح کے نیچے برف کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔بالکل یہی حال شعور' تحت الشعور اور لاشعور کا ہے۔

19.11 سفارش کردہ کتابیں

یونس جاوید	حلقہ ارباب ذوق
سردار جعفری	ترقی پسند ادب
وزیر آغا	نظم جدید کی کروٹیں
یعقوب یاور	ترقی پسند تحریک اور اُردو شاعری
خلیل الرحمٰن اعظمی	اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

شعری مجموعے:

ن۔م۔راشد	(1) لا=انسان	(2) ماورا	(3) ایران میں اجنبی
ضیا جالندھری	(1) سرشام	(2) نارسا	
یوسف ظفر	(1) زنداں	(2) زہر خند	(3) صحرا بہ صحرا
قیوم نظر	قندیل		

اکائی: 20 سلطان محمد قلی قطب شاہ۔حیات اور نظم نگاری

ساخت

20.1 تمہید

20.2 واقعاتِ حیات

20.2.1 شہر حیدرآباد کا قیام اور رفاہی کارنامے

20.2.2 محمد قلی کے تخلص اور قادرالکلامی

20.3 کلیات محمد قلی

20.4 غزلیں اور نظمیں

20.5 نظم کی صنف

20.6 محمد قلی کی نظم نگاری

20.6.1 ہندوستانیت اور اتحاد پسندی

20.6.2 نوروز، بسنت اور مرگ

20.6.3 محلات شاہی اور برس گانٹھ

20.6.4 محمد قلی کی محبوبائیں

20.7 لسانی خصوصیات

20.8 محمد قلی کی نظمیں

20.9 اشعار کی تشریح (پریم کی کہانی)

20.10 خلاصہ

20.11 نمونہ امتحانی سوالات

20.12 فرہنگ

20.13 سفارش کردہ کتابیں

20.1 تمہید

اس اکائی میں ابتداً قطب شاہی سلطنت کے پانچویں حکمران سلطان محمد قلی قطب شاہ کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور پھر ایک عظیم الشان سلطنت کے رعایا پرور حکمران کی حیثیت سے اس کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی کارناموں کا سرسری تعارف کرواتے ہوئے اس کی نظم نگاری کی ہمہ جہت خصوصیات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کو اپنے والد ابراہیم قطب شاہ سے ایک وسیع اور طاقتور حکومت ورثے میں ملی تھی۔ وہ نہ صرف ایک کامیاب حکمران تھا بلکہ فن تعمیر، رقص و موسیقی اور خطاطی کا بھی دل دادہ تھا۔ شہر حیدرآباد کا قیام، چار مینار اور جامع مسجد کے علاوہ اس کے عہد میں بے شمار محلات شاہی، باغات، عاشور خانے، مدرسے اور کاروان سرائیں بنوائیں گئیں۔ محمد قلی نے اپنی رعایا کے مختلف طبقوں اور فرقوں کے درمیان اتحاد پسندی، یکجہتی اور بھائی چارگی کے جذبات کی ترویج کے سلسلے میں غیر معمولی خدمات انجام دیں۔

آنے والے زمانے میں ممکن ہے کہ محمد قلی کی بنوائی ہوئی عمارتیں نیست و نابود ہو جائیں اور اس کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی کارناموں کو فراموش کر دیا جائے۔ تاہم بہ حیثیت شاعر وہ اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

20.2 واقعاتِ حیات

مملکت گولکنڈہ کا پانچواں فرمانروا سلطان محمد قلی قطب شاہ نہ صرف ایک عظیم الشان سلطنت کا رعایا پرور حکمران، بانیٔ شہر حیدرآباد، دکنی تہذیب وتمدن کا معمار، فن تعمیر، فن خطاطی اور رقص وموسیقی کا دلدادہ تھا بلکہ دکنی اُردو، فارسی کا ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا۔ محمد قلی قطب شاہ، قطب شاہی سلطنت کے چوتھے تاجدار ابراہیم قطب شاہ کا تیسرا فرزند تھا۔ اس کی ولادت 14 رمضان المبارک 973ھ مطابق 14 اپریل 1565ء کو جمعہ کے دن گولکنڈے میں ہوئی۔ اس کی پیدائش کی خوشی میں گولکنڈے میں کئی روز تک جشن منایا گیا۔ غریبوں محتاجوں اور فقیروں کو انعامات اور خلعت عطا کی گئی۔

محمد قلی قطب شاہ 21 ربیع الثانی 988ھ م جون 1580ء بروز جمعہ جب کہ اس کی عمر 14 سال 8 مہینے اور 8 دن تھی، گولکنڈے کے تخت پر متمکن ہوا۔ اور اس نے تقریباً اکتیس سال تک نہایت شان وشوکت کے ساتھ حکومت کر کے 47 سال کی عمر میں 17 ذی قعدہ 1020ھ کو اس دارفانی سے کوچ کیا۔ اس کے عہد حکومت میں دو ایک معمولی جنگوں اور اندرونی خلفشار کے سوا بڑی حد تک امن وامان کا دور دورہ تھا۔ اس کے مخالفین نے حکومت کا تختہ الٹنے یا اسے پریشان کرنے کے سلسلے میں کبھی کبھی ہنگامے بھی کھڑے کیے لیکن محمد قلی کو اپنے مخالف گروہوں کی سرکوبی کے سلسلے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

محمد قلی قطب شاہ کی تعلیم وتربیت اس کے بڑے بھائیوں کے مقابلے میں ادھوری اور ناقص ہوئی تھی کیونکہ کم عمری کے زمانے میں ایک وسیع و عریض ملک کی حکمرانی کا بوجھ اس کے کندھوں پر پڑ گیا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بالکل ناخواندہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اسے مذہبی علوم، فقہ، منطق، تاریخ، تصوف پر مہارت حاصل نہیں تھی لیکن فنِ شاعری میں اسے غیر معمولی مہارت اور ملکہ حاصل تھا۔ فارسی کے مشہور اساتذہ جیسے انوری، خاقانی، ظہیر فاریابی، حافظ شیرازی وغیرہ سے اس نے استفادہ حاصل کیا تھا اور ان شعرا سے اپنے کلام کا تقابل بھی کیا ہے۔

نزاکت شعر کے فن خدا بخشیا ہے تو تج کوں — معانی شعر تیرا ہے کہ یا ہے شعر خاقانی

شعر تیرا دُر و گوہر ہے معانی سب میں — شعر حافظ کے سر اوپر رہے تاج پرویز

اگر فیروز ہور محمود بیہوش ہوئیں عجب کیا ہے — ہوئے تجھ وصف نا کر سک ظہیر ہور انوری بیہوش

20.2.1 شہر حیدرآباد کا قیام اور رفاہی کارنامے

شہر حیدرآباد کا قیام اور اس شہر میں رہنے بسنے اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں میل ملاپ اور محبت واخوت کے جذبات کی ترویج، محمد قلی کے دور حکومت کے دو یادگار کارنامے ہیں۔ محمد قلی کے عہد میں قلعہ گولکنڈہ کے اطراف آبادی بے ہنگم طور پر پھیلتی جارہی تھی اور یہ شہر آبادی کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر تھا۔ اس لیے محمد قلی نے 999ھ (1591-1590ء) میں شہر حیدرآباد کی بنیاد رکھی۔ اس کی اولوالعزمی اور بلند خیالی ایک وسیع اور منصوبہ بند شہر کی طلب گار تھی۔ شہر کے بیچوں بیچ انتہائی پرکشش اور بلند وبالا چار مینار کی تعمیر کروائی گئی اس کے اطراف چاروں جانب چار راستے بنائے گئے اور قرب وجوار میں متعدد شاہی محل تعمیر کروائے گئے۔ محمد قلی نے اس شہر کے قیام کے ساتھ ہی اس بات کا پورا خیال رکھا کہ اس میں ایک متمدن زندگی کی تمام ضرورتیں موجود ہوں۔ چنانچہ اس شہر میں بے شمار بازار، خانقاہیں، باغات، محلات، مسجدیں، مدرسے، لنگر خانے، مہمان خانے اور کاروان سرائیں بنوائی گئیں۔ محمد قلی کے بنوائے ہوئے باغات اور محلات شاہی میں ''باغ محمد شاہی''۔ ''دادمحل''۔ ''اعلیٰ محل''۔ ''خداداد محل'' اور ''محل کوہ طور'' کا تذکرہ اس کے کلام میں بھی ملتا ہے۔ ان کے علاوہ ''نبات گھاٹ''۔ ''حنا محل''۔ ''چندن محل''۔ ''ندی محل''۔ ''سجن محل'' اور دوسرے متعدد محلات موجود تھے جہاں وہ داد عیش دیتا تھا۔ موجودہ حیدرآباد کے محلہ شاہ گنج وچوک کی جگہ قطب شاہی دور میں ایک بہت بڑا میدان تھا۔ جس کے بیچوں بیچ ایک وسیع وعریض حوض بنایا گیا تھا اور اس کے اطراف بازار بنائے گئے تھے۔ اسی میدان کے مقابل چار منزلہ دادمحل تعمیر کیا گیا تھا جس پر کوئی دربان نہیں ہوتا تھا اور جہاں فریادی براہ راست بادشاہ کے سامنے اپنا دکھ درد بیان کر سکتے تھے اور خود بادشاہ دادرسی کرتا تھا۔ دادمحل قطب شاہی سلطنت کے زوال تک موجود تھا اور اورنگ زیب کی فتح دکن کے بعد یہ محل نیست ونابود کر دیا گیا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ جب اس محل پر شہنشاہ اورنگ زیب کی نظر پڑی تو اس کی زبان سے نکلا ''ایں بلند بلند چیست''، نعمت خان عالی نے جواب دیا ''دادمحل است'' اورنگ زیب نے کہا ''آرے شداد محل است'' اور پھر اس محل کو ڈھا دیے جانے کا حکم دیا۔

989ھ م 1581ء میں ایران کے مشہور عالم مدبر اور دانشور میر مومن حیدرآباد آئے تھے۔ جنھیں محمد قلی نے اپنا پیشوائے سلطنت مقرر کیا تھا۔ حکومت کے سارے کاروبار کی عام نگرانی میر مومن ہی کے سپرد تھی۔ اس لیے محمد قلی کو سیاسی فکروں سے بے نیاز رہ کر عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کا موقع مل گیا۔ کوئی تعجب نہیں کہ شہر حیدرآباد کا نقشہ بنانے اور اس کی تزئین کاری میں بھی میر مومن کا دخل رہا ہو۔ ملک میں امن وامان اور فارغ البالی ہونے کی وجہ سے محمد قلی کو عوامی بہبود اور رفاہ عام کے کام کرنے کا موقع ملا چنانچہ اس دور میں قانون میں بہت کچھ اصلاحیں ہوئیں اور مالگزاری میں معقول رعایت دی گئی۔ بادشاہ کے خاص خزانچی میر ابوطالب کا بیان ہے کہ سالانہ 60 ہزار ہون خیرات کی مد میں خرچ ہوتے تھے جس میں سے 12 ہزار ہون ماہ محرم میں مسکینوں اور غریبوں کی امداد کے طور پر صرف ہوتے تھے۔

ڈاکٹر زور نے محمد قلی کی نیکیاں کے عنوان سے اس کی فیاضی اور داد و دہش کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ رقم عمارتوں کی تعمیر میں صرف کی۔ چنانچہ ناظر الملک میر ابوطالب نے محمد قلی کی بنوائی ہوئی عمارتوں کے اخراجات 70 لاکھ ہون (تقریباً 5 کروڑ روپے) بتائے ہیں۔ محمد قلی نے اپنی زندگی میں کسی کے قتل کا حکم نہیں دیا اور اگر ایسا مقدمہ پیش بھی ہوا تو اس کو دار القضا کے سپرد کر دیتا تھا تا کہ احکام کی روشنی میں تصفیہ کر دیا جائے۔ محمد قلی کی خاطر تواضع کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے دسترخوان پر روزانہ ایک ہزار آدمی اس کے ساتھ موجود رہتے تھے۔ جن میں امیر، غریب، دیسی، بدیسی سبھی شامل تھے۔

محمد قلی قطب شاہ کی انسان دوستی اور مذہبی رواداری کا یہ عالم تھا کہ غیر مسلموں اور خصوصاً ہندوؤں کی سرپرستی میں وہ اپنی مثال آپ تھے اس کے بااعتماد مشیروں، عمائدین سلطنت اور مقربین میں بہت سے ہندو بھی شامل تھے۔ ہندو رعایا اور امرا کے ساتھ وہ بڑے حسن وسلوک سے پیش آتا تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ محمد قلی ایک ہندو خاتون بھاگیرتی کے بطن سے تھا۔ کوئی تعجب نہیں کہ محمد قلی کے مزاج کی تشکیل میں اس کی ماں کا اثر بھی کارفرما رہا ہو۔ محمد قلی کی شخصیت میں جہاں ایک طرف اکبر اعظم کی رواداری اور وسیع المشربی کی جھلک دکھائی دیتی ہے تو وہیں دوسری طرف جہانگیر کی منصف مزاجی و دادرسی اور شاہ جہاں کا ذوق لطیف اور فن تعمیر سے غیر معمولی دلچسپی کا احساس ہوتا ہے۔

20.2.2 محمد قلی کے تخلص اور قادر الکلامی

موجودہ معلومات کی روشنی میں محمد قلی اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ یوں تو اس سے قبل اور بھی غزل گو گزرے ہیں۔ جیسے مشتاق، لطفی، فیروز، محمود، خیالی، وجہی، شیخ احمد گجراتی وغیرہ لیکن کسی شاعر کا ردیف وار مرتبہ مکمل دیوان ہنوز دستیاب نہیں ہوا۔ تاریخ ادب اُردو میں محمد قلی کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس نے مقطعوں میں بدل بدل کر سب سے زیادہ تخلص استعمال کیے ہیں۔ دکنی اُردو کے دوسرے شعرا فیروز، وجہی، غواصی وغیرہ نے تین یا زیادہ سے زیادہ چار تخلص استعمال کئے ہیں۔ جیسے:

1) فیروز	2) فیروزی	3) فیروزیا	
1) وجہی	2) وجیہی	3) وجیہہ	4) وجہیا اور
1) غواص	2) غواصی	3) غواصی	4) غواصیا

لیکن محمد قلی نے اپنے مقطعوں میں اٹھارہ (18) تخلص استعمال کیے ہیں:

(1) محمد (2) محمد شاہ (3) محمد قلی (4) محمد قطب (5) قطب (6) قطبا (7) قطب زماں (8) قطب شہ (9) محمد قطب شہ

(10) محمد قطب شہ غازی (11) محمد قطب شہ راجہ (12) محمد قطب شہ سلطان (13) محمد قطب شہ نواب (14) معانی (15) قطب معانی

(16) قطب معنا (17) قطب معنی (18) ترکمان

ڈاکٹر زور کا بیان ہے کہ محمد قلی نے اُردو شاعری کے لیے معانی، فارسی کے لیے قطب شہ اور تلگو کے لیے ترکمان کا تخلص استعمال کیا اور مذکورہ تخلصوں میں سب سے زیادہ معانی، قطب، قطب شہ اور ترکمان استعمال ہوئے ہیں۔

پروفیسر مسعود حسین خاں کے خیال میں محمد قلی کی شاعری کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس سال ہو سکتی ہے۔ 15 سال کی عمر میں حکمران ہوا اور 47 سال

کی عمر میں اس جہاں کو خیر باد کہا۔ اس کے اشعار کی کل تعداد پچاس ہزار بتائی گئی ہے۔ ایک طرح سے اوسطاً اس نے دو ہزار اشعار فی مہینہ یا روزانہ 150 اشعار کہے ہیں۔ وہ ایک پرگو اور قادرالبیان شاعر تھا۔ اپنی قادرالکلامی کا تذکرہ کرتے ہوئے محمد قلی کہتا ہے۔

صدقے نبی قطب شاہ یوں شعر بولے ہر دن　　دریا کو روز جوں ہے موجاب کا طلوع

اپنی معلومات کی جانچ:

1. محمد قلی کس سنہ میں پیدا ہوا؟ اور کب تخت نشین ہوا؟
2. محمد قلی نے کس شہر کی بنیاد رکھی؟
3. چار مینار کس سنہ میں تعمیر ہوا؟
4. محمد قلی نے کتنے تخلص استعمال کیے ہیں؟

20.3 کلیات محمد قلی

کلیات محمد قلی قطب شاہ کو ڈاکٹر زور نے 1940ء میں مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ پروفیسر سیدہ جعفر کا مرتبہ ایڈیشن چند ضروری اضافوں کے ساتھ 1985ء میں منظر عام پر آیا۔ موخرالذکر کلیات محمد قلی کے حصہ اول میں حمد، نعت، منقبت، مناجات اور مدح بی بی فاطمہ کے علاوہ مختلف عیدوں، تہواروں جیسے عید میلاد النبیؐ، شب معراج، عید سوری، عید مولود علیؓ، عید غدیر، شب برات، عید رمضان، بقرعید، نوروز، بسنت، شاہی تقاریب اور رسوم و رواج جیسے بادشاہ کی سال گرہ، پیاری کا جلوہ، راج ترانہ وغیرہ کھیلوں جیسے چوگان، پھوکڑی پھو، کھمڈی، موسموں جیسے برسات، مرگ، تھنڈ، کالا، شاہی محلوں جیسے خداداد محل، اعلیٰ محل، محل کوہ طور، قطب مندر، بارہ پیاریوں جیسے نھنی، سانولی، کنولی، گوری، چھبیلی، پیاری، لالہ، لالن، موہن، حیدر محل، محبوب، مشتری، دوسری پیاریاں (محبوبائیں): بلقیس زمانی، حاتم، بہمنی ہندو، ہندی چھوری، پدمنی، سندر بجن، رنگیلی، نور کی مورت، کسبنا، ساجنی اور دیگر منظومات: سراپا، مست شباب، ادائے حسن، چنچل نین، ہلالی بھوں، مکھ اور مکا، سروراں، چلکر بال، کجل نینی، رخ زیبا، تصویر حسن، کندن کی پتلی، بجن مکھ کا اجالا، چاندنی اور خرام ناز، تیرا سائیں تجھ میں، کافریت، شاعر کا عشق، آپا رعیش، دھن وصل، نین ماتے، الک بکھرے، رشک و رقابت، بوڑھی کی کہانی، پیر کا مایا، بچن گن، فتنہ دکن، عاشقان کا نیم، دکن پتلی، شاعر اور حیدر نگر اور غم فرقت عنوانات کے تحت 229 نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ ضمیمے میں ''غیر مطبوعہ نظمیں'' کے عنوان سے عید میلاد النبیؐ، عید رمضان، بقرعید، شب برات اور حنان محل کے موضوعات کے تحت مزید 11 نظمیں ہیں۔ اس طرح جملہ نظموں کی تعداد 240 ہو جاتی ہے۔ کلیات محمد قلی کا حصہ دوم قصیدوں، غزلوں، رباعیوں، مرثیوں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں 279 غزلیں، 12 قصیدے، 38 رباعیاں، 30 ریختیاں (تین ریختیوں کے متفرق اشعار اس کے علاوہ ہیں) پانچ مرثیے (ضمیمے میں ایک مرثیہ اور ہے) ایک قطعہ، دو چہار، در چہار، ایک نامکمل مثنوی اور چند متفرق اشعار شامل ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. محمد قلی کا کلیات کتنی بار شائع ہوا؟
2. محمد قلی نے کون کون سی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی؟

20.4 غزلیں اور نظمیں

محمد قلی قطب شاہ نے کم و بیش تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے کلیات میں حمد و مناجات اور نعت و منقبت کے علاوہ غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی وغیرہ سبھی اصناف سخن موجود ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کا شاعر ہے۔ اس صنف سخن کو اس نے اپنی کلیات میں وسیع پیمانے پر استعمال کیا ہے۔ مثنوی، رباعی، قطعہ اور چہار در چہار کو چھوڑ کر اس کا سارا کلام غزل کی ہیئت (Form) میں ہے۔ ڈاکٹر زور نے اپنے مرتبہ کلیات کے حصہ اول میں

محمد قلی کی نظمیں یکجا کی ہیں۔اور اپنی طرف سے ان پر عنوانات بھی قائم کیے ہیں۔ڈاکٹر زور کی تقلید میں پروفیسر سیدہ جعفر نے بھی اپنے مرتبہ کلیات محمد قلی کے پہلے حصے کو نظموں کے لیے مختص کیا ہے۔حالانکہ یہ ساری نظمیں درحقیقت غزلیں ہیں۔ان میں مطلع اور مقطع بھی ہے اور قوافی کا اہتمام بھی۔کلیات محمد قلی کے کسی بھی قلمی نسخے میں عنوانات نہیں ہیں اور خود محمد قلی بھی ان تخلیقات کو ''غزل'' ہی کہتا ہے۔جیسے ''غزلِ سوری''۔''غزلِ مرگ''۔''مبعث کا غزل''، وغیرہ۔

محمد صدقے قطبا کی ''غزل سوری'' کی پوری سن — سکیاں مستاں ہوریاں یوں جوں شراباں پی طہوراں کے
خوش نبی ہور علی کے صدقے غزل مرگ کی کہیا — سو قطب نورسوں جم ترے کہ جوں سورج کرناں ہیں
نبی صدقے کہیا ہے قطب ''مبعث کا غزل'' رنگیں — کہ اس کی تازگی ہور روشنی تھے ہے جہاں روشن

پروفیسر مسعود حسین خاں اس کی غزلوں کو عنوان دے کر انھیں نظم کے معیار پر جانچنے کے عمل کو محمد قلی کے ساتھ ناانصافی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''محمد قلی کے پیش نظر نظمیں لکھنا مقصود نہیں تھا اس نے تو تمام تر غزل کی ہیئت کو استعمال کیا ہے چنانچہ مرگ پر لکھی ہوئی نظم کو وہ غزلِ مرگ کا نام دیتا ہے۔

ع۔ خوش نبی ہور علی کے صدقے غزل مرگ کی کہیا

ایسی صورت میں ظاہر ہے اس کی غزلوں کو عنوان دے کر نظم کے معیار پر جانچنا اس کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔اس کی غزلوں میں عیدیں ہوں یا شبرات، نوروز ہو یا برش کالا اور تھنڈ کالا ان میں خارجیت اسی قدر آ سکی ہے جتنی کہ غزل کی ہیئت اس کی متحمل ہو سکتی ہے۔''

محمد قلی قطب شاہ نے ایک ایسے دور میں صنفِ غزل کو خصوصی طور پر اپنی طبع کا موضوع بنایا ہے جب کہ دبستانِ دکن میں مثنوی کا سکّہ چل رہا تھا۔ اس کے ہم عصر شاعروں میں وجہی، احمد گجراتی، غواصی وغیرہ سب کے سب مثنوی نگار تھے۔یہی وجہ ہے کہ محمد قلی نے ''تنگنائے غزل'' کو ''بیان کی وسعتوں'' سے ہم کنار کرنے کے لیے، اس صنفِ سخن میں نئے امکانات تلاش کیے اور غزل کی ہیئت میں عشقیہ اور بیانیہ دونوں قسم کی شاعری کی۔اس کے عشقیہ کلام میں منتشر خیالی دکھائی دیتی ہے تو بیانیہ کلام میں خیال کا ربط اور تسلسل نظر آتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. محمد قلی کے کلیات کو مرتبین نے کتنے حصوں میں تقسیم کیا ہے؟
2. محمد قلی کے عہد میں کس صنف سخن کو مقبولیت حاصل تھی؟

20.5 نظم کی صنف

نظم کا لفظ عموماً نثر کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس سے جملہ اصناف شاعری مراد لیے جاتے ہیں۔اس اعتبار سے قصیدہ، مثنوی، غزل، مرثیہ، رباعی وغیرہ ساری اصناف سخن نظم کے تحت آتی ہیں۔لیکن شاعری کی اصطلاح میں نظم اس مخصوص صنف سخن کو کہتے ہیں جسے غزل کے مقابلے میں رکھا جاتا ہے۔غزل کی ہیئت (Form) مخصوص ہوتی ہے۔اس کے تمام اشعار میں ایک ہی قافیے اور ردیف کی پابندی کی جاتی ہے۔لیکن جہاں تک موضوعات اور مضامین کا تعلق ہے، غزل کے اشعار ایک دوسرے سے مربوط نہیں ہوتے۔اس کے برعکس نظم کی ہیئت مخصوص نہیں ہوتی۔نظم، مثلث، مثمن، مخمس، مربع، مسدس کسی بھی ہیئت میں کہی جا سکتی ہے اور غزل کے مقابلے میں نظم کے تمام شعر یا تمام بند ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔

نظم عربی زبان کا لفظ ہے۔جن کے معنی لڑی، سلک یا ہار کے ہیں۔چونکہ نظم میں خیالات کا تسلسل ہوتا ہے اور یہ ایک ہی موضوع پر کہی جاتی ہے، اس لیے نظم کو ایک مخصوص عنوان سے بھی آراستہ کیا جاتا ہے۔اردو میں نظم نگاری کا آغاز محمد قلی قطب شاہ سے ہوتا ہے۔اس سے پہلے نظم نگاری کے کوئی نمونے نہیں ملتے۔محمد قلی کے ہم عصر شعرا اور بعد کے دکنی شعرا میں غواصی، علی عادل شاہ شاہی، ہاشمی بیجاپوری کے دیوان میں ایسی غزلیں موجود ہیں جن میں خیال کا

تسلسل پایا جاتا ہے۔اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ اُردو شاعری کے دکنی دور میں نظم نگاری کے لیے بھی غزل کی ہیئت کا استعمال کیا جاتا تھا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. نظم کی تعریف کیجیے۔
2. نظم اور غزل کا فرق واضح کیجیے۔

20.6 محمد قلی کی نظم نگاری

جہاں تک محمد قلی کی نظم نگاری کا تعلق ہے اس میں حمد و مناجات، نعت و منقبت اور مدح بی بی فاطمہ جیسی مذہبی نظمیں بھی شامل ہیں اور اُس نے عیدوں اور موسموں جیسے عید میلاد النبیؐ، عید بعث نبی، عید سوری، عید مولود علی، عید غدیر، عید رمضان، بقر عید، مرگ (آمد برسات) بسنت اور موسم سرما (ٹھنڈ کالا)، محلات شاہی جیسے خداداد محل، کوہ طور کا محل، حیدر محل وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔اس کے علاوہ اُس کے یہاں مختلف کھیلوں جیسے چوگان، کھمڈی، کوکانٹ، پھوکڑی پھو، ناٹک پر اور اس کی متعدد محبوباؤں جیسے سانولی، کنولی، گوری وغیرہ پر بھی نظمیں ملتی ہیں۔ان منظومات کے مطالعے سے محمد قلی کی ایک طرف وسعت فکر و نظر، پر گوئی اور قادر البیانی کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کی شاعرانہ صناعی اور فن کاری کا بھی پتہ چلتا ہے۔کلیات کا آغاز ایک خوبصورت اور مرصع حمد سے ہوتا ہے۔چند شعر ملاحظہ ہوں:

چند سور تیرے نور تھے نس دن کوں نورانی کیا — تیری صفت کن کر سکے توں آپی میرا ہے جیا
تج نام منج آرام ہے، منج جیو سو تج نام ہے — سب جگ سوں کام ہے، تج نام جپ مالا ہوا
بہو تک میا سیتے اپنا دیتا قطب کوں سب دکن — سیسوں نبی کانت چرن جب لگ ہے تن میانے جیا

اس غیر مردف حمد میں محمد قلی نے اپنے کمال فن کا جادو جگایا ہے۔مطلع میں اگر چہ صرف دو قافیوں ''کیا'' اور ''جیا'' کا استعمال کیا گیا ہے لیکن بعد کے اشعار میں ایک ایک سے زاید قوافی جیسے ''آرام''۔''نام''۔''اپن''۔''دکھن''۔''چرن'' کا اہتمام کر کے اس نے نغمگی اور موسیقیت کے احساس کو جگایا ہے۔پروفیسر مسعود حسین خاں اس حمد کے متعلق یوں رطب اللسان ہیں:

> ''کیا بہ اعتبار کمال فن اور کیا بہ اعتبار قلبی واردات اسے اُردو کی بہترین حمدوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔اس قسم کی نظموں میں محمد قلی نے اپنی تمام تر عیش کوشی کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔اسی لیے یہ نہایت عاجزانہ انداز میں دل کی گہرائیوں سے برآمد ہوئی ہے۔'' (محمد قلی قطب شاہ۔صفحہ ۳۶)

20.6.1 ہندوستانیت اور اتحاد پسندی

محمد قلی ہندوستانیت کا بہت بڑا پرستار ہے۔اس کی رگ و پے میں ہندوستان کی تہذیب سرائیت کر گئی ہے۔وہ ہندوستانی ماحول، یہاں کے رسوم و رواج، عیدین اور تہواروں کو اپنے خیالات میں بسالینا چاہتا ہے۔وہ ایک تلنگن عورت بھاگیرتی کے بطن سے تھا۔اتحاد پسندی، رواداری، بھائی چارگی اور یگانگت کی روایات اسے ورثے میں ملی تھیں۔اسے ہندوستانی مزاج سے وہی مناسبت تھی جو امیر خسرو اور اکبر اعظم کو تھی۔محمد قلی کا کلام اپنے عہد کی ایک سماجی اور تہذیبی دستاویز ہے۔اس کی شاعری کے مطالعے سے قطب شاہی عہد کی سماجی زندگی سے متعلق بہت کچھ مواد حاصل کیا جاسکتا ہے۔شادی بیاہ کے رسوم، مختلف عیدوں، تہواروں کھیلوں اور موسموں کی تفصیلات کے دلچسپ مرقعے اس کے کلام میں جابہ جا بکھرے ہوئے ہیں۔اس نقطہ نظر سے یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ محمد قلی کی شاعری نہ صرف اس کی منظوم سوانح حیات ہے بلکہ اپنے عہد کی ایک مستند تاریخ بھی ہے جس میں چار سو برس پہلے کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

محمد قلی نے اسلامی عیدوں مثلاً عید میلاد النبیؐ، عید بعثت نبی، شب معراج، شب برات، عید غدیر، ہلال عید و عید رمضان، بقر عید اور دوسری عیدوں کے

علاوہ' بسنت' نوروز' مرگ (آمد برسات) اور خالص ہندوستانی تہواروں کو بھی ایک بین قومی تقریب کی حیثیت سے رائج کیا۔اس کی شاعری اس کے ماحول' مزاج اور رنگارنگ شخصیت کی آئینہ دار ہے۔

20.6.2 نوروز' بسنت اور مرگ

بین قومی تہواروں میں محمد قلی کے یہاں نوروز' بسنت اور مرگ (آمد برسات) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔جشن نوروز کے متعلق محمد قلی کے کلیات میں تین نظمیں ملتی ہیں جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس جشن کو خاص اہتمام سے مناتا تھا اور اس کے نزدیک عید نوروز کی اہمیت کسی مذہبی تقریب سے کم نہ تھی۔نوروز کی آمد پر دکن کے ماہرین علم نجوم' اس کے اثرات اور خصوصیات کے متعلق پیش قیاسی کرتے تھے۔نوروز کے آغاز کے ساتھ ہی یہ سمجھا جاتا تھا کہ دنیا ایک نئی کروٹ بدل رہی ہے اور دنیا کی ہر چیز ایک نئے اور خوشگوار تغیر سے آشنا ہوگی۔اس موضوع پر محمد قلی کی ایک نظم کا خلاصہ ڈاکٹر زور کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے:

> ''نورانی نوروز نور کے جلووں کے ساتھ اور محل اس کے شایان شان لوازم سے آراستہ ہوگیا۔تمام عالم میں نور جھلک رہا ہے اور سارا چمن چاند کی طرح جگمگ کر رہا ہے۔ہر طرف ہر قسم کی چیزوں کی ہوا بندھی ہوئی ہے۔ اور ہزاروں ہرے بن لہرا رہے ہیں۔ بادشاہ کی سہیلیاں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چمن میں صف در صف' اٹھلاتی جارہی ہیں گویا عقد ثریا جیسے ستارے اتر آئے ہیں۔جس طرح آفتاب اور برج حمل کی قربت سے نئے نئے اثرات پیدا ہوتے ہیں اسی طرح قطب شاہ اور قدرت خدا کی قربت نے قاف تا قاف قطب شاہ کا حکم جاری کردیا ہے۔'' (کلیات محمد قلی قطب شاہ۔ص201)

اس نظم کے مطالعے سے محمد قلی کی قادرالکلامی اور اس کی فن کارانہ صلاحیتوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔اس نے ایک ایک مصرعے میں بعض مخصوص حرفوں کی تکرار سے شعر کا حسن دوبالا کردیا ہے۔چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

ع نورانی نو روز نوراں سوں آیا ن کی تکرار
ع مدن من کی مجلس میں مہتر منڈایا م کی تکرار
ع ہوا ہے ہوا ہر طرف ہر جنس کا ہ کی تکرار
ع قضا قوس تھے قاف تا قاف پایا ق کی تکرار

بسنت خالص ہندوستانی تہوار ہے جو آمد موسم بہار کے موقع پر منایا جاتا ہے۔اس موضوع پر محمد قلی کی کلیات میں سات نظمیں موجود ہیں۔بسنت کا تہوار قطب شاہی دور میں نہایت شان وشوکت اور خاص اہتمام سے منایا جاتا تھا۔بسنت کا موسم آتے ہی ہر طرف ہرے بھرے درخت اور چمن ہی چمن دکھائی دیتے۔شگوفے مسکراتے اور بہار انگڑائی لے کر ساری فضا کو رنگ ونکہت میں ڈبو دیتی۔اس تہوار کو ہندو مسلمان دونوں مل کر مناتے تھے۔بسنت کے موضوع پر محمد قلی کی کہی ہوئی نظموں میں ہندوستان کی اتحاد پسند روح پوری طرح رچی بسی نظر آتی ہے۔اس کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد قلی کو ہندوستانی تہذیب وتمدن اور یہاں کی فضا' یہاں کی رسومات اور طور طریقوں سے خاص لگاؤ تھا۔

نوروز اور بسنت کی طرح جشن مرگ یا آمد برسات بھی عہد محمد قلی میں خاص اہتمام سے منایا جاتا تھا۔محمد قلی نے ہندوستان کے اس روح پرور موسم پر چودہ (14) نظمیں کہی ہیں۔جس روز مرگ لگتا یا موسم برسات کا آغاز ہوتا تو محمد قلی بڑی دھوم دھام سے مجلس آرائی کرتا۔اس کے محلوں میں راگ رنگ اور رقص وسرود کی محفلیں منعقد کی جاتیں اور ساغر وجام کے دور چلتے۔ہندوستان میں برسات کا موسم ایک نئے دور اور ایک نئی زندگی کا پیامبر ہوتا ہے۔ اس موسم کو امنگ اور ترنگ کا موسم بھی کہا جاتا ہے۔برسات کے شروع ہوتے ہی ہر طرف سبزہ زار دکھائی دیتے ہیں۔باغوں اور گلزاروں میں بہار آجاتی ہے۔درختوں پر جھولے ڈالے جاتے ہیں اور مدھ بھرے گیت فضاؤں میں گونجنے لگتے ہیں۔اس پرکشش موسم کی رنگینی اور رومان انگیزی کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو جس پر محمد قلی نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔

گر جیا مرگ خوشیاں سوں سنگارو آو سکیاں　　پڑتا ہے میگ پھوی[1] پھوی چولی بھگاؤ سکیاں
آسمان ہور زمیں سب یک رنگ ہو سہاتا[2]　　ہے آج عیش کا دن ملہار گاؤ سکیاں

۱۔ پھوار　　۲۔ زیب دیتا

20.6.3 محلات شاہی اور برس گانٹھ

محمد قلی نے محلات شاہی کا تذکرہ اپنے کلام میں بڑے فخر و طمطراق سے کیا ہے۔ ''خداداد محل''، محمد قلی کے بنوائے ہوئے دیگر محلات میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ ہشت بہشت کی طرح اس محل کی بھی آٹھ منزلیں تھیں۔ یہ بارہ پیاریوں کا مسکن تھا۔ جنھیں وہ ''جنت کے نگار'' کہتا ہے۔ اس بلند و بالا عمارت کے بارے میں محمد قلی کہتا ہے کہ اس کی بلندی آسمان کو چھو رہی ہے اور روئے زمین پر اس کی کوئی نظیر نہیں:

خدا داد محل کوں محمد سنوارے　　تو اس میں جنت کے نگاراں نگارے
بلندی محل کا ہے آسمان جیسا　　سورج چاند تارے سو اس تھے سنگارے
نہ اس جگ میں دیکھے کوئی ایسے محل کوں　　مگر دھرت[1] پر قدسیاں لیا[2] کے ٹھارے
جوں اٹھوں بہشت نمنے[3] آٹھوں چھجے اس　　خضر چشمے بہتے ہیں تس میں سدارے

۱۔ زمین　　۲۔ لاکے　　۳۔ مانند

خداداد محل کی پانچویں منزل کا نام ''حیدر محل'' تھا جس میں غالباً اس کی محبوبہ بھاگ متی رہتی تھی۔ ان محلات کے علاوہ محمد قلی نے ''بچن محل''، ''قطب مندر''، ''اعلیٰ محل''، ''محل کوہ طور'' اور ''حنان محل'' پر بھی بڑی خوب صورت نظمیں لکھی ہیں۔

محمد قلی کی نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہر سال ''برس گانٹھ'' یا سالگرہ کی تقریب بڑی دھوم دھام سے مناتا تھا۔ اس موضوع پر اس کی کلیات میں دس نظمیں ملتی ہیں۔ ان نظموں کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ ہر نظم کا آغاز دعائیہ تخاطب سے ہوتا ہے۔ جیسے:

ع　　نبی نانوں تھے پھر برس گانٹھ آیا
ع　　خدا کی نظر سے برس گانٹھ آیا
ع　　خدا کی رضا سوں برس گانٹھ آیا
ع　　نبی کی غلامی تھے آیا برس گانٹھ

اور دوسرے یہ کہ بعض نظموں میں اس نے مخصوص حروف کی تکرار سے ایک مخصوص آہنگ اور خاص کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چند شعر دیکھیے:

م　　محمد کے میم تھے مدد مانگ کر میں　　علی عین عادل علم کوں اچایا　　ع
الف　　الف آسمان آسماں گیر بند کر　　حسن ہور حسین حسنِ حاجب دلایا　　ح
ق　　قمر قاف قبے اوپر جگمگایا　　پرم پی کا پیالا پیا منج پلایا　　پ

20.6.4 محمد قلی کی محبوبائیں

کلیات محمد قلی کے دونوں مرتبین نے بارہ پیاریوں کے عنوان سے اس کی 38 نظمیں پیش کی ہیں اور دوسری پیاریوں کے نام سے دس نظموں کی نشاندہی کی ہے۔ اس طرح محمد قلی کی محبوباؤں سے متعلق جملہ نظموں کی تعداد 48 ہو جاتی ہے لیکن بقول پروفیسر مسعود حسین خاں:

''ان کے علاوہ ان کے (مرتبین کے) ردیف وار دیوان میں بہت سی غزلیں ایسی ہیں جنھیں عنوان دے کر نظم بنایا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بعض سے کسی نہ کسی پیاری کا نام بھی اخذ کیا جا سکتا ہے۔''

محمد قلی ایک کثیر المحبوب شاعر ہے۔ اس کے محلوں میں کئی ملکوں کی متعدد حسینائیں موجود تھیں جن کے حسن و شباب کی تعریف و توصیف اور سراپا نگاری کے بیان میں اس نے بیسیوں نظمیں کہی ہیں۔ محمد قلی نے اپنی ساری زندگی عیش و نشاط اور راگ رنگ میں گزاری۔ اس لیے اس کی نظموں میں تازگی و شگفتگی، رنگینی و رعنائی اور سیرابی و سرمستی ہے۔ چوں کہ وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا مطلق العنان بادشاہ تھا، اس لیے اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کے پورا نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ محمد قلی کی شاعری اس کی رنگا رنگ شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ اس کی محبوباؤں سے متعلق نظموں میں اظہار بیان کی سادگی وصفائی اور روانی و برجستگی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

نھنی سانولی پر کیا ہوں نظر — خبر سب گنوا کر ہوا بے خبر
نھنی سر تھے آپ کوں سنواری عجائب — مشاطہ پری ہو نگاری[1] عجائب
مری سانولی من کی پیاری دسے[2] — کہ رنگ روپ میں کنولی[3] ناری دسے
پیاری نہ کر تو ہجن سوں سے منم[4] — جو جاگی جوانی تو پھر ہوگی خم
عشق کی پتلی ہے گوری رنگیلی — چتر ناریاں میں دستی ہے چھبیلی
چھبیلی سوں لگیا[5] ہے من ہمارا — کہ اس بن نئیں ہمن یک تل قرارا
جگت حسن میں ہے ترا حسن محبوب — میں طالب ترا ہوں مرا توں ہے مطلوب

۱۔ آراستہ کیا ۲۔ دکھائی دے ۳۔ نوخیز ۴۔ غرور ۵۔ لگا ہے

محمد قلی نے اپنی محبوباؤں کی سراپا نگاری میں اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کی وہ نظمیں جن میں مختلف محبوباؤں کی سراپا نگاری کی گئی ہے اپنی نظیر آپ ہیں۔ سراپا نگاری کے بیان میں محمد قلی کی کہی ہوئی نظموں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ہر محبوب کی بعض انفرادی خصوصیات سامنے آتی ہیں۔ فارسی اور اُردو شاعری میں محبوب کے جو سراپے بیان کیے گئے ہیں، ان کے مطالعے سے محبوب کی کوئی منفرد اور واضح تصویر نہیں بنتی اور بیشتر صورتوں میں شاعروں نے ایک روایتی اور ان دیکھے محبوب کا سراپا بیان کیا ہے اور اس کے حسن اور خدوخال کی مبالغہ آمیز تعریف کی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معشوق کی انفرادیت ختم ہوگئی اور ہر شاعر کے محبوب کی شکل وصورت، چال ڈھال اور رفتار و گفتار میں اس قدر یکسانیت نظر آنے لگی کہ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا تقریباً ناممکن ہوگیا۔ اس کے برعکس محمد قلی کی ہر پیاری (محبوبہ) اپنی چند انفرادی خصوصیات کی مالک ہے۔ نہ وہ گل عذار ہے نہ غنچہ دہن، نہ اس کا قد سرو جیسا ہے اور نہ کمر معدوم۔ اس نے بیسیوں محبوباؤں کے سراپے بیان کیے ہیں اور ہر ایک کے خدوخال ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ ان نظموں کی مدد سے ایک مصور ہر ایک کی علاحدہ علاحدہ تصویر بنا سکتا ہے۔ مثلاً نھنی ایک کم سن اور نوخیز لڑکی ہے، جو رسم عاشقی سے ناآشنا ہے۔ اس نے مدن پھول کے رنگ کی ساڑی باندھ رکھی ہے۔ جب وہ چاندنی میں ناز و انداز سے چلتی ہے تو چاند لاج سے چھپ جاتا ہے اور ستارے اس کی آرتی اتارنے کے لیے دھرتی پر اتر آتے ہیں۔ اس کے چاند سے چہرے پر کجراری آنکھیں بہت حسین معلوم ہوتی ہیں۔ سانولی ایک چنچل، سلونی ناری ہے جس کی آواز کوئل کی طرح سریلی ہے۔ کنولی اتنی نازک حسینہ ہے کہ ہوا کے ایک ہلکے جھونکے سے اس کی کمر لچکنے اور بل کھانے لگتی ہے۔ پیاری کی آنکھیں مدبھری ہیں۔ اس کی چوٹی زہریلے ناگ کی طرح ڈراونی ہے۔ گوری، چندر مکھی، سندر اور چھبیلی ہے۔ وہ ایک مست ہاتھی کی طرح جھوم جھوم کر چلتی ہے۔ لالن کی آنکھیں من موہنی ہیں اس کی چال ہنس کی چال سے زیادہ دل کش ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. محمد قلی کی نظموں کے موضوعات کیا ہیں؟
2. محمد قلی کی اتحاد پسندی پر نوٹ لکھیے۔
3. بسنت کب منایا جاتا ہے؟
4. مرگ پر محمد قلی کے کلیات پر کتنی نظمیں ملتی ہیں؟
5. محمد قلی کی محبوباؤں کے نام بتائیے۔

20.7 لسانی خصوصیات

اُردو ادب کے دکنی دور میں، دکن کے مختلف علاقوں جیسے بیدر، گلبرگہ، گولکنڈہ اور بیجاپور میں نشوونما پانے والی زبان، شمالی ہند کی زبان سے منقطع رہ کر تشکیل و ارتقا کے مدارج طے کرتی رہی۔ اس طویل عرصے میں مختلف سماجی، جغرافیائی اور لسانی اثرات کے تحت دکنی زبان و ادب میں بعض ایسی خصوصیات نشوونما پانے لگیں جن کی وجہ سے اس زبان کا رنگ روپ موجودہ معیاری اُردو کے مقابلے میں مختلف نظر آتا ہے جن کی وضاحت کے لیے یہاں دکنی اُردو کی چند لسانی خصوصیات درج کی جاتی ہیں۔

دکنی اُردو میں جمع بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ لفظ کے آخر میں ''اں'' کا اضافہ کردیا جاتا ہے۔ جیسے نور کی جمع نوراں، ہزار کی جمع ہزاراں، عالم کی جمع عالماں۔

ع اپ رحم کے نوراں سوں مرے دل کوں جلا بخش

ع یک حبیب سوں کرتا ہوں تجے شکر ہزاراں

ایسے الفاظ جن کے آخر میں ''ے'' ہو ان کی جمع بھی ''اں'' کے اضافے سے بنائی جاتی ہے۔ جیسے۔ فرشتے کی جمع فرشتیاں، بعضے کی جمع بعضیاں

محبت کی لذت فرشتیاں کوں **نئیں** ہے

دکنی ضمیروں میں ''میں'' کی جمع ''ہمنا'' اسی طرح تو کی جگہ ''توں'' کو کی جگہ ''کوں''، تجھے کی جگہ ''تج''، مجھے کی جگہ ''مج''، یہ کی جگہ ''یو'' کے الفاظ ملتے ہیں۔

دکنی اُردو میں فعل ناقص کے لیے ''ہے'' کی جگہ ''اہے'' تھے کی جگہ ''اتھے'' کے الفاظ ملتے ہیں۔

دکنی میں مصدر کی علامت ''نا'' ہے جیسے ''دسنا''۔ ''سٹنا''۔ ''گھالنا''۔ ''بیسنا'' وغیرہ۔ ماضی مطلق کے لیے مصدر کے مادے کے بعد ''یا'' بڑھایا جاتا ہے جیسے ''بوجھیا''۔ ''بھیدیا''۔ ''دھریا'' وغیرہ۔

ع جنے نیسہ؟ بوجھیا ہے سن اے عیانی

دکنی اُردو میں علامت تخصیص (بمعنی ہی) ''چ'' ہے۔ جیسے ایساچ (ایسا ہی) ' توچ (تو ہی)

دکنی میں ہائے مخلوطی گر جاتی ہے۔ جیسے ہات (ہاتھ) تج (تجھ) مج (مجھ)۔ موجودہ اُردو میں جہاں تکرار لفظ درکار ہو اسی لفظ کو دو مرتبہ بولا جاتا ہے جیسے جنگل جنگل صحرا صحرا۔ لیکن دکنی میں تکرار کے لیے دو الفاظ کے درمیان ''ے'' استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے بال بال کے لیے بالے بال، گھر گھر کے لیے گھرے گھر، رگ رگ کے لیے رگے رگ۔

دکنی شاعری میں ضرورت شعری کے اعتبار سے مختصر مصوتوں کو طویل کردیا جاتا ہے اور اسی طرح بعض اوقات طویل مصوتوں کو مختصر کردیا جاتا ہے جیسے نازک کے بجائے نازوک، سمدر کے بجائے سمدور، سورج کے بجائے سورتج، اسی طرح پریم کے بجائے پرم، پریت کے بجائے پرت۔ بوند کے بجائے بندو وغیرہ۔

20.8 محمد قلی کی نظمیں

مناجات

بندہ ہوں گنہ گار خدا ! میرا گنہ بخش — تج[1] لطف کیرا[2] فیض خدا منج[3] کوں[4] سدا بخش

تج لطف تھے[5] موجود ہوا جیو[6] سیتی[7] میں — اَپ[8] رحم کے نوراں سوں[9] مرے دل کوں جلا بخش

دھریا[10] ہے دو جگ پرتوں[11] میا[12] عام و لیکن — اَپ مہر کے آدہار[13] سوں منج فیض خدا بخش

منج جیو کے پھل [14] بن کوں کراپ شوق سوں تازہ — منج نین کے درپن کوں آپس [15] مکھ تھے صفا بخش
یک حبیب [16] سوں کرتا ہوں تجے [17] شکر ہزاراں — بھی [18] شکر کرن [19] منج کوں توں [20] توفیق نوا بخش
منج بخت کے تارے کوں سدا رکھ توں جھلکتا [21] — منج عیش کے سورج کوں سو دن [22] دن توں ضیا بخش
صدقے نبی کے قطب کوں اپ لطف میا تھے — دکھ درد سبھی دور کر ، ہور سکھ ، شفا بخش

۱۔تیرے ۲۔کا ۳۔مجھ ۴۔کو ۵۔سے ۶۔روح ۷۔سے
۸۔اپنے ۹۔سے ۱۰۔دھرا(چھایا ہے) ۱۱۔تیر ۱۲۔محبت(کرم) ۱۳۔سہارے
۱۴۔پھول بن ۱۵۔اپنے ۱۶۔زبان ۱۷۔تیرا ۱۸۔اور،مزید ۱۹۔کرنے کی ۲۰۔تو
۲۱۔روشن،چمکتا ۲۲۔دن بہ دن

پریم کی کہانی

سنو لوگ میری پرم کی کہانی — کہ پیلا ہے رنگ عاشقی کی نشانی
تمن [1] عشق بھیدیا [2] ہے منج بالے [3] بالا — کہ ہوی ہوں تمن پیم میں ہوں [4] دیوانی
محبت کی لذت فرشتیاں کو نیں ہے — بہت سعی سوں میں سو لذت پچھانی
پرت میں جنے [5] اپنا دل کیتا [6] دریا — عشق پنتھ مَیں اس کوں سا [7] جاکہ [8] مانی [9]
جکوئی عمر کھویا ہے ساجن ہوس میں — جیون پھل وہی پایا [10] کر میں جانی
اوسی کا ہے دو جگ میں جیونا [11] انند سوں — جنے [12] نیہہ [13] بوجھیا [14] ہے سن اے ایانی [15]

نبی صدقے قطبا جگت مول پایا
سو او عشق ہے اُس تھے ئیں خوش کہانی

۱۔تمہارے ۲۔اثر کرگیا ہے ۳۔بال بال ۴۔میں ۵۔جس کے ۶۔کرتا ہے
۷۔زیب دیتا ہے ۸۔کہہ کر ۹۔مانتا ہوں ۱۰۔پایا ۱۱۔جینا،زندگی ۲۱۔جس نے
۱۳۔محبت ۱۴۔بھید پایا ہے ۱۵۔جاہلِ غافل

عشق وعقل

پرم آپنا [1] چتر جگ پر سو چھایا — جہاں اپنا [2] پنی چھایا اپس [3] واں دکھایا
پرم پھول بن میں سگند باس مہکا — پرم آپنے ہات ارگج [4] کلایا [5]
سبھی عالماں اپ [6] پڑن [7] جانتے ہیں — نہیں کوئی پایا اے [8] پیرت کا مایا [9]
پرم کے سو پیمانے سوں مد پلاکر — پیا طاقِ ابرو سوں سجدا کرایا
عقل کے تخت پر پرم تخت بیٹھا — عشق عقل کے ہات ایسے نوایا [10]
نہ عاشق کوں کہتا ہے بن عشق یک تل [11] — وو عاقل سدا جن پرت سوں گمایا [12]

پیارے سوں گمتا [13] نبی صدقے قطبا
پرم اُس کوں ساجے [14] جنے [15] یوں [16] گمایا

۱۔اپنا ۲۔آپ خود اپنی ذات ۳۔خود ۴۔ارگجا ۵۔ملایا ۶۔خود آپ
۷۔پڑھنا ۸۔یہ ۹۔بھید راز ۱۰۔جھکایا ۱۱۔لمحہ ۱۲۔رائیگاں کیا ضائع کیا
۱۳۔تماشہ ۱۴۔زیب دے ۱۵۔جس نے ۱۶۔جوانی

20.9 اشعار کی تشریح

پریم کی کہانی

سنو لوگ میری پرم کی کہانی — کہ پیلا ہے رنگ عاشقی کی نشانی
تمن عشق بھیدیا ہے منج بالے بالا — کہ ہوی ہوں تمن پیم میں ہوں دیوانی
محبت کی لذت فرشتیاں کونہیں ہے — بہت سعی سوں میں سو لذت پچھانی

مشکل الفاظ کے معنی

پرم = پریم، محبت — تُمن = تمہارا، تمہاری، تمہارے — بھیدیا = سرائیت کرگیا — بالے بالا = بال بال
پیم = محبت، پریم — ہوں = میں (واحد متکلم) — فرشتیاں = فرشتہ کی جمع (فرشتے، فرشتوں)
نئیں = نہیں — سوں = سے — پچھانی = پہچانی

شعرنمبر 1 اے لوگو میرے پریم کی کہانی یا داستان محبت سنو۔عشق کرنے والے کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں اور اس کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔چہرے کا پیلا پن ہی دراصل عشق کی نشانی ہے۔

شعرنمبر 2 اس شعر کے الفاظ ''ہوی ہوں'' (بمعنی ہوگئی ہوں) ''ہوں'' (بمعنی میں) اور ''دیوانی'' اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس نظم میں اظہار عشق عورت کی طرف سے ہے۔مرد مطلوب ہے اور طالب عورت۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے محبوب (سجن) تمہارا عشق میرے بال بال میں سرایت کرگیا ہے اور میں تمہارے عشق (پیم) میں دیوانی ہوگئی ہوں۔

شعرنمبر 3 محبت کی لذت اور لطف سے فرشتے ناواقف ہیں۔دراصل فرشتوں نے ذائقہ عشق چکھا ہی نہیں۔میں نے بہت ہی سعی وکاوش کے بعد محبت کے حظ اور اس کی لذت کو پہچانا ہے۔دوسرے الفاظ میں محبت کا لطف اور مزہ وہی لوگ جانتے ہیں جنہوں نے خود عشق کیا ہے۔
اسی مفہوم کو کسی شاعر نے یوں پیش کیا ہے:

محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر
کنارے سے کبھی اندازۂ طوفان نہیں ہوتا

20.10 خلاصہ

اس اکائی کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ اس میں اُردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے واقعات حیات، اس کے رفاہی، تعمیری، سماجی اور تہذیبی کارناموں اور اس کی ادبی خدمات کو اجاگر کرتے ہوئے اس کی شاعری اور خصوصاً نظم نگاری کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

محمد قلی بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے۔اس نے اپنے کلیات میں غزل کی ہئیت کو وسیع پیمانے پر استعمال کیا ہے۔عشقیہ موضوعات کی پیش کشی کے ساتھ ساتھ بیانیہ اور توضیحی شاعری کے لیے بھی اس نے غزل کی ہئیت کا سہارا لیا ہے۔اُردو میں نظم نگاری کے اولین نمونے یا موضوعاتی شاعری کے اولین نقوش بھی محمد قلی کی شاعری ہی میں ملتے ہیں۔اس کی نظمیں سادگی بیان، سلاست، روانی اور برجستگی کی عکاس وترجمان ہیں۔

محمد قلی کی شاعری ہندوستانی ماحول اور یہاں کی تہذیب ومعاشرت کی ترجمانی کرتی ہے۔اس نے مختلف عیدوں، تہواروں، رسوم ورواج، محلات

شاہی اور اپنی سالگرہ پر بھی نظمیں کہی ہیں اور مختلف موسموں نوروز' بسنت آمد برسات (مرگ) اور اپنی مختلف النوع اور کثیر التعداد محبوباؤں (پیاریوں) پر بھی بیسیوں نظمیں کہہ کر اپنی قادر الکلامی اور بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ نہ صرف اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر اور اُردو میں نظم نگاری یا بیانیہ شاعری کا بنیاد گزار ہے بلکہ سراپا نگاری اور منظریہ نظموں کے ابتدائی نمونے بھی اسی کے کلام میں ملتے ہیں۔

20.11 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. بہ حیثیت شاعر محمد قلی قطب شاہ کے امتیازات واعزازات پر روشنی ڈالیے۔
2. محمد قلی کی نظم نگاری کے موضوعات وخصوصیات کا جائزہ لیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. محمد قلی کے سیاسی' سماجی اور فلاحی کارناموں پر روشنی ڈالیے۔
2. محمد قلی قطب شاہ کے واقعات حیات کا سرسری جائزہ لیجیے۔

20.12 فرہنگ

الفاظ	= معنی	الفاظ	= معنی	الفاظ	= معنی
ہمہ جہت	= پہلودار	مفصل	= تفصیل سے	نیست ونابود ہونا	= فنا ہونا' معدوم ہونا
فراموش کرنا	= بھلادینا	واقعاتِ حیات	= حالات زندگی	فرماں روا	= حکمران' بادشاہ
بانی	= بنیاد ڈالنے والا	دارفانی	= فنا ہونے والا بمعنی دنیا	کوچ کرنا	= رخصت ہونا' رحلت کرنا
خلفشار	= شورش' لڑائی	تختہ الٹنا	= تخت سے اتارنا' بادشاہی سے ہٹا دینا		
بے ہنگم	= غیر موزوں	اولوالعزمی	= عالی حوصلہ' بہادر	مدبر	= تدبیر کرنے والا
دانشور	= عقل مند	پیشوا	= رہنما' امام	فارغ البالی	= خوشحالی' آسودگی
تزئین کاری	= سجاوٹ	بہبود	= فائدہ	رفاہ عام	= عوام کی بھلائی سے متعلق
دادودہش	= سخاوت' فیاضی	ناظر الملک	= ملک کا محافظ' نگہبان	موخر	= آخری
تقلید	= پیروی	متحمل	= برداشت' گنجائش	غیر مردف	= جس میں ردیف نہ ہو
اصطلاح	= کسی لفظ کا عام معنوں سے ہٹ کر خاص معنوں میں استعمال ہونا			رطب اللسان	= تعریف کرنا
بطن	= شکم' پیٹ	کثیر المحبوب	= جس کے کئی محبوب ہوں	سرایت کرنا	= رچ بس جانا
سعی	= کوشش	رفاہی	= بھلائی کے' بہتری کے	توضیحی	= وضاحتی

20.13 سفارش کردہ کتابیں

1. ڈاکٹر سیدہ جعفر' کلیات محمد قلی قطب شاہ
2. ڈاکٹر محی الدین قادری زور' کلیات محمد قلی قطب شاہ
3. ڈاکٹر مسعود حسین خان' محمد قلی قطب شاہ
4. اکبر الدین صدیقی' انتخاب محمد قلی قطب شاہ
5. ڈاکٹر گیان چند جین و ڈاکٹر سیدہ جعفر تاریخ ادب اُردو 1700ء تک (جلد سوم)
6. ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادب اُردو (جلد اول)

اکائی: 21 نظیر اکبر آبادی۔ حیات، شخصیت، کارنامے اور نظم نگاری

ساخت

21.1 تمہید

21.2 نظیر اکبر آبادی کی پیدائش

21.3 نظیر کے حالات

21.3.1 نظیر کے ذوق وشوق اور مشغلے

21.3.2 نظیر کی ابتدائی شاعری

21.4 نظیر کی نظم نگاری

21.4.1 نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے موضوعات

21.4.2 نظیر کی زبان

21.5 نظیر کی غزل گوئی

21.6 نظیر اور دیگر اصناف سخن

21.6.1 نظیر کی انسان دوستی

21.6.2 نظیر کے اشتراکی خیالات

21.6.3 نظیر کی شاعری میں مناظرِ قدرت کی عکاسی

21.6.4 نظیر کے کلام کی لسانی خصوصیات

21.7 نظم ہولی

21.7.1 نظم ''ہولی'' کا تجزیہ

21.8 نظم تندرستی

21.8.1 نظم ''تندرستی'' کا تجزیہ

21.9 نظم مفلسی

21.9.1 نظم ''مفلسی'' کا تجزیہ

21.10 خلاصہ

21.11 نمونہ امتحانی سوالات

21.12 فرہنگ

21.13 سفارش کردہ کتابیں

21.1 تمہید

اردو کے نظم نگار شعرا کی فہرست میں نظیر اکبر آبادی کو اولیت کا درجہ حاصل ہے ان کی پیدائش اکبر آباد میں ہوئی۔ انہوں نے اس دور کی روایتی غزل گوئی کے مقابل نظم نگاری کا آغاز کیا۔ نظیر نے عوامی شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ ان کی شاعری میں سماج اور معاشرے کی نمائندگی ملتی ہے۔ وہ اردو میں ملی جلی تہذیب کے علمبردار ہیں۔ چنانچہ ان کی نظموں میں عید و تہوار، دنیا کی بے ثباتی، میلے ٹھیلے اور ہندوستان کی چلتی پھرتی زندگی نمایاں نظر آتی ہے۔ نظیر اپنے دور کے وسیع المشرب شاعر تھے۔ انہوں نے سادہ زبان اور عوامی الفاظ کو شاعری میں استعمال کیا۔ چونکہ یہ اس زمانے کے مزاج سے ہٹ کر بات تھی

جس کی وجہ سے ایک عرصہ تک نظیر اکبر آبادی کی شاعری کو کوئی وقعت حاصل نہیں ہو سکی۔ لیکن آزادی کے بعد ان کی عوامی شاعری کو شہرت حاصل ہوئی۔ نظیر اکبر آبادی کو میلوں، بازاروں، تفریحات اور کھیل کود سے بڑی دلچسپی تھی۔ 1830ء میں ان کا انتقال ہوا اور گھر کے احاطے میں تدفین عمل میں آئی۔ اردو شاعری میں نظیر اکبر آبادی ایک سماجی اور عوامی نظم نگار کی حیثیت سے منفرد مقام رکھتے ہیں۔

21.2 نظیر اکبر آبادی کی پیدائش

نظیر اکبر آبادی کا پورا نام ولی محمد تھا۔ وہ شرفائے اکبر آباد سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد سید محمد فاروق، عظیم آباد کے نواب کے مصاحبین میں شمار کیے جاتے تھے جن کی شادی آگرے کے مقطعہ دار سلطان خان کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ سید محمد فاروق کی اکثر اولادیں پیدا ہونے کے بعد فوت ہو جاتی تھیں۔ کئی دعاؤں اور منتوں کے بعد 1736ء میں ان کے گھر ایک لڑکا تولد ہوا جس کا نام ولی محمد رکھا گیا۔ آگے چل کر اسی ولی محمد نے اپنا تخلص نظیر کیا۔ ان کی پرورش بڑے لاڈ و پیار میں ہوئی ماں باپ نے انہیں ہر قسم کے شوق پورے کرنے کی سہولتیں فراہم کیں۔ ابتدائی زمانے سے ہی نظیر کو میلے ٹھیلے اور کھیل کود سے دلچسپی رہی۔ ان کے زمانے میں آگرہ علم و فضل کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ جس کا اثر نظیر کی طبیعت پر بھی ہوا۔ بچپن سے ہی وہ شعر و شاعری کے دلدادہ تھے۔ نظیر کی ماں دہلی کی ایک ہنرمند اور سلیقہ مند خاتون تھیں، اس لیے دہلی کے اثرات بھی میاں نظیر پر مرتب ہوئے۔ نظیر کے اکثر سوانح نگاروں نے ان کی پیدائش کی تاریخ کے بارے میں اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ بعض سوانح نگاروں نے ان کی پیدائش 1735ء لکھی ہے اور بعض سوانح نگار 1740ء بتاتے ہیں۔ بعض کے نزدیک ان کا مقام ولادت دہلی ہے اور بعض ان کی ولادت اکبر آباد بتاتے ہیں۔ غرض یہ حقیقت ہے کہ انتقال کے وقت ان کی عمر 98 برس رہی ہوگی۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. نظیر اکبر آبادی کا پورا نام کیا تھا؟
2. نظیر کی تاریخ پیدائش لکھیے۔
3. نظیر کا انتقال کب ہوا؟

21.3 نظیر کے حالات

اکبر آباد کے ایک شریف گھرانے میں نظیر اکبر آبادی کی پیدائش ہوئی تھی۔ باضابطہ کوئی تعلیم حاصل نہیں کی۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ کوئی ملازمت نہیں کی، باپ دادا کی دولت موجود تھی البتہ محلوں کے بچوں کو پڑھا کر زندگی گزارتے تھے۔ کچھ روز کے لیے متھرا گئے تو وہاں کے مرہٹہ قلعہ دار نے انہیں اپنا استاد مقرر کیا۔ دوبارہ آگرہ آئے تو محمد علی خاں کے لڑکوں کو درس دینے لگے۔ اسی دوران رائے کھتری سے ملاقات ہوئی۔ رائے کھتری نے اپنے بچوں کی تربیت میاں نظیر کے سپرد کر دی۔ آخری عمر میں نظیر کا تعلق کاشی کے سربراہ راجہ بلوان سنگھ کی سرکار سے ہو گیا تھا۔ اپنے خاندان اور ماحول کی وجہ سے نظیر نے سپہ گیری کے فن میں کمال حاصل کیا تھا۔ فارسی اور عربی جانتے تھے۔ ہندی، پنجابی اور سنسکرت پر عبور حاصل تھا۔ عوام میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ زبان کے عوامی لہجے سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ ایک قلندر مزاج آزاد منش انسان تھے۔ اس کا اندازہ ان کی شاعری سے بھی ہوتا ہے۔ نظیر کے والد سنی تھے لیکن وہ امامیہ مذہب کے قائل تھے۔ عبادتوں کی ادائیگی معمولی طور پر کرتے تھے۔ البتہ تعزیہ داری کے اہتمام پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ ادھیڑ عمر میں ظہور النساء بیگم بنت عبدالرحمٰن چغتائی سے شادی کی۔ آخری عمر میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ نظیر کو اولادیں بھی ہوئیں۔ 1827ء میں فالج کے مرض میں مبتلا ہوئے اور 98 سال کی عمر میں 25 صفر 1246ھ مطابق 16 اگست 1830ء کو انتقال کیا۔ نماز جنازہ دو مرتبہ سنی اور امامیہ طریقے سے پڑھائی گئی۔ البتہ تجہیز و تکفین امامیہ طریقہ پر ہوئی ان ہی کے مکان میں موجود نیم کے درخت کے نیچے دفن کیے گئے۔ نظیر کے مزاج کی شوخی، بانکپن، کھیل کود اور میلے ٹھیلوں کے شوق اور تجربات کے اظہار کے لیے تعلیم ہی ان کو راس آئی۔ ان کا مشاہدہ دنیاوی معاملات کے ساتھ ساتھ زندگی کے پیچ و خم کے متعلق بھی بہت گہرا تھا۔ نظم کی آزادی ان کی آزاد روش سے بڑی مناسبت رکھتی تھی اس لیے وہ نظم نگاری کی طرف مائل ہوئے اور ہر چھوٹے بڑے موضوع پر نظمیں لکھیں۔

21.3.1 نظیر کے ذوق وشوق اور مشغلے

آگرے کے ماحول میں پرورش پاتے ہوئے نظیر کو اس زمانے کے عام مشاغل سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ کم عمر ہی سے ان کی طبیعت میں منچلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے محبوب مشغلوں میں داؤ پیچ، کشتی، تلوار چلانا، بانک پٹہ اور بلم وغیرہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ کبوتر بازی، مرغ بازی اور پنجہ لڑانے کے فن میں بھی ماہر تھے۔ اُس زمانے میں آگرہ عیش وعشرت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس لیے نظیر کو اپنے شوق پورے کرنے کے بھرپور مواقع ملے۔ وہ پچیسی، شطرنج اور چوسر کھیلنے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ چونکہ منتوں اور مرادوں سے پیدا ہوئے تھے، اس لیے ان کے کسی بھی شوق پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں ایسے ذوق وشوق اور مشغلوں پر کئی نظمیں موجود ہیں، جو ان کے دور کی عکاسی کرتی ہیں۔

21.3.2 نظیر کی ابتدائی شاعری

نظیر اکبرآبادی کے سوانح کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی عمر سے ہی انہیں شاعری کا چسکہ لگ گیا تھا۔ شعر کہتے تھے مگر اس کی حفاظت نہیں کی مختلف تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ 1182ھ م 1770ء میں جب میر تقی میرؔ دہلی سے آگرہ لوٹے تو میاں نظیر نے ان سے ملاقات کی اور ایک غزل سنائی۔ اس وقت ان کی عمر 34 سال تھی۔ 34 سال کی عمر پختہ عمر ہوتی ہے۔ یقیناً یہ ان کی پہلی غزل نہیں تھی جو انہوں نے میر تقی میرؔ کو سنائی ہوگی۔ اس کے بعد بھی انہوں نے کئی غزلیں لکھیں لیکن ان کا زیادہ تر رجحان نظم نگاری کی طرف رہی رہا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. نظیر کے مشغلوں کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
2. نظیر کی تعلیم کس انداز سے ہوئی؟
3. نظیر کے روزگار کے ذرائع کیا تھے؟

21.4 نظیر کی نظم نگاری

جس دور میں نظیر اکبرآبادی حیات تھے وہ شاعری کا ایک ایسا دور تھا جس میں علم عروض، قافیہ اور ردیف کی پابندی لازمی تھی۔ سارے معاشرے میں شاعری کے لیے مدون کیے ہوئے اصولوں کی پابندی کی جاتی تھی۔ نظیر اکبرآبادی بھی اسی پابند ماحول کے پروردہ تھے۔ اسی لیے ان کی شاعری فنی اصولوں کی پابند رہی۔ ان کی نظموں میں مثلث، مربع، مخمس اور مسدس کے سانچے استعمال ہوئے ہیں، جن میں وزن، بحر، قافیہ اور ردیف کی پابندی بھی دکھائی دیتی ہے

21.4.1 نظیر اکبرآبادی کی شاعری کے موضوعات

نظیر اکبرآبادی ایک شاعر ہی نہیں بلکہ اپنے دور کے معاشرہ اور سماج کے بہترین شاہد اور عکاس بھی تھے۔ ان کی تمام تر نظموں میں مشاہداتی فضا موجود ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں زندگی کے تمام موضوعات دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں میلوں ٹھیلوں اور کھیل تماشوں کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ہندوستانی ماحول موجود ہے اور ہندو مسلم تہواروں اور عیدوں پر ان کی کئی نظمیں موجود ہیں۔ عیدگاہ اکبرآباد، شب برات، عید الفطر اور ہولی، دیوالی پر نظمیں لکھنے کے علاوہ نظیر اکبرآبادی نے دنیا کی بے ثباتی پر آدمی نامہ، بنجارہ نامہ، بنس نامہ جیسی مشہور نظمیں لکھیں۔ نظیر کی شاعری میں برسات، طفلی، جوانی اور بڑھاپا سب پر نظمیں موجود ہیں وہ ریچھ اور گلہری پر ہی نظمیں نہیں لکھتے بلکہ ان کی شاعری میں مظاہر حیات بھی مسرت آفرین ہیں۔ لالہ وگل، نسرین وسمن، نیلوفر وسوسن، چنبیلی، مدھ مالتی، مولسری، کنول، موگرہ، کیتکی، موتیا اور سرسوں پر بھی انھوں نے نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی نظمیں موضوعات کی بھرپور نمائندہ ہیں۔ اس دور کے رسم ورواج کے مطابق ریچھ کا بچہ، ہنس کا بچہ جیسی نظمیں یہ ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ نظیر نے اپنے دور کے ہر منظر کو نظم کا موضوع بناتے ہوئے خالص ہندوستانی معاشرہ کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

21.4.2 نظیر کی زبان

جس دور میں نظیر اکبرآبادی نے نظم نگاری کی روایت کا آغاز کیا اس وقت سارے ہندوستان میں اردو شاعری معرب اور مفرس تراکیب سے رچی

بسی تھی اور ایسے شاعر کو ہی کامیاب سمجھا جاتا تھا جو ثقیل الفاظ اور پیچیدہ طریقہ کو اپنی شاعری میں اختیار کرتا تھا۔ نظیر اکبر آبادی نے سادہ اور بول چال کی زبان استعمال کی، جس کی وجہ سے ان کی نظمیں عوام کے ذہنوں پر اثر کرنے لگیں۔ نظیر کی شاعری میں عربی اور فارسی تراکیب کا استعمال بہت کم ہے۔ وہ موقع بہ موقع ہندی بھاشا کے الفاظ بھی اپنی نظموں میں استعمال کر لیتے تھے۔ ان خصوصیات کی وجہ سے نظیر کی شاعری عوامی شاعری کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ نظیر کی عوامی نظموں میں برج، اودھی، سنسکرت اور ہندی کے الفاظ کا کامیابی کے ساتھ استعمال دکھائی دیتا ہے۔ نظیر کا کمال یہی ہے کہ وہ ہر زبان کے الفاظ کو شاعری میں شامل کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے نظیر کی شاعری میں عوام مقبول رہی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. نظیر کی نظموں کے انداز کا احاطہ کیجیے۔
2. نظیر کی شاعری کے کون کون سے موضوعات ہیں؟
3. نظیر نے عوامی شاعری کے لیے کون سی زبانوں کے الفاظ اپنی نظموں میں استعمال کیے؟

21.5 نظیر کی غزل گوئی

اپنے زمانے کے رواج کے مطابق نظیر نے غزل گوئی کی طرف بھی توجہ دی۔ ان کی غزلوں میں روایتی انداز کے علاوہ غمِ عشق اور کیفِ عشق کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ غزلوں میں ان کا انداز مکمل طور پر دنیا کی بے ثباتی سے وابستہ ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

دکھ پا کے مر گیا کوئی سکھ پا کے مر گیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مر گیا

نظیر غزل کے تقاضوں سے پوری طرح واقف تھے اور ان کی غزلوں میں روایتی عشق کے نمونے موجود ہیں۔ ان کی اپنی غزلوں میں نرمی اور گھلاوٹ شامل ہے اور انداز بیان میں رکھ رکھاؤ موجود ہے۔ نظیر نے غزلوں میں فارسی تراکیب اور لفظی شان و شوکت کا اہتمام کیا ہے۔ ان کی چند غزلوں کے اشعار ملاحظہ ہوں:

جاں بھی بجاں ہے ہجر میں، اور دل فگار بھی
تر ہے مژہ بھی اشک سے جیب کا تار تار بھی
دیکھیے کیا ہو بے طرح دل کی لگے ہیں گھات میں
عشوۂ پُر فریب بھی، غمزۂ سحر کار بھی

نظیر اکبر آبادی نے اپنی غزلوں میں بے دریغ فارسی الفاظ و تراکیب استعمال کرنے سے کوئی گریز نہیں کیا۔ ان کی غزلِ مسلسل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے صفِ مژگاں تکلف بر طرف — دیکھتی کیا ہے الٹ دے صف کی صف
دیکھ وہ گورا سا مکھڑا رشک سے — پڑ گئے ہیں ماہ کے منہ پر کلف
آ گیا جب بزم میں وہ شعلہ رُو — شمع تو بس ہوگئی جل کر تلف

نظیر اکبر آبادی نے غزلوں میں مختلف مناظر بھی باندھے ہیں۔ غزل کی شاعری میں اس قسم کے مناظر صرف نظیر کی غزلوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ہولی کا سماں اور ذخیرۂ الفاظ ملاحظہ ہو:

ہولی کی رنگ فشانی سے یہ رنگ ہے کچھ پیرہن کا — جوں رنگ برنگ بہاروں میں ہو صحن چمن اور گلشن کا

جس خوبی اور رنگینی سے گلزار کھلے ہیں عالم میں — ہر آن چھڑکواں جوڑوں سے ہے حسن کچھ ایسا ہی تن کا
یہ جام لبالب بھر دینا پھر ساقی کو کچھ دھیان نہیں — یہ ساغر پہنچے دوست تلک یا ہاتھ لپک لے دشمن کا
جب ہم نے نظیر اس گل رو سے یہ بات کہی ہنس کر اس دم — کیا پوچھے ہے اے رنگ بھری ہے مست مہینہ پھاگن کا

غزل کی ہئیت میں نظیر اکبر آبادی نے ہولی کا سماں باندھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ وہ غزل میں جزئیات نگاری میں بڑی قدرت رکھتے تھے۔ان کی غزلوں میں ذخیرہ الفاظ کے علاوہ ذکرِ محبوب کی عمدہ مثالیں دکھائی دیتی ہیں۔محبوب کے حسن سے متعلق نظیر کی ایک غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

اس گورے بدن کا کوئی کیا وصف کرے آہ — ختم اس کے اوپر گل رخ و سیم تنی ہے
منھ چاند کا ٹکڑا ہے بدن چاندی کی تختی — دندان ہیں گُہر ہونٹ عقیقِ یمنی ہے
بلّور کی پتلی کہوں یا موتی کا دانہ — یا چین میں اک چینی کی مورت یہ بنی ہے
نرمی میں، صفائی میں، نزاکت میں تن اس کا — ریشم ہے نہ گل برگ نہ برگِ سمنی ہے
گر پھول کی پتی کی بنا پہنے وہ پوشاک — چھل جائے بدن اس کا یہ نازک بدنی ہے

غزل میں نظیر اکبر آبادی زورِ بیان اور ذخیرہ الفاظ پر خصوصی توجہ دیتے ہیں ان کی غزلوں میں الفاظ کا زیر و بم، نشست و ترتیب اک ترنم سا پیدا کر دیتی ہے۔ان کی ایک غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

دکھا کر اک جھمک دل کو نہایت کر گیا بیکل — پری رو، تُندخود، سرکش، ہٹیلا، چُلبلا چنچل
وہ عارض اور جبین تاباں کہ ہوں دیکھ اس کو شرمندہ — قمر، خورشید، زُہرہ، شمع، شعلہ، مشتری، مشعل
نزاکت اور لطافت وہ، کفِ پا تک کہ حیراں ہوں — سمن، گلِ لالہ، نسریں، نسترن، دُر، پرنیاں، مخمل
نظیر اک عمرِ عشرت ہو، ملے ایسا پری پیکر — اگر اک آن، اگر اک دم، اگر اک چھن، اگر اک پل

غزل کا ہر شعر ایک اکائی ہوتا ہے۔ ہر شعر کا مضمون الگ ہوتا ہے لیکن نظیر کی غزلوں میں چیدہ کاری کے بجائے ایک تسلسل ہے جس کی وجہ ان کی غزلوں پر بھی نظموں کا گمان ہوتا ہے۔ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نظیر نے غزل کی ہئیت میں موضوعاتی غزلیں لکھنے پر توجہ دی۔غرض نظیر کی غزل گوئی اس دور کے دوسرے غزل گو شعرا سے بالکل مختلف نظر آتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. نظیر نے کس قسم کی غزلیں لکھیں؟
2. نظیر کی غزلوں میں موضوعات کا احاطہ کیجیے۔
3. نظیر کی غزلوں کے چند اشعار لکھیے۔

21.6 نظیر اور دیگر اصنافِ سخن

نظیر نے نظمیں بھی لکھیں اور غزلیں بھی۔غزل گو شاعر کی حیثیت سے نظیر کی آواز اپنے دور کے شاعروں سے بالکل مختلف ہے۔غزل گوئی میں انہوں نے کوئی نام نہیں کمایا۔نظم گو کی حیثیت سے نظیر اکبر آبادی ساری اردو شاعری میں اہمیت رکھتے ہیں۔نظیر کے عہد میں نظم گوئی کا تصور نہیں تھا لیکن انہوں نے بے شمار موضوعات پر نظمیں لکھیں۔نظیر کی شاعری میں نظم کی مختلف اصناف دکھائی دیتی ہیں۔انہوں نے شہر آشوب، واسوخت، نظم مسلسل، غزلِ مسلسل، پابند نظم، ترکیب بند، ترجیع بند اور قطعات لکھ کر شاعری کی مختلف اصناف کی نمائندگی کی۔موضوعاتی اعتبار سے نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں سماجی، اخلاقی، معاشرتی اور ہندوستانی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ رسم و رواج، چرند، پرند، عید و تہوار، دنیا کی بے ثباتی، کھیل کود، میلے ٹھیلے اور مناظرِ قدرت پر ان کی بے شمار نظمیں موجود ہیں۔نظم ہولی کا یہ..... رنگ دیکھیے۔

کچھ طبلے کھنکے، تھال بجی، کچھ ڈھولک اور مردنگ بجی　　کچھ چھیڑیں بین ربابوں کی، کچھ سارنگی رچھ چنگ بجی
کچھ تار طنبوروں کے جھنکے کچھ دھم دھمی اور مرچنگ بجی　　کچھ گنگھرو جھم جھم جھم جھم جھم کچھ گت گت پر آہنگ بجی

اپنی مشہور حمد میں نظیر اکبر آبادی کس طرح حمد باری تعالیٰ سے بیان کرتے ہیں دیکھیے:

کل عالم تیری یاد کرے تو مالک سب کا سچا ہے

اس ارض و سما کے عرصے میں یہ جتنا کھچم کچھا ہے　　یہ ٹھاٹھ تجھی نے باندھا ہے یہ رنگ تجھی نے رچا ہے
حیوان پکھیرو نر ناری کیا بوڑھا بالک بچا ہے　　کیا دانا، بینا، ہوش بھرا، کیا بھولا، ناداں، کچا ہے

کل عالم تیری یاد کرے تو مالک سب کا سچا ہے

نظیر کا مشاہدہ بڑا گہرا اور وسیع ہے۔ وہ زندگی کے ہر رنگ کو اس طرح اپنی نظموں میں سمو دیتے ہیں کہ تصویر سامنے آجاتی ہے۔ برسات پر ان کی نظم کا ایک بند سنیے:

کیچڑ سے ہر مکاں کی تو بچتا بہت پھرا　　پر جب دکھائی دی کھلے بالوں کی ایک گھٹا
بجلی میں چمکی حسن کی منھ برسا ناز کا　　پھسلن جب ایسی آئی تو کچھ بس نہ پھر چلا

آخر کو واں نظیر بھی آکر پھسل پڑا

نظیر کے دور میں نظم کی روایات نہ ہونے کے برابر تھیں طویل مثنویاں بہت لکھی گئیں۔ مرثیے کے علاوہ قصیدوں کی بڑی دھوم تھی۔ نظیر کا ایک شہر آشوب بہت مشہور ہے جس سے اس زمانے کی سماجی تاریخ سامنے آتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

اب آگرے میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ　　آتا نظر کسی کا نہیں ایک دم نباہ
مانگو عزیز ایسے بُرے وقت سے پناہ　　وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج اب ہیں آہ

کسب و ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند

جتنے ہے آج آگرے میں کارخانہ جات　　سب پر پڑی ہے آن کہ روزی کی مشکلات.
کس کس کے دکھ کو روئیے اور کس کی کہیے بات　　روزی کے اب درخت کے ہلتا نہیں ہے پات

ایسی ہوا، کچھ آکے ہوئی ایک بار بند

نظیر کی نظموں میں غریبی اور مفلسی کے علاوہ بعض عبرت آموز واقعات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان کی ایک نظم ''در بیان تماشائے دنیائے دوں'' کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

بنا کے نیاریا زر کی دکان بیٹھا ہے　　جو ہنڈی والا ہے وہ خاک چھان بیٹھا ہے
جو چور تھا سو وہ پاسبان بیٹھا ہے　　زمین پھرتی ہے اور پاسبان بیٹھا ہے

غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشہ ہے

ان کی مشہورِ زمانہ نظم ''تلاش زر'' میں ان کی شدید حس اور عمیق مشاہدے کے علاوہ تجربے کی وسعتیں بھی محسوس کی جاسکتی ہیں۔ اس نظم میں وہ زر اور دولت کی اہمیت اور اس کی خاطر ہونے والی تباہیوں کا حال بیان کرتے ہیں:

ہوتی ہے زر کے واسطے ہر جا چڑھائیاں　　کٹتے ہیں ہاتھ پاؤں گلے اور کلائیاں
بندوقیں اور ہیں کہیں توپیں لگائیاں　　کل زر کی ہو رہی ہیں جہاں میں لڑائیاں

جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر
ہراک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر

ان کی نظمیں ''موت'' اور ''روٹیاں'' درحقیقت اس دور کی کامیاب عکاسی کرنے کے لیے کافی ہیں۔نظیر نے اپنی نظموں میں اصناف کی نمائندگی کے بجائے موضوعات کی نمائندگی پر خصوصی توجہ دی ہے۔نظم ''موت'' کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

دن رات دُن مچی ہے یہاں اور پڑی ہے جنگ　　چلتی ہے نت اجل کی سناں گولی اور تفنگ
جن کا قدم بڑھا وہ مرا ' وہیں بے درنگ　　جو جی چھپا کے بھاگا تو اس کا ہوا یہ رنگ
وہ بھاگتے میں تیغ و تبر کھاکے مرگیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آکے مرگیا

21.6.1 نظیر کی انسان دوستی

نظیر کی نظموں میں انسان دوستی کا جذبہ نمایاں ہے وہ پورے احساس کے ساتھ انسان کی قدر اور اس کی زندگی کی حفاظت کے خیالات کو اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔وہ صرف نادار و مفلس انسان سے ہی محبت نہیں کرتے بلکہ ان کی شاعری میں ہر انسان سے محبت کا جذبہ نمایاں ہوتا ہے۔ان کی مشہور نظم ''آدمی نامہ'' اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے یہاں انسانیت کا درد ہے۔روٹی انسان کی زندگی کا اہم مسئلہ ہے۔ہر ایک روٹی کے لیے در در کی خاک چھانتا ہے۔بھوکا ہو تو چاند سورج بھی اسے روٹی ہی نظر آتے ہیں۔

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے　　یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کس لیے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے　　ہم تو نہ چاند سمجھے نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو سب نظر آتی ہیں روٹیاں

اپنی مشہور نظم ''مفلسی'' اور آٹے دال'' میں انسان کی بے بسی کو ظاہر کیا ہے۔نظم ''مفلسی'' میں لکھتے ہیں:

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر　　دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر
ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر　　جس طرح کتے لڑتے ہیں ایک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی

نظیر نے مفلسی کے علاوہ آٹے دال' کوڑی نامہ' پیسہ جیسی نظمیں لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ سب زندگی کے حقائق ہیں اس کے بغیر دنیا میں انسان کی کوئی اہمیت نہیں۔ان کی نظم ''آٹے دال'' کا یہ بند ملاحظہ ہو:

گر نہ آٹے دال کا ہوتا قدم یاں درمیاں　　منشی و میر و وزیر و بخشی و نواب و خاں
جاگتے دربار میں کیوں آدھی آدھی رات یاں　　کیا عجب نقشہ پڑا ہے آن کر کہیے میاں
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کی

نظیر اکبر آبادی ایک ایسے حقیقت پسند شاعر ہیں جن کی نظموں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسانیت کی بقا کے لیے انسان کو جینے کے یکساں وسائل ملنے چاہئیں۔نظیر نے بعض نظمیں بچوں کے لیے بھی لکھی ہیں جیسے ریچھ کا بچہ' بلی کا بچہ وغیرہ۔نظیر کے بعض موضوعات تو اتنے دلچسپ اور انوکھے ہیں کہ ان پر آج تک بھی کسی شاعر نے قلم نہیں اٹھایا مثلاً کوراہر تن' لکڑی' تل کے لڈو وغیرہ۔

21.6.2 نظیر کے اشتراکی خیالات

اردو کے شاعروں میں اشتراکی خیالات کا نظریہ بیسویں صدی کے ابتدائی دہوں میں نظر آتا ہے مگر نظیر اکبر آبادی اٹھارویں صدی کے نصف اول میں ہی اشتراکی خیالات کے علم بردار نظر آتے ہیں۔اشتراکی خیالات میں دولت کی یکساں تقسیم کو اہمیت دی جاتی ہے۔نظیر اکبر آبادی کی نظموں میں جہاں روٹی کا ذکر ہے وہیں روزگار کے نہ ملنے پر انسان میں پیدا ہونے والی بے بسی کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔یہ بھی حقیقت ہے کہ نظیر نے اپنے اشتراکی خیالات

میں بادشاہت یا شہنشاہیت کی مخالف نہیں کی بلکہ ان کی نظمیں ''آدمی نامہ''۔ ''تلاش زر''۔ ''روٹی''۔ ''مفلسی''۔ ''آٹے دال''۔ ''کوڑی نامہ'' وغیرہ کے مطالعہ سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ نظیر نے اشترا کی کلچر کی نمائندگی کی ہے اور ان کے اشترا کی کلچر میں جہاں ''عیدالفطر''۔ ''شب برات'' اور ''عیدگاہ اکبر آباد'' پر نظمیں موجود ہیں تو وہیں ''ہولی''، ''دیوالی'' اور ''بسنت'' پر بھی نظمیں ملتی ہیں۔

21.6.3 نظیر کی شاعری میں مناظرِ قدرت کی عکاسی

بنیادی طور پر نظیر ایک عوامی شاعر ہیں اس لیے ان کی شاعری میں جہاں قدرتی مناظر کا عکاس دکھائی دیتا ہے وہیں عرس ،میلوں اور تہواروں کے مناظر بھی پیش کیے گئے ہیں۔ان کی مشہور نظم ''برسات کی بہاریں'' قدرتی مناظر کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔اس کے علاوہ ان کی نظم ''گرمی'' بھی اس بات کی دلیل ہے کہ نظیر اکبر آبادی نے قدرتی مناظر کو پورے سلیقے کے ساتھ اپنی شاعری میں شامل کیا۔نظیر کی نظموں میں مناظر قدرت کی عکاسی لفظوں کے ذریعے نمایاں ہے۔ان کی نظمیں ''بنجارہ نامہ'' اور ''آدمی نامہ'' بھی ایک طرح سے انسان کے مختلف روپ ورنگ کی عکاسی کرتی ہیں۔ان نظموں میں بین السطور اخلاقی اقدار بھی سامنے آتے ہیں۔ان کی ایک مشہور نظم ''کل جگ'' کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

نیکی کا بدلہ نیک ہے بد کر بدی کا ساتھ لے　　کانٹا لگا کانٹے پھلیں، پھل پات بو پھل پات لے
کل جگ نہیں، کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

قدرتی مناظر کے علاوہ نظیر اکبر آبادی ہر نظم کو کسی نہ کسی فطری منظر سے وابستہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی نظموں میں نیکی، سچائی اور حقیقت کی بھرپور نمائندگی ہوتی ہے اور اسی خصوصیت کی وجہ سے نظیر اکبر آبادی کی نظموں کے مناظر اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ان کی نظم ''بل دیو سنگھ کا میلا'' اور ''عیدگاہ اکبر آباد'' کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظیر نے اپنے ماحول کے مناظر کو بھی نظموں میں شامل کرلیا ہے۔

21.6.4 نظیر کے کلام کی لسانی خصوصیات

نظیر اکبر آبادی اردو نظم کے واحد شاعر ہیں جنھوں نے عربی، فارسی، پنجابی، اودھی، برج، کھڑی بولی اور سنسکرت کے الفاظ کو پوری خصوصیات کے ساتھ اپنی شاعری میں شامل کیا۔نظیر کی شاعری میں فارسی الفاظ اور تراکیب کی کمی نہیں۔وہ کفر وایماں، دیر وحرم، سبحہ وزنار کی تراکیب کے علاوہ عاشق، دلبر، دشت اور آہنگ کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔کھڑی بولی، برج اور پنجابی سے آنند، بھیڑ، جنم، تت بھو، سنسار، لچھن، اوتار، سروپ، پرتپال، مدھ مست کے الفاظ ان کی شاعری میں جگہ پاتے ہیں۔وہ نہ صرف چولھا، ہانڈی اور تنور کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں بلکہ ایسے اودھی کے الفاظ بھی ان کی شاعری میں جگہ بناتے ہیں جنہیں صرف انھوں نے اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔پھل پات کی ترکیب پر خالص اودھی کا اثر دکھائی دیتا ہے۔مخاطبت کے لیے ''بابا'' کے لفظ کا استعمال بھی خالص ہندوستانی مزاج کی نمائندگی کرتا ہے۔غرض نظیر اکبر آبادی نے اپنی شاعری میں بے شمار ہندوستانی الفاظ استعمال کیے جنہیں نہ نظیر اکبر آبادی سے پہلے کسی شاعر نے استعمال کیا تھا اور نہ نظیر کے بعد کسی شاعر نے اپنی شاعری میں ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔نظیر کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی جس کا اندازہ ان کی مخمس کے اس بند سے بھی ہوتا ہے۔

رنگریز بیٹھے رنگتے ہیں رنگت ہزار یا　　سرخ و گلابی، زرد، سیاہ، سبز دھاریا
مخمل کوئی بنی، کوئی مشرو، کٹاریا　　جنگل میں جاکے دیکھا تو پھر واں بھی نیاریا
نت خاک چھانتا ہے پڑا پیٹ کے لیے

نٹ کھٹ، اچکّے، چور، دغا باز، راہ مار　　عیّار، جیب کترے، نظر باز، ہوشیار
سب اپنے اپنے پیٹ کے کرتے ہیں کاروبار　　کوئی خدا کے واسطے کرتا نہیں شکار
بلی بھی مارتی ہے چوہا پیٹ کے لیے

بیٹھے ہیں چوک میں جو کہاتے حکیم جی ڈبیا ہر ایک دوا کی بنی ہے دھری بھی
پیسے دوا کے آویں تو آنکھوں میں آوے جی بیمار کا تو کچھ نہیں کرتے علاج ' جی
اپنی ہی کچھ کرے ہے دوا پیٹ کے لیے

اس نظم کے مختلف بند پر برج' کھڑی' پنجابی اور اودھی کے اثرات کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. نظیر کی نظموں کے موضوعات کیا کیا ہیں؟
2. نظیر کی نظموں میں مناظر قدرت کی نشاندہی کیجیے۔
3. نظیر کی شاعری پر مختلف زبانوں کے اثرات کا جائزہ لیجیے۔

21.7 نظم ''ہولی''

آ جھمکے عیش وطرب کیا کیا' جب حُسن دکھایا ہولی نے ہر آن خوشی کی دھوم ہوئی ' یوں لطف جتایا ہولی نے
ہر خاطر کو خورسند کیا ' ہر دل کو لبھایا ہولی نے دفِ رنگیں نقش سنہری کا ' جس وقت بجایا ہولی نے
بازار گلی اور کوچوں میں ' غل شور مچایا ہولی نے

کچھ طبلے کھٹکے تال بجے' کچھ ڈھولک اور مردنگ بجی کچھ جھانجھ بیں بیں' رُبابوں کی' کچھ سارنگی اور چنگ بجی
کچھ تار طنبوروں کے جھنکے' کچھ ڈھمڈھی اور منہ چنگ بجی کچھ گھنگرو کھنکے جھم جھم جھم' کچھ گت گت پر آہنگ بجی
ہے ہر دم ناچنے گانے کا یہ تار بندھایا ہولی نے

ہر جا گہ تھال گلالوں سے' خوش رنگت کی گلکاری ہے اور ڈھیر عبیروں کے لاگے' سو عشرت کی تیاری ہے
ہیں راگ بہاریں دکھلاتے' اور رنگ بھری پچکاری ہے منہ سرخی سے گلنار ہوئے' تن کیسر کی سی کیاری ہے
یہ روپ جھمکتا دکھلایا یہ رنگ دکھایا ہولی نے

پوشاکیں چھڑکی رنگوں کی' اور ہر دم رنگ فشانی ہے ہر وقت خوشی کی جھمکیں ہیں' پچکاری کی رخشانی ہے
کہیں ہوتی ہے دھینگا مشتی کہیں ٹھیری کھینچا تانی ہے کہیں لٹیاں جھمکیں رنگ بھری' کہیں جوتا کیچڑ پانی ہے
ہر چار طرف خوش حالی کا ' یہ جوش بڑھایا ہولی نے

ہر آن خوشی سے آپس میں' سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں رخسار گلالوں سے گلگوں' کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں
کچھ راگ اور رنگ جھمکتے ہیں' کچھ مے کے جام چھلکتے ہیں کچھ کودیں ہیں کچھ اچھلیں ہیں' کچھ ہنستے ہیں کچھ بکتے ہیں
یہ طور یہ نقشہ عشرت کا ' ہر آن بنایا ہولی نے

ہیں کیا کیا سر میں رنگ بھرے اور سوانگ بھی کیا کیا آتے ہیں کر باتیں ہر دم جہل بھری' خوش ہنستے اور ہنساتے ہیں
نے کچھ جوگی چیلے بیٹھے ہیں کچھ کانیوں کے گاتے ہیں کچھ اور طرح کے سوانگ بنیں کچھ ناچتے اور کچھ گاتے ہیں
ہر آن نظیر اس فرحت کا ' سامان دکھایا ہولی نے

21.7.1 نظم ''ہولی'' کا تجزیہ

نظیر کی نظم ''ہولی'' کا تعلق ہندوستان کے ایک رنگ رنگیلے تہوار سے ہے' جس میں رنگ و پانی کے ساتھ دلوں کی کدورتیں دور ہو جاتی ہیں۔ یہ چھ

بند کا مخمس ترکیب بند ہے۔ ہر بند ہولی کا ایک ایک منظر پیش کرتا ہے جس میں زندگی ہی زندگی ہے۔ نظم میں ہر چار مصرعوں کے بعد ایک مصرعے کو دہراتے ہوئے ایک ایک منظر کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس نظم میں طبلے کی تال، ڈھولک اور مردنگ کی تھاپ، رباب اور سارنگی کی آوازوں، تنبوروں کی جھنک اور گھنگروؤں کی چھنک سے ایک خوشگوار تاثر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نظم میں گلال، عبیر، رنگ اور پچکاری کا ذکر کر کے اس تہوار میں کی جانے والی دھینگا مشتی، کھینچا تانی اور کیچڑ پانی کے مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ رنگ چھڑکنے، راگ راگنی کی محفلوں، شراب کے جام چھلکنے اور کھیل کود کی کیفیت کو مناسب حال الفاظ کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔ نظیر نے اس نظم میں فارسی و ہندی الفاظ کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ اس سے نظیر کے گہرے مشاہدے کا اندازہ ہوتا ہے۔ پانچ پانچ مصرعوں پر مشتمل یہ چھ بند کی نظم ہولی کی مختلف کیفیتوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ پہلے بند میں نظیر اکبر آبادی نے اس حقیقت کی نمائندگی کی ہے کہ ہولی کے آنے کی وجہ سے عیش و عشرت کا موقع فراہم ہو گیا ہے اور ہر طرف خوشی کی دھوم مچی ہے۔ نظم کے دوسرے بند میں نظر اکبر آبادی نے اپنے دور میں استعمال ہونے والے باجوں اور سازوں کی تفصیل پیش کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ طبلے کی تال کھٹک رہی ہے، ڈھولک اور مردنگ بج رہے ہیں۔ رباب، سارنگی اور چنگ کی آوازیں پھیلتی جا رہی ہیں۔ تنبورے کے تار جھنک رہے ہیں اور گھنگرو کی آواز پر لوگ دھوم مچا رہے ہیں۔ غرض ناچنے گانے کا یہ سلسلہ ہولی کی بدولت ہے۔ نظم کے تیسرے بند میں وہ لکھتے ہیں کہ تھالوں میں گلال پیش ہو رہے ہیں اور پچکاری سے رنگ چھڑکے جا رہے ہیں۔ عبیر چھڑکا جا رہا ہے۔ لوگوں کی خوشیوں کا ذکر کرتے ہوئے نظیر نے یہ لکھا ہے کہ رنگ بھری پچکاری سے لوگوں کے منہ اور جسم گلنار ہو رہے ہیں اور جسم رنگ میں تر بتر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ تمام انداز ہولی کی وجہ سے دکھائی دے رہے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی نے نظم کے چوتھے بند میں رنگ کھیلتے ہوئے خوشی میں کی جانی والی دھینگا مشتی اور کیچڑ پانی میں تر بتر ہونے والے منظر کی عکاسی کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ خوشحالی کا جوش ہولی کی وجہ سے چاروں طرف نمایاں ہے۔ نظم کے پانچویں بند میں ہنس ہنس کے رنگ چھڑکنے اور کپڑوں سے رنگ ٹپکنے کے ساتھ ساتھ شراب کے جام چھلکنے اور ہنستے کھیلتے لوگوں کے بے تکلفانہ فقروں اور جملوں کو نظم کرتے ہوئے نظیر اکبر آبادی نے یہ بتایا کہ خوشی کا یہ نقشہ ہولی کی وجہ سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ نظم کے آخری بند میں نظر اکبر آبادی نے انسانی حرکات و سکنات کو الفاظ میں پیش کر دیا ہے اور بتایا کہ لوگ ہنستے کھیلتے کس طرح خوش ہیں۔ کبھی وہ سوانگ بھرتے ہیں اور کبھی موج مستی کی باتیں کرتے ہوئے ہولی کی وجہ سے خوش ہو رہے ہیں۔ کچھ گانے میں مصروف ہیں تو کچھ ناچنے اور سوانگ بھرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ غرض خوشی کا یہ سامان ہولی کی وجہ سے میسر آیا ہے۔ نظیر نے نظم ہولی کے ذریعہ ایک ہندوستانی تہوار میں منائی جانے والی خوشیوں کو بڑے دلچسپ انداز میں نظم کر دیا ہے۔ اس نظم میں سادہ زباں اور عوامی الفاظ کے استعمال کی وجہ سے نظم کا لطف دوبالا ہو گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہم بھی ہولی کے تہوار میں شریک ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. نظم ہولی میں کن کن باجوں اور سازوں کے نام آئے ہیں؟
2. رنگوں کے لیے کون کون سی چیزیں استعمال کی گئی ہیں؟

21.8 نظم "تندرستی"

ہیں مرد اب وہی کہ جنھوں کا ہے فن درست — حرمت انھیں کے واسطے جن کا چلن درست
رہتا نہیں کسی کا سدا مال دھن درست — دولت رہی کسی کی نہ باغ و چمن درست
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

دنیا میں اب انھوں کے تئیں کہیے بادشاہ — جن کے بدن درست ہیں دن رات سال و ماہ
جس پاس تندرستی و حرمت کی ہو سپاہ — ایسی پھر اور کون سی دولت ہے واہ واہ
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

جو گھر میں اپنے میری و، حشمت پناہی ہے ــــ بن تندرستی، سب میں، خرابی تباہی ہے
یہ تندرستی یارو، بڑی بادشاہی ہے ــــ سچ پوچھیے تو عین یہ فضلِ الٰہی ہے
جتنے سخن ہیں سب میں، یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے، اور تندرست

گر دولتوں سے اُس کا، بھرا ہے تمام گھر ــــ بیمار ہے تو خاک سے بدتر ہے، سب وہ زر
ہو تندرست گرچہ، یہ مُفلس ہے سر بسر ــــ پھر نہ کسی کا خوف، نہ ہرگز کسی کا ڈر
جتنے سخن ہیں سب میں، یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے، اور تندرست

عاجز ہو یا حقیر ہو، پر تندرست ہو ــــ بے زر ہو یا امیر ہو، پر تندرست ہو
قیدی ہو یا اسیر ہو، پر تندرست ہو ــــ مفلس ہو یا فقیر ہو، پر تندرست ہو
جتنے سخن ہیں سب میں، یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے، اور تندرست

اس میں تمام ختم ہیں، عالم کی خوبیاں ــــ ہو تندرستی، اور ملے حُرمت سے آب و ناں
قسمت سے، جب یہ دونوں، میسر ہوں، پھر تو ہاں ــــ پھر ایسی، اور کون سی، دولت ہے میری جاں
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

پروا نہیں اگرچہ، لکھایا پڑھا نہ ہو ــــ محتاج حق سوا، یہ کسی اور کا نہ ہو
حسن و جمال و علم و ہنر، گو ملا نہ ہو ــــ اک تندرستی چاہیے، کچھ ہووے یا نہ ہو
جتنے سخن ہیں سب میں، یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے، اور تندرست

بیمار گرچہ لاکھ طرح، سے ہو بادشاہ ــــ تو اس کو جانیے یہ گدا سے بھی ہے تباہ
ہم تو اسی کو شاہ کہیں، اور جہاں پناہ ــــ اب جس کا تن درست ہو، حُرمت سے ہو نباہ
جتنے سخن ہیں سب میں، یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے، اور تندرست

ہوں گرچہ لاکھ دولتیں، بیمار کے کنے ــــ اور نعمتوں کے ڈھیر، لگے ہوں بنے ٹھنے
بہتر ہیں مفلسی کے میاں، چابنے چنے ــــ جو تندرست ہیں، وہی دولھا ہیں اور بنے
جتنے سخن ہیں سب میں، یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے، اور تندرست

جب تندرستیوں کی رہیں دل میں بستیاں　　پھر سو طرح کے عیش ہیں اور مے پرستیاں
کھانے کو نعمتیں ہوں ' و یا فاقہ مستیاں　　سب عیش اور مزے ہیں ' جو ہوں تندرستیاں
جتنے سخن ہیں سب میں ' یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے ' اور تندرست

آیا جو دل میں ' سیر چمن ' کو چلے گئے　　بازار ' چوک ' سیر تماشے میں خوش ہوئے
بیٹھے اٹھے خوشی سے ' ہر اک جا چلے پھرے　　جاگے مزے میں رات کو یا خوش ہو سو رہے
جتنے سخن ہیں سب میں ' یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے ' اور تندرست

قدرت سے یہ جو ' تن کی بنی ہے ہر ایک کل　　جب تک یہ کل بنی ہے ' تو ہے آدمی کو کل
گر ہو خدانخواستہ ' ایک کل بھی چل بہ چل　　پھر نہ خوشی ' نہ عیش نہ کچھ ' زندگی کا پھل
جتنے سخن ہیں سب میں ' یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے ' اور تندرست

ادنیٰ ہو یا غریب تونگر ہو یا فقیر　　یا بادشاہ شہر کا یا ملک کا وزیر
ہے سب کو تندرستی و حرمت ہی دلپذیر　　جو تو نے اب کہا سو یہی سچ ہے اے نظیر
جتنے سخن ہیں سب میں ' یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے ' اور تندرست

21.8.1 نظم ''تندرستی کا تجزیہ''

یہ نظم مسدس ترجیع بند ہے اس میں پہلے چار مصرع ہم ردیف و قافیہ ہوتے ہیں۔ پانچواں اور چھٹا مصرع جوں کا توں ہر بند میں دہرایا جاتا ہے جیسے تندرتی میں مرجع میں آنے والے شعر یہ ہے:

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

''تندرستی''، نظیر اکبر آبادی کی طویل نظموں میں سے ایک ہے۔ اس کے تیرہ بند ہیں۔ ہر بند میں نظیر نے تندرستی اور اس کی اہمیت و افادیت کو مختلف انداز سے نمایاں کیا ہے۔ وہ بار بار اسی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں کہ دنیا میں جتنی باتیں اہم ہیں ان میں سب سے اہم بات یہی تندرستی ہے اور دعا کرتے ہیں کہ خدا انسان کو عزت کے ساتھ تندرست رکھے۔ اس نظم میں فارسی اور عربی لفظیات کا خوبصورت امتزاج ہے۔ اس موضوع میں جہاں تنوع ہے وہیں اظہار بیان میں قوت ہے کیونکہ اس موضوع میں صداقت ہے۔ نظم میں بلا کی روانی ہے۔

اس نظم کا عنوان نظیر نے تندرستی رکھا ہے لیکن ٹیپ کی۔ بیت میں انہوں نے تندرستی کے ساتھ عزت و آبرو کو بھی اہمیت دی..... پہلے بند میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں وہی مرد، مرد ہے جس کے ہاتھ میں کوئی فن ہو۔ جس کے آداب اخلاق درست ہوں ان ہی کو دنیا میں عزت ملتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دھن دولت سدا ساتھ نہیں دیتے۔ دنیا کبھی ایک حال پر قائم نہیں رہتی۔ کسی کی دولت رہی نہ کسی کا باغ و چمن سے مطلب' کسی کی ملکیت باقی نہیں رہی۔ جتنی باتیں سچی ہیں ان میں سب سے بڑا سچ یہ ہے کہ اللہ عزت و آبرو کے ساتھ صحت و تندرستی سے رکھے۔

دنیا میں اسی کو بادشاہ کہنا چاہیے جس کے پاس صحت کی دولت ہو جس کے دن رات ماہ و سال صحت و تندرستی کے ساتھ گزرتے ہوں۔ جس کے پاس صحت مند اور تندرست سپاہ یعنی طاقت ہو سمجھو کہ اس سے زیادہ دولت ہو نہیں سکتی۔

میرے اپنے گھر میں جو میری جاہ وحشمت ہے عزت ہے، دبدبہ ہے وہ صحت کی بنا پر ہے، جو بیمار ہے اور کمزور ہے سمجھو کہ اس کی تباہی ہے۔ تندرستی بڑی بادشاہی ہے سچ پوچھیے تو تندرستی اللہ کا بڑا فضل ہے۔

گھر میں دنیا کی دولت ہو عیش وعشرت کا ہر سامان ہو مگر تندرستی نہ ہو تو اس سے کیا فائدہ؟ بیمار آدمی تو عیش وعشرت کا لطف بھی تو اٹھا نہیں سکتا۔ پروا نہیں آدمی مفلس ہو، مگر تندرست ضرور ہو۔ پھر اسے نہ کسی کا خوف ہے نہ ڈر

نظیر کہتے ہیں کہ آدمی اپنی مالی حیثیت سے خواہ کتنا ہی عاجز اور حقیر ہو غریب ہو یا امیر ہو اس کا تندرست ہونا ضروری ہے۔ انسان کسی قید و بلا میں ہو یعنی مصیبت میں ہو یا مفلس ہو فقیر اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ تندرست ہونا کافی ہے جو سب سے بڑی دولت ہے۔

اس بند میں نظیر نے آبرو کی توضیح کی ہے۔ کہتے ہیں تندرستی کے ساتھ عزت بھی ملتی ہو قدر بھی ہوتی ہو اور آب ودانہ یعنی پیٹ بھرنے کی سہولت ہو تو یہ سمجھو کہ سب کچھ مل گیا۔ سارے عالم کی خوبیاں ان ہی دو باتوں میں ہیں کہ پیٹ بھرتا ہو عزت کے ساتھ اور تندرستی بھی ملی ہو تو پھر اور کون سی دولت اس سے بڑھ کر ہو سکتی ہے۔

انسان پڑھا لکھا نہ بھی ہو تو پروا نہیں، سوائے اللہ کے کسی کا محتاج نہ ہو۔ بھلے ہی وہ مالک حسن و جمال نہ ہو حتیٰ کہ اس میں کوئی ہنر بھی نہ ہو تو بھی کوئی بات نہیں۔ بس ایک تندرستی چاہیے کچھ ہووے یا نہ ہووے"

ایک بادشاہ ہے مگر بیمار ہے تو سمجھو کہ وہ بادشاہ نہیں گدا ہے فقیر ہے کیونکہ وہ محتاج ہے۔ ہم تو اس کو بادشاہ کہیں گے جس کے پاس تندرستی ہو اور جس کے پاس عزت وحرمت ہو۔

بیمار ہے مگر لاکھوں نعمتیں ہیں، دولت بے حساب ہے، نعمتوں کے ڈھیر ہیں۔ ہم تو یہ کہیں گے کہ اس دولت سے مفلسی میں چنے کھا کر پیٹ بھرنا اچھا ہے۔ جو تندرست ہے سمجھو وہی محفل کا دولہا یعنی مرکز نظر ہے۔

تندرستی سے ہی دل کی آبادیاں ہیں، سو طرح کے عیش ہیں، مستیاں ہیں۔ کھانے کو نعمتیں ملتی ہوں یا فاقہ کشی کرنی پڑتی ہو اگر تندرست ہو تو فاقہ و بھوک میں عیش کے مزے ملتے ہیں۔

تندرست آدمی کے مزے ہی مزے ہیں۔ جی میں آیا سیر چمن کو چلے گئے سیر تماشے کے لیے بازار چوک چلے گئے۔ کیا بیمار آدمی یہ سب کچھ کر سکتا ہے اٹھے بیٹھے جہاں چاہے چلے گئے۔ صحت ہو تو رات میں جاگیں سو رہیں دونوں میں مزا ہے۔

نظیر نے اس شعر میں لفظ کل سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ کہتے ہیں قدرت نے جو ہمارے جسم کی مشین بنائی ہے جب تک یہ مشین خیر خوبی سے چلتی ہے آدمی چین سے ہے۔ اگر خدانخواستہ جسم کے مشین کا ایک پرزہ بھی خراب ہو جائے تو سمجھو کہ پھر چل چلاو ہے۔ پھر نہ خوشی ہے عیش ہے نہ زندگی کا کوئی کھیل ہے

دنیا میں کوئی فقیر ہو، امیر ہو یا وہ بادشاہ ہو یا کسی ملک کا وزیر ہو، سبھی کو تندرستی اور عزت و توقیر عزیز ہے۔ نظیر یہ جو کہتا ہے دعا کرتا ہے وہی سچ ہے کہ اللہ دنیا میں عزت و آبرو سے اور صحت و تندرستی کے ساتھ رکھے۔

نظیر نے اپنی نظم میں بے شمار تشبیہات اور استعارے استعمال کیے ہیں۔ تندرست انسان کو بادشاہ اور دولہا قرار دینا اور تندرستی کی بدولت خدا کے فضل کی نمائندگی اور تندرستی کی وجہ سے ہی محنت و مشقت انسان کو حاصل ہونے کی دلیل پیش کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ تندرستی ہو تو فاقہ مستی بھی گوارا ہو جاتی ہے جب کہ تندرستی نہ ہو تو انسان کو کوئی چیز گوارا نہیں۔

نظیر اکبر آبادی نے نظم "تندرستی" میں صحت مند انسان کی مختلف خصوصیات کی نمائندگی کی ہے۔ وہ کبھی صحت مند انسان کو دھنوان کہتے ہیں تو کبھی بادشاہ۔ نظیر نے تندرست انسان کے پاس تندرستی اور حرمت کی فوج ہونے کا اشارہ دیا ہے کہ صحت کی وجہ سے عزت بنی رہتی ہے اور صحت کا نہ ہونا خرابی اور تباہی کا باعث ہے۔ صحت کو بادشاہی کا درجہ دیتے ہوئے یہ بات بتائی ہے کہ عاجز اور فقیر ہونے کے باوجود بھی ایک صحت مند انسان بیمار امیر پر فوقیت رکھتا ہے۔ صحت مند انسان کا قیدی ہونا بھی برائی کی بات نہیں۔ تندرست انسان کی بے شمار خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے نظیر نے یہ بات بتائی ہے کہ انسان کا صحت مند ہونا لازمی ہے اگر وہ پڑھا لکھا نہ ہو تو کوئی امر مانع نہیں۔ نظیر حسن و جمال اور علم و ہنر پر صحت کو ترجیح دیتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ صحت مندی کی وجہ سے

دل کی بستیاں آباد ہیں اور عیش کے مزے لوٹے جاسکتے ہیں۔ چمن کی سیر، تماشے ہر ایک کا لطف صحت سے ہی ممکن ہے۔

نظیر اکبر آبادی کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے نظم تندرستی میں جہاں صحت کو اہمیت دی ہے وہیں بیمار کے اوصاف بھی گنائے ہیں اور یہ بات ثابت ہے کہ بیمار انسان چاہے لاکھ دولت والا ہو اس کے دھن کا کوئی ٹھکانہ نہ ہو لاکھ فن کا ماہر انسان ہو لیکن بیماری اس کے جسم کا حصہ بن جائے تو اس کی عزت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ بیمار نہ صرف مفلس، عاجز اور حقیر ہوتا ہے بلکہ اسے ہر وقت خوف اور ڈر لگا رہتا ہے۔ وہ ایک قیدی کی زندگی گزارتا ہے۔ تندرستی کے بغیر بادشاہ بھی ہو تو اس کی حیثیت فقیر جیسی ہو جاتی ہے وہ نہ تو چمن کی سیر کے مزے لے سکتا ہے اور نہ سیر تماشے سے خوشی حاصل کر سکتا ہے۔ تمام نعمتیں اس کے روبرو بے فیض ہو جاتی ہیں۔

نظیر اکبر آبادی جس عہد میں زندگی گزار رہے تھے وہ درحقیقت ایسا دور تھا جب کہ ہندوستان میں علاج معالجہ کی سہولت نہیں تھی اور انسان بیمار ہونے کے ساتھ ہی موت کے دہانے پر پہنچ جاتا تھا۔ نظیر نے اپنی نظم تندرستی میں جسم کو تندرست رکھنے کی اہمیت پر زور دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ تندرست جسم ہی خدا کی نعمت ہے اور اسے نعمتیں حاصل کرنے اور خدا کی قدرت کے مزے لوٹنے کے مواقع حاصل رہتے ہیں چنانچہ وہ دعائیہ کلمات کے ذریعہ خدا کے حضور میں گڑگڑاتے ہیں کہ اللہ انسان کو تندرست اور آبرو سے رکھے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. نظیر اکبر آبادی نے نظم تندرستی میں کیا دعا کی ہے؟
2. نظم ''تندرستی'' کس ہیئت میں ہے۔ 1) مثلث 2) مسدس 3) مخمس
3. بیماری اور تندرستی کا مقابلہ اس نظم میں کیسے کیا گیا ہے؟

21.9 نظم ''مفلسی''

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی — کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی — بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

کہیے تو اب حکیم کی سب سے بڑی ہے شاں — تعظیم جس کی کرتے ہیں نواب اور خاں
مفلس ہوئے تو حضرت لقمان کیا ہیں یاں — عیسیٰ بھی ہو تو کوئی نہیں پوچھتا میاں
حکمت حکیم کی بھی ڈوباتی ہے مفلسی

جو اہل فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں — مفلس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اُسے بے بتاتے ہیں — وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

مفلس کرے جو آن کے مجلس کے بیچ حال — سب جانیں روٹیوں کا یہ ڈالا ہے اُس نے جال
گر گر پڑے تو کوئی نہ لیوے اُسے سنبھال — مفلس میں ہوویں لاکھ اگر علم اور کمال
سب خاک بیچ آکے ملاتی ہے مفلسی

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر — دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر
ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر — جس طرح کتے لڑتے ہیں اک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی

کرتا نہیں حیا سے جو کوئی وہ کام آہ　　مفلس کرے ہے اس کے تئیں انصرام آہ
سمجھے نہ کچھ حلال نہ جانے حرام آہ　　کہتے ہیں جس کو شرم و حیا ننگ و نام آہ
وہ سب حیا و شرم اٹھاتی ہے مفلسی

لازم ہے گر غمی میں کوئی شور و غل مچائے　　مفلس بغیر غم کے ہی کرتا ہے ہائے ہائے
مرجاوے گر کوئی تو کہاں سے اُسے اٹھائے　　اس مفلسی کی خواریاں کیا کیا کہوں میں ہائے
مُردے کو بن کفن کے گڑاتی ہے مفلسی

چولھے توا نہ پانی کے مٹکے میں آبی ہے　　پینے کو کچھ نہ کھانے کو اور نے رکابی ہے
مفلس کے ساتھ سب کے تئیں بے حجابی ہے　　مفلس کی جورو سچ ہے کہ ہاں سب کی بھابھی ہے
عزت سب اس کے دل کی گنواتی ہے مفلسی

کیسا ہی آدمی ہو پر افلاس کے طفیل　　کوئی گدھا کہے اسے ٹھہراوے کوئی بیل
کپڑے پھٹے تمام بڑھے بال پھیل پھیل　　منہ خشک دانت زرد بدن پر جما ہے میل
سب شکل قیدیوں کی بناتی ہے مفلسی

ہر آن دوستوں کی محبت گھٹاتی ہے　　جو آشنا ہیں ان کی تو الفت گھٹاتی ہے
اپنوں کی مہر غیر کی چاہت گھٹاتی ہے　　شرم و حیا و عزت و حرمت گھٹاتی ہے
ہاں ناخن اور بال بڑھاتی ہے مفلسی

جب مفلسی ہوئی تو شرافت کہاں رہی　　وہ قدر ذات کی وہ نجابت کہاں رہی
کپڑے پھٹے تو لوگوں میں عزت کہاں رہی　　تعظیم اور تواضع کی بابت کہاں رہی
مجلس کی جوتیوں پہ بٹھاتی ہے مفلسی

رکھتی نہیں کسی کی یہ غیرت کی آن کو　　سب خاک میں ملاتی ہے حرمت کی شان کو
سو محنتوں میں اس کی کھپاتی ہے جان کو　　چوری پہ آکے ڈالے ہے مفلس کے دھیان کو
آخر ' ندان بھیک منگاتی ہے مفلسی

دنیا میں لے کے شاہ سے اے یارو تا فقیر　　خالق نہ مفلسی میں کسی کو کرے اسیر
اشراف کو بناتی ہے اک آن میں حقیر　　کیا کیا میں مفلسی کی خرابی کہوں نظیر
وہ جانے جس کے دل کو جلاتی ہے مفلسی

21.9.1 نظم ''مفلس'' کا تجزیہ

نظیر اکبر آبادی اردو نظم کے ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے فطری موضوعات کے علاوہ سماجی' معاشی اور معاشرتی موضوعات پر بھی نظمیں لکھیں۔ ایسی ہی نظموں میں نظیر کی نظم ''مفلسی'' کا شمار ہوتا ہے۔ یہ نظم نظیر کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ اس نظم کو انہوں نے پانچ مصرعوں کے بند یعنی مخمس میں تحریر کیا ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے' جس میں سماجیاتی مطالعہ کے ساتھ نظیر نے ان حقائق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن کی وجہ سے مفلسی اور بدحالی کے پھیلنے کا امکان رہتا ہے۔ 19 بند پر مشتمل نظم ''مفلسی'' بنیادی طور پر وضاحتی انداز کی نظم ہے۔ اس نظم میں نظیر نے اپنے مشاہدے کی گہرائی اور تشبیہہ اور تلمیح کے استعمال اور محاورے کی گرمی سے ایسا ماحول تیار کر دیا ہے کہ یہ نظم مفلسی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔

نظم کے پہلے بند میں نظیر اکبر آبادی نے بتایا ہے کہ جب آدمی پر مفلسی کا حملہ ہوتا ہے تو وہ مختلف طریقوں سے انسان کو پریشان کرتی ہے۔ کبھی وہ رات بھر بھوکا سلاتی ہے اور کبھی پیاسا رہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جس پر بھی مفلسی آتی ہے اُسے ہر قسم کے دکھ اٹھانے پڑتے ہیں۔ حکیم جو مختلف بیماریوں کا علاج کرتا ہے اور جس کی عزت بڑے بڑے نواب اور پٹھان بھی کرتے ہیں لیکن وہ بھی غریب ہو جائے تو اس کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ حد یہ ہے کہ لقمان سے بڑا طبیب اور عیسیٰ جیسا مسیحا بھی موجود ہو لیکن وہ غریب ہو تو اس کی تمام تر حکمت غریبی میں ڈوب جاتی ہے۔

نظیر نے نظم کے تیسرے بند میں بتایا ہے کہ اہل علم و فضل بھی ہوں اور ان کو مفلسی گھیر لے تو وہ غریبی کی وجہ سے کلمہ تک بھول جانے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ بھوکے سے کوئی الف کے بارے میں پوچھے تو وہ اسے ب بتاتا ہے۔ غریب کے بچوں کو پڑھانے والا سدا مفلس ہی رہتا ہے اور اگر کوئی غریب کے گھر مفلسی آتی ہے تو وہ عمر بھر جا نہیں سکتی۔ اگر مفلس کسی مجلس کے درمیان اپنا حال بیان کرتا ہے تو لوگ یہی تصور کرتے ہیں کہ اس نے روزگار حاصل کرنے کے لیے یہ جال پھیلایا ہے۔ غریب کے پاس لاکھوں علم و کمال ہوں لیکن وہ مفلس ہو تو ہزار سنبھالا لینے کے باوجود اس سے لغزش ہو جاتی ہے۔ اس طرح مفلسی انسان کی تمام صلاحیتوں کو خاک میں ملا دیتی ہے۔

نظم ''مفلسی'' کے پانچویں بند میں نظیر اکبر آبادی نے بتایا ہے کہ جب انسان مفلس بن جاتا ہے تو اسے اپنی عزت سے زیادہ روٹی یا نان پیاری ہوتی ہے اور وہ ایک ایک روٹی پر جان دینے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ جہاں بھی روٹی اور کھانے کا خوان دیکھتا ہے اس پر بھوکے کتے کی طرح ٹوٹ پڑتا ہے۔ اس طرح مفلسی نہ صرف روٹی کے لیے جھگڑا کراتی ہے بلکہ حد درجہ ذلیل بھی کرواتی ہے۔ مفلسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حیا کی بنیاد پر جن کاموں سے انسان خود کو بچائے رکھتا ہے وہ سب کام کرنے پر وہ مجبور ہو جاتا ہے اور اس میں حلال و حرام کی بھی تمیز باقی نہیں رہتی۔ غرض جسے شرم و حیا کہتے ہیں مفلسی کی وجہ سے وہ انسان سے رخصت ہو جاتی ہے۔

نظم کے ذریعے نظیر اکبر آبادی نے ساتویں بند میں بتایا ہے کہ اگر انسان پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں تو اور وہ شور و غل مچائے تو لوگ گوارا کر لیتے ہیں لیکن مفلس کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ غم کے بغیر ہی ہائے ہائے کرتا ہے اور اس کے واویلا مچانے کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ مفلسی کی وجہ سے اس میں اس قدر ذلت آ جاتی ہے کہ اگر کوئی مر جائے تو لاش اٹھانے کے لیے اس کے پاس سرمایہ نہیں ہوتا۔ لاش کو بے کفن دفن کرنا پڑتا ہے۔ مفلسی کی وجہ سے نہ تو چولہے پر توا رکھا جا سکتا ہے اور نہ مٹکے میں پانی بھرا جا سکتا ہے۔ مفلسی کھانے پینے اور اس کے لیے رکابی حاصل کرنے کو بھی محتاج کر دیتی ہے جس کی وجہ سے مفلس بے غیرت بن جاتا ہے اور غریب کی بیوی کی عزت بھی ہر ایک کے دل سے ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو اگر مفلسی اسے گھیر لے تو اس کے طفیل انسان کی قابلیت گھٹ جاتی ہے اور اسے لوگ گدھے اور بیل کا درجہ دیتے ہیں کیونکہ وہ افلاس کے مارے پھٹے، کپڑوں اور بکھرے بالوں کے ساتھ جسم، منہ اور بدن کی پاکی پہ توجہ نہیں دے سکتا۔ افلاس کی وجہ سے انسان کی شکل قدیوں جیسی ہو جاتی ہے۔

مفلسی کا اثر کیا ہوتا ہے اس کا جائزہ لیتے ہوئے نظیر اکبر آبادی یہ بتاتے ہیں کہ جب کسی پر مفلسی آتی ہے تو اس کی وجہ سے دوستوں میں عزت گھٹ جاتی ہے اور چاہنے والوں کی محبت میں کمی آتی ہے، اپنے اور غیر میں فرق بڑھاتی اور اسی کے ساتھ شرم و حیا کے علاوہ عزت اور حرمت میں بھی مفلسی کی وجہ سے کمی آتی ہے۔ بہر حال انسان پر مفلسی آ جائے تو اس کی بدولت جسم کی صفائی نہ ہونے سے بال اور ناخن بڑھ جاتے اور انسان صفائی کی خصوصیات کھو دیتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی نے بتایا ہے کہ مفلسی کی وجہ سے شرافت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انسانی عزت باقی نہیں رہتی، عزت کے خاتمے کے ساتھ، تعظیم اور تواضع ختم ہو جاتی ہے اور انسان اس قدر ذلیل ہوتا ہے کہ اسے محفلوں میں جوتوں کے قریب بیٹھنا پڑتا ہے۔ غرض مفلسی ایک ایسی حقیقت ہے جو غیرت کو خاک میں ملانے، محنت کا خاتمہ کرنے اور انسان کو چوری کی طرف راغب کرنے کا کام انجام دیتی ہے اور اسی مفلسی کی وجہ سے انسان بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ نظم کے آخری بند میں نظیر اکبر آبادی کہتے ہیں کہ دنیا میں خدا کسی بادشاہ یا فقیر کو کبھی مفلسی میں گرفتار نہ کرے کیونکہ مفلسی ہی شریف انسان کو حقیر بناتی ہے۔ اس کی خرابیاں کہاں تک بیان کی جائیں بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ خدا ہر انسان کو مفلسی سے محفوظ رکھے کیوں کہ مفلسی انسان کے دل کو جلاتی ہے۔ نظیر اپنی اس نظم کو دعائیہ کلمات پر ختم کرتے ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کی نظم مفلسی میں بے شمار محاورے، تشبیہات اور استعارے استعمال ہوئے ہیں۔ ان کی نظم میں تلمیحات کی بھی کمی نہیں۔ وہ حضرت لقمان اور حضرت عیسیٰ کا تلمیحی اشارہ اپنی نظم میں استعمال کرتے ہیں۔ نظیر نے نئی لفظیات کو استعمال کرنے کے ساتھ روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کو بھی اس نظم میں جگہ دی ہے۔ چنانچہ بی بی کا نتھ، لڑکوں کے ہاتھ کے کڑے، چھت کی کڑیاں، دروازے کی زنجیر، چولھا، توا، رکابی اور کھانے پینے کی تمام چیزیں اس نظم

میں شامل ہیں۔ان کی تشبیہات اور استعارے اس حقیقت کا اشارہ کرتے ہیں کہ نظیر اکبر آبادی نے مفلسی کو ایک جرم کی حیثیت دی ہے۔ چنانچہ وہ انسان کو مفلسی کے دلدل سے نکالنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ مفلسی کی وجہ سے شرافت اور عزت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. نظم مفلسی کا فارم کیا ہے؟
2. نظیر نے مفلسی کے کیا کیا نقصانات گنوائے ہیں؟

21.10 خلاصہ

نظیر اکبر آبادی اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔انہوں نے طویل عمر پائی۔زندگی کے اٹھانوے بہاریں دیکھیں۔16 'اگست 1830 کو ان کا انتقال ہوا۔بڑی منتوں سے پیدا ہوئے اور لاڈ و پیار میں پرورش پائی۔ میلے ٹھیلوں سے رغبت رہی اور جب بڑے ہوئے تو شعر و شاعری کا چسکہ لگا۔غزل گوئی کی طرف توجہ دی لیکن نظم کی طرف طبیعت کی مناسبت کی وجہ سے نظمیہ شاعری میں کمال حاصل کیا۔ان کی نظموں میں ایجادی صلاحیتیں موجود ہیں۔ان کا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے ہر موضوع پر نظمیں لکھیں اسی لیے نظیر کو ایک سماجی شاعر کا درجہ دیا جاتا ہے۔ایک جانب وہ ہندوستانی میلے ٹھیلوں' عید و تہوار اور مختلف مقامات پر نظمیں لکھتے ہیں تو دوسری جانب دنیا کی بے ثباتی اور انسان کی مجبوریوں کو بھی نظموں کا وسیلہ بناتے ہیں۔نظیر کی تمام تر شاعری پابند نظموں کی آئینہ دار ہے۔ان کی شاعری میں عربی اور فارسی الفاظ ہی نہیں بلکہ سنسکرت اور ہندی کے الفاظ بھی کثرت سے دکھائی دیتے ہیں۔جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شاعری کے اظہار کے معاملے میں ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کے علمبردار تھے۔انہوں نے اپنی شاعری میں ہندو اور مسلم دونوں معاشروں کی نمائندگی کی۔چنانچہ ہندوستان کے ان دونوں اہم مذاہب کے عید و تہوار پر نظمیں لکھ کر نظیر نے اپنی شاعری کو بے مثال بنا دیا۔وہ ایک انسانیت دوست شاعر تھے۔ وہ ایک پکے مسلمان تھے لیکن ان کی نظموں میں ہندو مسلم اتحاد اور آفاقی مذہب کا تصور دکھائی دیتا ہے۔انہوں نے ہندوستانی موسم' تہوار اور ہندو اور مسلمانوں کے رسم و رواج کی تعریف میں بھی شاعری کی۔انہوں نے اپنی شاعری میں نجومیوں اور رمالوں کا مذاق اڑایا ہے۔نظیر کی شاعری انتہائی سادہ اور آسان ہے اور اس شاعری میں برج' پنجابی' اودھی اور کھڑی بولی کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ہولی' دیوالی' عید الفطر اور شب برات پر نظمیں لکھ کر انہوں نے اپنی وسیع المشربی کا ثبوت دیا۔ان کی نظموں میں مشترک لفظیات اور منظر نگاری کے علاوہ الفاظ کی نئی تراکیب اور ہیئت کے تجربے بھی موجود ہیں۔وہ اردو کے پہلے کامیاب عوامی شاعر ہیں انہوں نے غزل کی شاعری کے دور میں نظم کی روایت کو آگے بڑھایا اردو شاعری کو ایک نئی جہت دکھائی۔

21.11 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. نظیر اکبر آبادی کی زندگی کے حالات بیان کیجیے۔
2. نظیر کی شاعری کی انفرادیت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
3. نظیر کی کسی ایک نظم کا احاطہ کیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. نظیر کی نظموں کے موضوعات کا احاطہ کیجیے۔
2. نظیر اکبر آبادی کو سماج پسند شاعر قرار دینے کی کیا وجوہات ہیں؟
3. نظیر کی شاعری میں کن کن موضوعات کی نمائندگی ہوتی ہے؟
4. نظیر کی شاعری میں آفاقی نظریے کی نشاندہی کیجیے۔

21.12 فرہنگ

الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی
سماج	=	معاشرہ، سوسائٹی	وسیع المشرب	=	ہر معاملہ میں کشادہ ذہنی	روایت	=	کسی پرانی چیز کی نقل
دلدادہ	=	عاشق، فریفتہ	مرہون منت	=	احسان مند، شکر گزار	تفہیم	=	سمجھانا
ذوق وشوق	=	مزہ ورغبت	ضعیف الاعتقادی	=	کمزور اعتقاد کا ہونا	مسلمہ	=	مانا ہوا، تسلیم شدہ
مشاہدہ کار	=	معائنہ کرنے والا	آفاقی	=	ساری دنیا کا، عالمگیر	موقف	=	مقام
مشاہدہ	=	معائنہ	متوجہ	=	دھیان دینے والا	تنوع	=	قسم قسم کا
چسکہ لگانا	=	زبان کا مزہ لگنا	نعم البدل	=	اچھا بدلہ	مائل	=	راغب، شائق
خداشناس	=	خدا کو پہچاننا	ضامن	=	ذمہ دار، ضمانت دینے والا	مرقع	=	تصویروں کی کتاب، البم
منقبت	=	بزرگوں کی شان میں لکھی جانے والی شاعری				برگ سمن	=	سمن کا پتہ

نظم ہولی

خورسند	=	شاداں، خوش	لبھانا	=	مائل کرنا	عبیر	=	ایک خوشبو
گلنار	=	سرخ	پوشاکیں	=	لباس	رخشانی	=	درخشاں چمک دمک
دھینگا مشتی	=	لڑائی جھگڑا	لٹیاں	=	مٹی کے پیالے جس میں سیندھی پی جاتی ہے۔			

نظم تندرستی

حرمت	=	عزت	حقیر	=	چھوٹا، ادنی، بے قدر	اسیر	=	قید
گدا	=	فقیر	کل	=	پرزہ	تونگر	=	امیر پیٹ بھرا
نان	=	روٹی	استخوان	=	ہڈیاں	خواں	=	دستر
انصرام	=	انجام دینا	ننگ ونام	=	عزت وشہرت	خواری	=	ذلت
کلاونت	=	فن کار	گوری	=	ایک راگ	بھیانس	=	ایک راگ
حلال خور	=	(مہتر) غلاظت اٹھانے والا	ٹھٹھول	=	مذاق	مہر	=	محبت
حرمت	=	عزت	نجابت	=	شرافت	تعظیم	=	عزت، قدر ومنزلت
تواضع	=	آؤ بھگت، مہمان داری						

21.13 سفارش کردہ کتابیں

.1	نیاز فتح پوری۔	ماہ نامہ ''نگار''، نظیر نمبر جنوری 1940	.2	محمد علی اثر/اکبر علی بیگ	نظیر شناسی
.3	شمس الحق عثمانی	نظیر نامہ	.4	پروفیسر عبدالغفور شہباز	زندگانی بے نظیر
.5	سید طلعت حسین نقوی	نظیر اکبر آبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ	.6	محمد محمود علی رضوی	روح نظیر
.7	طلعت حسین نقوی	نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری	.8	سلیم جعفر	گلزار نظیر
.9	انتخاب نظیر اکبر آبادی	مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ دہلی	.10	مرزا فرحت اللہ بیگ	دیوان نظیر

اکائی: 22 مولانا حالؔی۔حیات، شخصیت کارنامے اور نظم نگاری

ساخت

22.1 تمہید

22.2 سوانحی حالات

22.2.1 حالی کی شعر گوئی سے دلچسپی

22.3 حالی بہ حیثیت غزل گو

22.3.1 مثنوی نگار حالی

22.3.2 حالی بہ حیثیت نظم نگار

22.3.3 حالی کی مرثیہ نگاری

22.4 حالی کے نثری کارنامے

22.5 حالی کی نظم نگاری کی خصوصیات

22.5.1 حالی کی نظموں کی لفظیات

22.5.2 حالی نظموں میں ارتقائی عمل

22.5.3 حالی کی نظموں کے موضوعات

22.5.4 حالی کی نظموں میں قدیم اور جدید کا امتزاج

22.6 نظم برکھارت

22.6.1 نظم برکھارت کا تجزیہ

22.7 مرثیہ دُلی

22.7.1 مرثیہ دہلی کا تجزیہ

22.8 شعر کی طرف خطاب

22.8.1 نظم شعر کی طرف خطاب کا تجزیہ

22.9 خلاصہ

22.10 نمونہ امتحانی سوالات

22.11 فرہنگ

22.12 سفارش کردہ کتابیں

22.1 تمہید

الطاف حسین حالؔی اردو شاعری کے اہم ستون ہیں۔ اردو میں نظم نگاری کو فروغ دینے والے شاعروں میں حالی کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ مولانا حالی نے اپنی تمام تر زندگی اردو شعر و ادب کی خدمت کے وقف کر دی تھی وہ ایک بہترین نثر نگار، منفرد لب و لہجے کے شاعر، اردو کے پہلے نقاد، سوانح نگار اور تبصرہ نگار تھے۔ اردو تنقید کی تاریخ میں ''مقدمہ شعر و شاعری'' کو بوطیقا کی طرح اہمیت حاصل ہے۔ ''حیاتِ جاوید''، ''یادگار غالب'' اور ''حیات سعدی''

اردو کی اولین سوانحی کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ مولانا حالؔی نے سرسید کے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں تبصرے لکھ کر نثر کی خدمت کی ہے۔ قومی اور نیچرل شاعر کی حیثیت سے مولانا حالؔی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کی نظموں میں نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری کا تسلسل اور وسعت دکھائی دیتی ہے۔ حالؔی کی شاعری کے موضوعات جداگانہ ہیں۔ انہوں نے غزل گوئی بھی کی ہے اور غزل گو شاعر کی حیثیت سے بھی نام کمایا ہے لیکن اردو میں جدید نظم گوئی کا آغاز حالی کی شاعری سے ہوتا ہے۔ ان کی نظموں میں فکر و فلسفہ کی گہرائی نہیں بلکہ جذبات و احساسات کی فراوانی دکھائی دیتی ہے۔

22.2 سوانحی حالات

خواجہ الطاف حسین حالؔی کا خاندان ہرات سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے جداعلیٰ خواجہ ملک علی خاندان غلاماں کے دور میں ہرات سے ہندوستان پہنچے۔ خواجہ ملک علی ایک عالم و فاضل انسان تھے ان کی پندرہویں پشت میں خواجہ ایزد بخش پیدا ہوئے جنہوں نے آبائی جاگیر پر زندگی بسر کی۔ خواجہ الطاف حسین حالؔی ان ہی کے صاحبزادے تھے' وہ پانی پت کے ایک گاؤں سونی پت میں 1837ء میں پیدا ہوئے۔ خواجہ ایزد بخش نے اپنے بیٹے کی تعلیم کا معقول انتظام کیا۔ پانچ سال کی عمر میں مولانا حالؔی کی مذہبی تعلیم شروع ہوئی۔ ابتدائی عمر میں قرآن شریف حفظ کرلیا۔ اس کے بعد عربی' فارسی اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ کی طرف توجہ دی۔ وہ نو سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ مولانا حالی کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے ان کی پرورش کی۔ معاشی حالات کی خرابی کی وجہ سے خواجہ الطاف حسین حالؔی اسکول کی باضابطہ تعلیم حاصل نہ کرسکے۔ کم عمری میں شادی کرنے کا رواج اس زمانے میں عام تھا۔ مولانا حالی علم حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن خاندان کے بزرگوں نے 17 برس کی عمر میں مولانا حالی کی شادی کردی جس کے لیے حالی تیار نہیں تھے۔ چنانچہ ایک دن چپ سے رات کے وقت گھر سے نکلے اور پانی پت سے 55 میل کا فاصلہ طے کرکے پیدل 1854ء میں دہلی پہنچے۔ جہاں انہیں تعلیم جاری رکھنے اور شعری ذوق کو پروان چڑھانے کا موقع ملا۔ جامع مسجد کے قریب مدرسہ میں شریک ہوگئے۔ وہ جس وقت دہلی پہنچے۔ اس وقت دلی کے شاعرانہ ماحول میں شیفتہ اور غالبؔ کی شاعری کی دھوم تھی۔ حالی نے ابتدا میں مصطفیٰ خاں شیفتہ اور بعد میں مرزا غالب سے تلمذ حاصل کیا ایک سال بعد گھر والوں کے اصرار پر دہلی چھوڑ کر پانی پت چلے گئے اور 1856ء میں شہر حصار میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں معمولی سی تنخواہ پر ملازم ہوگئے۔ چار سال لاہور میں قیام کیا پھر دہلی آئے۔ اینگلو عربک اسکول کے استاد مقرر ہوئے۔ سرسید کے مشورے پر 1879ء میں ''مسدس حالی'' لکھی۔ علی گڑھ کالج کی امداد کے لیے خوب کام کیا۔ 1826ء سے 1855ء تک دہلی ہی میں رہے 1863ء میں جہانگیر آباد میں معلم مقرر ہوئے۔ نثر اور شاعری سے دلچسپی نے حالی سے وہ کام لیا جس کی مثال اردو ادب میں ملنی مشکل ہے۔ سرسید کی سفارش پر 1878ء میں حیدرآباد کا سفر کیا۔ یہاں کی حکومت سے انھیں پچھتر روپے ماہوار مقرر کیا اور 1891ء میں یہ وظیفہ سو روپے کردیا گیا۔ 1905ء میں حیدرآباد کے آصف سادس نواب میر محبوب علی خاں کی سلور جوبلی کے موقع پر وہ موجود تھے۔ یہاں سے پانی پت گئے پانی پت میں ہی 1914ء میں انتقال کیا۔

22.2.1 حالؔی کی شعر گوئی سے دلچسپی

مولانا حالی کا بچپن پریشان حالی میں گزرا چنانچہ ان کی باضابطہ تعلیم نہ ہوسکی' لیکن شادی کے بعد دہلی پہنچے۔ کئی ملازمتیں کیں' نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے تو ان کے شعری ذوق کو جلا ملی وہیں۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے کلام پر اصلاح لینی شروع کی۔ شیفتہ کے وزن پر اپنا تخلص خستہ رکھا لیکن غالب کے تلامذہ میں شامل ہونے کے بعد اپنا تخلص حالؔی اختیار کیا۔ حالؔی کی ابتدائی شاعری روایتی انداز کی رہی ابتدا میں غزل ہی کہتے رہے۔ جب سرسید احمد خان سے ملاقات ہوئی تو حالؔی کے شعری رویے میں تبدیلی آئی۔ اب انھوں نے روایتی غزل گوئی کے بجائے نظم نگاری کی طرف توجہ کی سرسید ہی کے مشورے پر 1879ء میں انھوں نے ''مسدس'' لکھی۔ مسدس میں حالی کی شعر گوئی میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انجمن پنجاب سے وابستہ ہوئے تو کرنل ہالرائیڈ کے مشورے سے نظموں اور قومی و وطنی شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ انجمن پنجاب کے نظمیہ مشاعروں میں حالؔی نے نئے انداز کی نظمیں پیش کیں۔ اس سے پہلے وہ منفرد لیکن روایتی طرز میں غزل کہتے تھے۔ ان نظموں نے توقع سے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. حالی کس سنہ میں پیدا ہوئے؟

2. مسدس حالی کس سنہ میں شائع ہوئی؟
3. کس کے مشورے پر حالی نے قومی اور وطنی شاعری شروع کی؟

22.3 حالی بہ حیثیت غزل گو

حالی نے بہ حیثیت نظم نگار ہی نام کمایا لیکن ان کے سرمایہ غزل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حالی کی غزلیں روایتی موضوعات سے قریب تر ہوتے ہوئے بھی توازن اور اعتدال کی کیفیت رکھتی ہیں۔ ان کے یہاں غزلوں میں جذباتی وفور اور شدت احساس کی کمی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی آواز اور لہجے میں دھیما پن ہے۔ خود فراموشی اور وارفتگی جو تغزل کا سرمایہ ہے ان کے یہاں کم ملتا ہے۔

غزل کا بنیادی موضوع واردات عشق ہے۔ حالی فطرتاً نیک صفت انسان ہیں۔ ان کے یہاں اخلاقی اقدار کی بڑی اہمیت ہے جسے وہ اپنی غزلوں میں بھی برتتے ہیں۔ اخلاقی اقدار کی مضبوط گرفت غزل گو حالی پر اپنی قدغن لگائے رکھتی ہے۔ انہیں خود بھی اس کا احساس رہا۔ چنانچہ کہتے ہیں:

ایک عالم سے وفا کی تو نے اے حالی! مگر
نفس پر اپنے سدا ظلم و جفا کرتا رہا

حالی نے غزل میں تغزل یا وارداتِ عشق سے کام لیا تو وہ ایک روایتی غزل گو کی طرح ہمارے سامنے آتے ہیں۔ کسی نئی جہت اور تازگی کا احساس نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے:

تھا رفت جاں اس کا انداز کمالِ دوری
ہم بچ کے کہاں جاتے گریزِ خطا ہوتا

.....

آؤ ہٹا بھی دو خلشِ آرزوئے قتل
کیا اعتبار زندگیِ مستعار کا

.....

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

حالی غزل میں مبالغہ سے بچتے ہیں، دلی واردات اور کیفیات کا ایک لذت انگیز احساس دلاتے ہیں۔

غزل میں حالی کی ایک بڑی خصوصیت لہجے کا ٹھہراؤ اور نرمی ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں نہایت احتیاط سے کام لیتے ہیں پھر ان الفاظ کی ترتیب سے جذبے اور احساس کی شدت کا اظہار کرتے ہیں:

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
بے قراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

حالی نے اپنی نظموں کے ذریعہ نیچرل شاعری کو فروغ دیا۔ یہی فطرت پسندی ان کی شاعری کا بنیادی عنصر ہے۔ حالی نے اپنی غزلوں میں بھی نیچرل فضا کو ملحوظ رکھا ہے۔ غزلوں میں غیر رسمی اور بے تکلف اندازِ بیاں سے نیچرل فضا پیدا کی ہے۔ مثلاً

پرائی ہے رندوں میں بھی شیخ لیکن
کہاں یہ بُرائی کہاں وہ بُرائی

تقاضائے محبت ہے وگرنہ
مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو

حالی کے حالات زندگی کچھ ایسی رہے کہ وہ زندگی کی لذتوں اور راحتوں سے بھرپور استفادہ نہ کر سکے۔ ان کی قسمت میں زندگی کے ایک بڑے حصے میں کلفت ہی رہی۔ وہ ہمیشہ مآل اندیشی میں کھوئے رہے۔ وہی گومگو کی کیفیت ان کی غزل میں نمایاں نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں:

دور ہو اے دل مآل اندیش
کھو دیا عمر کا مزا تو نے

.....

کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

حالی کی پوری زندگی قوم کی ہمدردی اور سماجی فلاح و بہبود بلکہ شعری و ادبی فلاح و بہبود میں گزری وہ خود بھی ایک جگہ لکھتے ہیں ''باغ جوانی کی بہار اگرچہ قابل دید تھی مگر دنیا کے مکروہات سے دم لینے کی فرصت نہ ملی۔ نہ خود آرائی کا خیال آیا نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی'' اسی بات کو وہ شعر میں کہتے ہیں:

بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو — وہ حرفِ تمنا ہوا چاہتا ہے
نہ ملا کوئی غارتِ ایماں — رہ گئی شرم پارسائی کی
دلِ بے درد سے کچھ کام لوں گا — اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

حالی ایک اچھے غزل گو ضرور تھے مگر ان کی نظم نگاری نے ان کی غزل گوئی کی خوبیوں پر پردے ڈال دیے۔

22.3.1 مثنوی نگار حالی

خواجہ الطاف حسین حالی نے صرف نیچرل شاعری کی بنیاد نہیں رکھی بلکہ شاعری کی مختلف روایتی اصناف کو جدید انداز سے استعمال کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا۔ حالی سے قبل مثنوی کو ایک اہم صنف کا درجہ حاصل تھا۔ اس سے پہلے اردو میں عشقیہ، رزمیہ، بیانیہ اور متصوفانہ مثنویاں لکھی جاتی تھیں۔ حالی نے مثنوی کے موضوعات میں تبدیلی لاتے ہوئے ایک نئے انداز یعنی مسائلی مثنوی کی بنیاد رکھی۔ ان کی مشہور مثنویاں ''حب وطن''، ''مناظرہ رحم وانصاف'' ''مناجات بیوہ'' اور ''چپ کی داد'' اس لیے مشہور ہیں کہ ان مثنویوں کے ذریعہ حالی نے اپنے عہد کے مسائل کی نمائندگی کی ہے۔

حالی نے پہلی مرتبہ ''چپ کی داد'' اور ''بیوہ کی مناجات'' جیسی مثنویوں کے ذریعہ عورت کے ایک ایسے روپ کو پیش کیا جس کی طرف اردو شاعری میں کبھی توجہ نہیں کی گئی تھی۔ حالی نے عورت کی زندگی کے ایک اہم مسئلہ یعنی ''بیوہ کے مسائل'' کو شاعری میں اجاگر کرتے ہوئے حقیقت پسندی کا ثبوت دیا۔ ان مثنویوں میں اپنے خیالات کو شکایات کی شکل میں پیش کیا۔ ان کی یہ مثنویاں زیادہ تر خواتین کے مسائل کو پیش کرتی ہیں۔ مثلاً ''چپ کی داد'' میں وہ عورتوں میں ایک خود اعتمادی پیدا کرتے ہیں وہ کہتے ہیں:

اے ماؤ بہنو بیٹیو! دنیا کی عزت تم سے ہے — ملکوں کی بستی ہو تم ہی، قوموں کی عزت تم سے ہے
تم گھر کی ہو شہزادیاں، شہروں کی ہو آبادیاں — غم گیں دلوں کی شادیاں، دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے

مثنوی ''حب وطن'' میں جیسا کہ اس وقت کا تقاضہ تھا، وطن سے محبت کے جذبہ کو ابھارا گیا۔ نظم نگار شاعروں کے قافلے میں منفرد مثنوی نگار شاعر کی حیثیت سے مولانا حالی کا مقام کافی بلند ہے۔ انہوں نے نظم ہی نہیں بلکہ اردو مثنوی کو بھی جدید طرز اظہار اور موضوعات سے واقف کروایا ہے۔

22.3.2 حالی بہ حیثیت نظم نگار

حالی نے جدید انداز کی مثنویاں لکھنے کے علاوہ حقیقت پسند نظم نگاری اور نیچرل شاعری کی روایت کا آغاز کیا۔ ان کی حقیقت پسند نظم نگاری کا سلسلہ

اس وقت شروع ہوتا ہے جب کہ انھوں نے سرسید احمد خاں کے خیالات سے وابستگی اختیار کی اور ان سے استفادہ کے نتیجہ میں ''مسدس حالی'' تحریر کی جو اردو کی سب سے پہلی طویل نظم کا درجہ رکھتی ہے۔ مولانا حالی نے طویل نظم نگاری کے ساتھ ساتھ اردو نظم کو نیچرل شاعری سے بھی روشناس کیا۔ انجمنِ پنجاب کے مشاعروں کے ذریعہ موضوعاتی نظمیں لکھ کر مولانا حالی نے نیچرل شاعری کو فروغ دیا۔ آبِ حیات کے مصنف محمد حسین آزاد نے بھی اس دور میں موضوعاتی نظمیں لکھیں جس کے نتیجے میں فطری اور مناظر قدرت کے موضوعات کو اردو شاعری میں وقعت حاصل ہوگئی۔ مولانا حالی نے حقیقت پسندی اور فطرت پرستی کے ساتھ ساتھ نظم نگاری میں وطنی اور قومی تصورات کو بھی شامل کرنا شروع کیا۔ مولانا حالی کی وجہ سے ہی اردو نظم کے موضوعات میں تنوع پیدا ہوا۔ انہوں نے ہندوستان کے سیاسی و معاشرتی حالات، قومی اور وطنی مسائل کو بھی نظم نگاری کا موضوع بنایا۔ ان کی نظمیں ''انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی'' سے خود پتہ چلتا ہے کہ مولانا حالی کی شاعری کا موضوعاتی دائرہ وسیع ہے۔ سیاسی، سماجی اور اخلاقی مسائل ان کی شاعری کے اہم موضوعات ہیں ان کی نظموں کے اصل مخاطب ہندوستانی مسلمان ہیں جن کی حالی کے خیال میں اصلاح کی شدید ضرورت ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی قوم خصوصاً مسلمانوں میں ایسی خرابیاں جڑ پکڑ چکی ہیں جو ان کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی زوال کا سبب ہیں۔ حالی ان خامیوں اور خرابیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان اوصاف کے علاوہ مولانا حالی نے اپنی نظموں میں ہئیت کی تبدیلی پر بھی توجہ دی۔ چنانچہ ان کی شاعری میں غزل اور مثنوی کی ہئیت کی نمائندگی اور مثلث، مربع، مخمس اور مسدس کے انداز میں نظمیں لکھنے کا انداز بھی دکھائی دیتا ہے۔ نظم نگاری کے لیے حالی کا یہ پہلا تجربہ نہیں تھا بلکہ ان سے قبل نظیر اکبر آبادی نے اس طرح کے تجربے کیے تھے۔ حالی کے موضوعات اپنے پیش رو شاعروں سے الگ اور نئے تھے۔ ان کی نظمیں سادہ اور پرکار ہیں۔ وہ اپنے خیالات اور احساس کو عام فہم انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی تشبیہیں اور استعارے سادہ اور زود رس ہیں۔ ان کی نظموں میں ضرب الامثال بڑا خزانہ ہے۔ ان کی نظموں کا ایک خاص پہلو طنز سے کام لیتے ہیں۔ ان کی نظموں میں مزاح کا بھی ہلکا رنگ ہے جو ان کی چھوٹی چھوٹی نظموں میں کھل کر سامنے آتا ہے۔

22.3.3 حالی کی مرثیہ نگاری

اردو شاعری میں جب بھی مرثیے کا ذکر آتا ہے تو ہمارا خیال واقعات کربلا کی طرف ہی جاتا ہے کیونکہ حالی سے پہلے جو مرثیے لکھے گئے ان میں واقعات کربلا کو بنیاد بنایا گیا۔ مومن اور مرزا غالب کے بعد مولانا حالی وہ شاعر ہیں جنہوں نے شخصی مرثیے لکھے۔ حالی نے مرزا غالب کی وفات، ان کے بھائی کی وفات حکیم محمود کی رحلت بلکہ وکٹوریہ اور محسن الملک پر مرثیے لکھے ہیں۔ ان کے شخصی مرثیے مختلف اشخاص کی زندگی کے مرقعے ہیں۔ اپنے مرثیوں میں حالی نے ان اشخاص کے اخلاق اور بہترین اوصاف کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ ان مرثیوں کے لیے غزل کی ہئیت استعمال کی گئی ہے۔ حالی نے سب سے پہلا مرثیہ اپنے استاد غالب کا ترکیب بند میں لکھا۔ یہ مرثیہ ہئیت و مواد، زبان و بیان، خلوص و عقیدت سوز اور تاثیر میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس سے قبل ترکیب بند میں مرثیہ لکھنے کی مثال نہیں ملتی۔ مرثیہ غالب کے بعد حالی نے اردو میں کئی مرثیے لکھے۔ مرثیہ غالب کے بعد حالی نے دوسرا مرثیہ اپنے بڑے بھائی کی موت پر لکھا، جس بھائی نے انہیں اپنے بیٹے کی طرح پالا تھا ان کی موت پر حالی پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں۔ یہ مرثیہ قطعے کی شکل میں ہے۔ بھائی کی موت حالی کا ذاتی نقصان اور غم تھا اس لیے اس مرثیہ میں تاثر زیادہ ہے۔

حکیم محمود خاں پر جو مرثیہ لکھا ہے وہ مسدس کی شکل میں ہے۔ اس میں کل چھیاسی بند ہیں ابتدائی دس بندوں میں حالی نے دلی کی عظمت اور شہرت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد حکیم محمود خاں کے عادات و اطوار، فضائل اور طب میں ان کے کمالات کا ذکر کیا۔ انقلاب 1857ء میں ان کی جرات اور بہادری کا تذکرہ کیا ہے۔

1901ء میں حالی نے ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ لکھا۔ یہ مرثیہ بھی ترکیب بند ہے یہ مرثیہ چھ بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر بند میں گیارہ اشعار ہیں اس مرثیے میں بھی حالی نے اخلاقی پہلو پر زور دیا ہے۔

آخری مرثیہ نواب محسن الملک کی وفات پر 1907ء میں لکھا، اس کے کل نو شعر ہیں۔ یہ مرثیہ حقیقت نگاری اور جذبات نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ان پانچوں مرثیوں میں حالی نے متوفی کے اوصاف، اخلاق اور ان کی خدمات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ دوسروں کو اس سے نصیحت ملتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ان اشخاص کے نام بتایئے جن پر حالی نے مرثیے لکھے۔
2. حالی کی نظموں کے موضوعات کیا ہیں؟
3. حالی کی مثنویوں کے نام بتایئے۔
4. مناجاتِ بیوہ کا موضوع کیا ہے؟

22.4 حالی کے نثری کارنامے

مولانا حالی کی نثر نگاری تاریخی اعتبار سے ان کی نظم نگاری پر سبقت رکھتی ہے۔ مولانا حالی کی ابتدائی تصانیف زیادہ تر مذہبی ہیں۔ سب سے پہلی تصنیف انہوں نے عربی میں ''عربی کا رسالہ'' لکھی۔ دوسری کتاب مولود شریف ہے۔ یہ مولود حالی کی زندگی میں شائع نہ ہوسکا اس کے انتقال کے بعد 1933ء میں شائع ہوا۔ عبارت مقفیٰ مسجع اور دلکش ہے۔ ان کی تیسری تصنیف ''ترقاقِ مسموم'' ہے جو 1868ء لکھی گئی۔ یہ کتاب مولانا حالی کے ایک ہم وطن پادری عمادالدین کی کتاب ''ہدایت المسلمین'' کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اس کے بعد تاریخ محمدی، شواہد الالہام اور تذکرہ رحمانیہ لکھی۔ یہ تینوں کتابیں بھی مذہبی ہیں۔ ''طبقات الارض'' فرانسیسی میں لکھی ایک کتاب کا عربی سے اردو میں ترجمہ ہے۔

حالی کی سب سے پہلی نثری تصنیف جو اردو میں ملتی ہے وہ مجالس النسا ہے' یہ 1874ء میں لکھی گئی۔ یہ کتاب دو حصوں میں لکھی گئی ہے۔ یہ ناول کی ابتدائی شکل ہے۔ دلچسپ و مفید ہونے کے علاوہ آسان بھی ہے۔ عرصے تک پنجاب اور یوپی کے نصاب میں داخل بھی رہی۔ اس کتاب پر حالی کو حکومت کی طرف سے چار سو روپے انعام ملا تھا۔

حیاتِ سعدی۔ شیخ سعدی شیرازی کی مکمل و مبسوط سوانح ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں سعدی کے حالات تحقیق کے ساتھ لکھے ہیں اور دوسرے حصے میں کلام پر تبصرہ ہے۔ حیاتِ سعدی کی اہمیت یہ ہے کہ یہ اردو کی پہلی کتاب ہے جو سیرت نگاری پر لکھی گئی ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری۔ یہ مقدمہ دیوان حالی کے ساتھ پہلی مرتبہ 1893ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ کتاب بھی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں شعر کی تعریف اور اس کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ شاعری کے اثرات اچھے اور بُرے دونوں کا ذکر ہے۔ دوسرا حصہ اردو شاعری اور شاعروں پر مشتمل ہے۔ یہ مقدمہ اردو تنقید کی تاریخ میں ایک مستقل تصنیف کی اہمیت رکھتا ہے۔ اردو تنقید پر یہی سب سے پہلی کتاب ہے۔

یادگار غالب۔ مرزا غالب کی حیات و شاعری پر لکھی ہوئی سب سے پہلی کتاب ہے۔ یادگارِ غالب نے مرزا غالب کو زندہ جاوید بنا دیا۔ اس کتاب کے بھی دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں غالب کے حالاتِ زندگی ہیں۔ دوسرے حصے میں اردو اور فارسی کلام پر تبصرہ اور مشکل اشعار کے معنی و مطالب ہیں۔ آخر میں مختصر سا انتخابِ کلام بھی شامل ہے۔ یہ کتاب 1897ء میں شائع ہوئی ہے۔

حیاتِ جاوید۔ اس کتاب میں حالی نے سرسید کے حالات کافی تحقیق و تلاش سے جمع کیے ہیں۔ یہ کتاب حالی نے چھ برس میں مکمل کی۔ تقریباً ایک ہزار صفحات کی یہ کتاب 1898ء میں چھپنا شروع ہوئی تو مارچ 1901ء میں طباعت مکمل ہوسکی۔ اردو میں سوانح نگاری کی یہ پہلی کتاب ہے۔ ان کتابوں کے بعد مضامین حالی' مقالات حالی اور مکتوبات حالی کا ذکر آتا ہے۔ مضامین حالی 1902ء میں شائع ہوئی باقی دونوں کتابیں حالی کے انتقال کے بہت بعد شائع ہوئیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. مقدمہ شعر و شاعری کس سنہ میں شائع ہوئی؟
2. مقدمہ شعر و شاعری کی اہمیت کیا ہے؟
3. حیاتِ جاوید کا موضوع کیا ہے؟

22.5 حالؔی کی نظم نگاری کی خصوصیات

حالؔی نے اپنے دور میں دو مختلف کیفیتوں کو محسوس کیا۔ غدر سے پہلے اور غدر کے بعد کے حالات نے حالی کی شاعری میں بہت بڑا تغیر پیدا کیا۔ بلاشبہ اردو میں قومی اور وطنی شاعری کی روایت کا آغاز حالؔی کی نظم گوئی سے ہوتا ہے۔ ان کا سب سے بڑا شعری کارنامہ ہے کہ انہوں نے ''مسدس حالی' لکھ کر قومی شعور بیدار کیا۔ پھر اس کے بعد ان کی مثنوی ''حب وطن'' کی وجہ سے اردو شاعری میں وطنی نظموں کا آغاز ہوا۔ مثنوی کی صنف کو حالؔی نے حالات حاضرہ سے وابستہ کیا اور شخصی مرثیے کے ذریعہ اردو مرثیہ نگاری میں ایک بہت بڑا تغیر پیدا کیا۔ حالؔی کی نظم نگاری کی امتیازی خصوصیات ان کے الفاظ کی بندش' خیالات کی پیش کشی' اظہار کی تازگی اور زبان کا برجستہ اور برمحل استعمال ہے۔ اس قسم کا انداز نظمیہ شاعری میں سب سے پہلے مولانا حالؔی نے شروع کیا۔ ورنہ مولانا حالؔی سے قبل تک ہی نہیں بلکہ حالؔی کے بعد بھی اردو شاعری مبالغہ اور غیر حقیقی واقعات سے معمور تھی۔ حالؔی کے بعد ہی اردو شاعری کو حقیقت پسندی سے وابستہ کرتے ہوئے نظم کو زندگی کے حقائق کے اظہار کا سلیقہ دیا گیا۔ چنانچہ حالؔی کے دور سے ہی نظمیہ شاعری کی اس روایت کا آغاز ہوا جسے حقیقت پسندی اور مسائلی شاعری کا نام دیا جاتا ہے۔ حالؔی نے نظم کی شاعری کو گلے شکوے سے پاک کر کے فطری جذبات اور احساسات کی پیش کشی کے لیے سازگار ماحول پیدا کیا۔ اس لیے نظمیہ شاعری میں حالؔی کی خصوصیات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

22.5.1 حالؔی کی نظموں کی لفظیات

اگرچہ حالؔی نے اپنی ابتدائی غزلوں میں روایتی لفظیات کی پیروی کی تھی اور مرزا غالب کی طرح پیچیدہ زبان اور لفظیات استعمال کرتے رہے لیکن سرسید سے وابستگی کے بعد ان کی شاعری میں ایک بہت بڑا تغیر رونما ہوا اور انہوں نے سادہ الفاظ کو شاعری میں جگہ دینے کی کامیاب کوشش کی۔ حالؔی کے دور میں عربی اور فارسی کے لفظیات کا چلن عام تھا۔ سنسکرت' ہندی اور بھاشا کے الفاظ اگر کوئی اپنے کلام میں استعمال کر لے تو اسے بے ادبی تصور کیا جاتا تھا۔ حالؔی نے اپنی نظموں میں لاتعداد بھاشا' ہندی اور سنسکرت کے الفاظ استعمال کر کے اردو میں نہ صرف نئی لفظیات کا اضافہ کیا بلکہ آنے والی نسلوں کو دوسری زبانوں سے استفادے کے اصول بھی سکھائے۔ سرسید کی رفاقت میں حالؔی کے خیالات میں بڑی وسعت پیدا ہوئی۔ انہوں نے اردو زبان میں نہ صرف سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ شامل کیے بلکہ جہاں ممکن ہو سکے وہاں انگریزی الفاظ کے استعمال پر بھی خصوصی توجہ دی۔ تاہم انہوں نے شاعری میں انگریزی الفاظ استعمال نہیں کیے۔ ان کی نثر میں انگریزی الفاظ کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔

انہوں نے ''حیات جاوید'' میں بے شمار انگریزی لفظیات کا استعمال کیا۔ البتہ ان کی نظموں میں بھی ہندی کے سادہ اور عام فہم الفاظ کی کثرت دکھائی دیتی ہے۔ مولانا حالی کی اس روش پر لکھنو والوں نے اعتراض بھی کیا لیکن مولانا حالی نے اس اعتراض کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

22.5.2 حالؔی کی نظموں میں ارتقائی عمل

کسی ایک خیال کو پیش نظر رکھ کر اس کے تحت مختلف بند تحریر کرنا جس میں خیال کا ربط و تسلسل برقرار رہے تو ایسی شاعری کو نظم کہتے ہیں۔ حالؔی سے قبل دکنی دور کی مثنویوں میں خیال کے تسلسل کی وجہ سے نظموں کی سی کیفیت پیدا ہوتی تھی لیکن حالؔی کی شعر گوئی کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے اردو نظم کو ارتقائی صورت سے ہمکنار کر دیا۔ ان کی نظموں میں نہ صرف تازگی کا عمل دکھائی دیتا ہے بلکہ نظم کی تحریر کے دوران وہ ارتقائی عمل کے وسیلے کو بھی کام میں لاتے ہیں۔ ارتقائی عمل سے مراد نظم کا ایسا انداز ہے جس میں پہلے تمہید باندھی جاتی ہے پھر اس کے بعد موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے اسے نقطہ عروج پر پہنچا دیا جاتا ہے اور آخر میں نظم کے انجام کی صورت نکل آتی ہے۔ اس تمام کیفیت کو نظم کا ارتقائی عمل کہا جاتا ہے۔ اردو میں نظم نگاری کے دوران اس قسم کے ارتقائی عمل کو استعمال کرنے والے شاعروں میں مولانا حالؔی اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی تمام نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں ارتقائی عمل' تمہید' موضوع کا احاطہ' نقطہ عروج اور انجام سے وابستہ دکھائی دیتا ہے جو اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ مولانا حالؔی اپنی نظموں کے دوران ارتقائی عمل کو بروئے کار لاتے ہیں۔

22.5.3 حالؔی کی نظموں کے موضوعات

مولانا حالؔی کو اردو کے نیچرل شاعر کا درجہ دے کر عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ حالی نے صرف فطرت پرستی پر نظمیں لکھی ہیں۔ ایسا تصور ایک خام

خیال کی نشاندہی کرتا ہے' کیوں کہ حالؔی کی شاعری کے مختلف موضوعات ہیں۔انہوں نے قومی' ملی' معاشی' معاشرتی اور سیاسی موضوعات کو ہی اپنی شاعری کا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ سماجی ناانصافی' نابرابری اور عورت کے حقوق کی پامالی اور اخلاقی گراوٹ قوم کی تعلیمی پسماندگی پر بھی نظمیں تحریر کیں۔حالؔی ایک ایسے نظم گو شاعر ہیں جنہوں نے نظم کے موضوعات کو ایک نیا انداز دیا اور اپنی نظموں کو اپنے دور کے سماج کا عکاس بنا دیا۔یہ کیفیت سب سے پہلے حالؔی کی نظموں میں ہی دکھائی دیتی ہے۔وہ اپنی مثنویوں' نظموں' شخصی مرثیوں اور شہر آشوب کے ذریعہ قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے وطنی' ملی' سماجی اور معاشرتی مناظر کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں مظاہرۂ کائنات کے علاوہ انسان کے بنائے اصول وقوانین اور طرزِ زندگی بھی نظموں کے موضوعات میں شامل ہیں۔یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ حالؔی کی شاعری اور نظموں کے موضوعات محدود ہونے کے باوجود بھی اس دور کے تمام مظاہر کی بھرپور نشاندہی کرتے ہیں۔

22.5.4 حالؔی کی نظموں میں قدیم اور جدید کا امتزاج

اگرچہ حالؔی پابند نظم کے شاعر ہیں اور ان کے موضوعات بھی محدود ہیں مگر ان میں تازگی ہے' وقت کی پکار ہے۔عصری تقاضے اور ضروریات ہیں۔ان کی نظموں میں اکثر جگہوں پر خطیبانہ رنگ جھلک کر سامنے آجاتا ہے۔حالی کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے نظم کو بیانیہ شاعری سے قریب کر کے قدیم اور جدید کے امتزاج کی کامیاب کوشش کی۔مرثیے کی صنف واقعات کربلا کی حد تک محدود تھی اس قدیم انداز کو جدید انداز سے ہم آہنگ کرتے ہوئے حالؔی نے مرثیہ کی صنف کو شخصی مرثیوں کی جہت عطا کی۔یہ اردو شاعری کو حالی کی دین نہیں بلکہ مومن اور غالب سے شخصی مرثیوں کا آغاز ہوتا ہے۔اردو مثنوی کے موضوعات بھی اب تک بندھے ٹکے تھے۔حالی نے مثنوی کو نئے نئے موضوعات سے روشناس کروایا۔اس کے بعد مثنوی جیسی روایتی صنف حالی کے کلام میں داخل ہو کر ایک زندہ صنف کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔مولانا حالی نے نعتیہ کے علاوہ دوسرے دو ایک قصیدے بھی لکھے۔فطری طور پر انہیں قصیدے سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔مقدمہ میں تو انہوں نے قصیدے کی مذمت کی ہے۔اسلوب سخن میں بھی حالی نے غیر شعوری طور پر بڑی تبدیلیاں لائی ہیں۔انہوں نے زبان کو سلاست اور سادگی عطا کی۔صنعتوں کے استعمال اور تکلفات سے زبان کو آزاد کیا۔ہندی اور انگریزی کے وہ الفاظ جو بول چال میں شامل ہیں' بے محابہ استعمال کیے۔حالی کی شاعری میں یہ موضوعاتی اور لسانی تبدیلیاں منصوبہ بند طریقے سے در آتی ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. حالی نے مرثیے میں کس طرح کی تبدیلی پیدا کی؟
2. شخصی مرثیوں کا آغاز کن شاعروں نے کیا؟
3. حالی کی نظموں کی لفظیات کا جائزہ لیجیے۔
4. حالی کی شاعری کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟
5. حالی کی مثنویوں کا احاطہ کیجیے۔
6. حالی کی شاعری میں قدیم رنگ کی نشاندہی کیجیے۔

22.6 نظم ''برکھارت''

گرمی کی تپش بجھانے والی — سردی کا پیام لانے والی
قدرت کے عجائبات کی کان — عارف کے لیے کتابِ عرفان
وہ شاخ و درخت کی جوانی — وہ مور و ملخ کی زندگانی
وہ سارے برس کی جان' برسات — وہ کون ؟ خدا کی شان برسات
آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد — اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد
وہ آئی' تو آئی جان میں جان — سب تھے کوئی دن کے' ورنہ مہمان

گرمی سے تڑپ رہے تھے جاں دار
اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار

بھوبل سے سوا تھا ریگِ صحرا
اور کھول رہا تھا آبِ دریا

تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں
اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں

سانڈے تھے بلوں میں منھ چھپائے
اور ہانپ رہے تھے چار پائے

تھیں لومڑیاں زبان نکالے
اور لو سے ہرن ہوئے تھے کالے

چیتوں کو نہ تھی شکار کی سُدھ
ہرنوں کو نہ تھی قِطار کی سُدھ

تھے شیر پڑے کچھار میں سست
گھڑیال تھے رودبار میں سست

ڈھوروں کا ہوا تھا حال پتلا
بَیلوں نے دیا تھا ڈال کندھا

کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں
اور دودھ نہ تھا گئو کے تھن میں

گھوڑوں کا چُھٹا تھا گھاس دانہ
تھا پیاس کا اُن پہ تازیانہ

گرمی کا لگا ہوا تھا بھپکا
اور آنس نکل رہا تھا سب کا

طوفان تھے آندھیوں کے برپا
اُٹھتا تھا بگولے پر بگولا

آرے تھے بدن پہ لو کے چلتے
شعلے تھے زمین سے نکلتے

تھی آگ کا دے رہی ہوا کام
تھا آگ کا نام مفت بدنام

رستوں میں سوار اور پیدل
سب دھوپ کے ہاتھ سے تھے بے کل

گھوڑوں کے نہ آگے اٹھتے تھے پانو
ملتی تھی کہیں جو روکھ کی چھانو

تھی سب کی نگاہ سوئے افلاک
پانی کی جگہ برستی تھی خاک

پنکھے سے نکلتی جو ہوا تھی
وہ بادِ سموم سے سوا تھی

بجھتی نہ تھی آتشِ درونی
لگتی تھی ہوا سے آگ دونی

سات آٹھ بجے سے دن چھپے تک
جاں داروں پہ دھوپ کی تھی دستک

ٹٹی میں تھا دن گنواتا کوئی
تہہ خانے میں منھ چھپاتا کوئی

بازار پڑے تھے سارے سنسان
آتی تھی نظر، نہ شکلِ انسان

چلتی تھی دُکان جن کی دن رات
بیٹھے تھے وہ ہات پر دھرے ہات

خِلقت کا ہجوم اگر کچھ تھا
یا پیاؤ با سبیل پر تھا

تھا شہر میں قحطِ آدمی زاد
سلطان کا اک کنواں تھا آباد

پانی سے تھی سب کی زندگانی
میلا تھا وہیں، جہاں تھا پانی

تھیں برف پہ نیتیں لپکتی
فالودے پہ رال تھی ٹپکتی

پھل پھول کی دیکھ کر تراوٹ
پاتے تھے دل و جگر تراوٹ

کنجڑوں کی وہ بولیاں سہانی
بھر آتا تھا سن کے منھ میں پانی

تھے جو خفقانی اور مراقی
گرمی سے نہ تھا کچھ ان میں باقی

کھانے کا نہ تھا انھیں مزا کچھ
آٹھ آٹھ پہر نہ تھی غذا کچھ

بن کھائے کئی کئی دن اکثر
رہتے تھے فقط ٹھنڈائیوں پر

شب کٹتی تھی ایڑیاں رگڑتے
مر پیٹ کے، صبح تھے پکڑتے

اور صبح سے شام تک برابر
تھا العطش العطش زباں پر

بچوں کا ہوا تھا حال بے حال
کمھلائے ہوئے تھے پھول سے گال

آنکھوں میں تھا، اُن کا پیاس سے دم
تھے پانی کو دیکھ کرتے مم مم

ہر بار پُکارتے تھے ماں کو
ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زباں کو

پانی دیا گر کسی نے لاکر
پھر چھوڑتے تھے نہ منھ لگا کر

بچے ہی، نہ پیاس سے تھے مضطر
تھا حال بڑوں کا اُن سے بدتر

تخصیص تھی کُچھ نہ میری تیری
پانی سے کسی کو نہ تھی سیری

کل شام تلک تو تھے یہی طور
پر رات سے ہی سماں ہے کچھ اور

پُروا کی دُہائی پھر رہی ہے
پچھوا سے خُدائی پھر رہی ہے

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا
اک شور ہے آسماں پہ برپا

ہے ابر کی فوج آگے آگے
اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے

ہیں رنگ برنگ کے رسالے
گورے ہیں کہیں، کہیں ہیں کالے

ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی
اک آتی ہے فوج، ایک جاتی

جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے
ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے

توپوں کی ہے جب کہ باڑھ چلتی
چھاتی ہے زمین کی دہلتی

مینھ کا ہے زمین پر دریڑا
گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا

بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی
آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی

گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
جنت کی ہوائیں آرہی ہیں

کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی
قدرت ہے نظر خدا کی آتی

سورج نے نقاب لی ہے منھ پر
اور دھوپ نے تہہ کیا ہے بستر

باغوں نے کیا ہے غسل صحت
کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت

سبزہ سے ہے کوہ و دشت معمور
ہے چار طرف برس رہا نور

بَٹیا ہے، نہ ہے سڑک نمودار
اٹکل سے ہیں راہ چلتے رہوار

ہے سنگ و شجر کی ایک وردی
عالم ہے تمام لاجوردی

پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار
دولھا سے بنے ہوئے ہیں اشجار

پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل
ہے گونج رہا تمام جنگل

کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو
اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سو

کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی
گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی

مینڈک جو ہیں بولنے پہ آتے
سنسار کو سر پہ ہیں اٹھاتے

سب خوان کرم سے ہیں حق کے سیر
پانی میں مگر، کچھار میں شیر

زردار ہیں اپنے مال میں مست
قلانچ ہیں اپنی کھال میں مست

ابر آیا ہے، گھر کے آسماں پر
کلمے ہیں خوشی کے ہر زبان پر

مسجد میں ہے وردِ اہل تقویٰ
یا رَبّ لَنا وَلا علَینا

مندر میں ہے ہر کوئی یہ کہتا
کرپا ہوئی تیری میگھ راجا!

کرتے ہیں گرو، گرو گرنتھی
گاتے ہیں بجھن کبیر پنتھی

جاتا ہے کوئی ملہار گاتا
ہے دیس میں کوئی گنگناتا

بھنگی ہیں نشہ میں گاتے پھرتے
اور بانسریاں بجاتے پھرتے

سرون کوئی گارہا ہے بیٹھا
چھیڑا ہے کسی نے ہیر رانجھا

رکھشک جو بڑے ہیں جین مت کے
ڈھکنے ہیں دلوں پہ رکھتے پھرتے

کرتے ہیں وہ یوں جیون کی رکھشا
تاجل نہ اٹھے کوئی پتنگا

.....

ہیں شکر گزار تیرے برسات !
انسان سے لے کے تا جمادات

دنیا میں بہت تھی چاہ تیری
سب دیکھ رہے تھے راہ تیری

تجھ سے ہے کھلا یہ رازِ قدرت
راحت ملتی ہے بعدِ کلفت

گلشن کو دیا جمال تو نے
کھیتی کو کیا نہال تو نے

طاؤس کو ناچنا بتایا
کوئل کو الاپنا سکھایا

جب مور ہے ناچنے پہ آتا
آپے سے ہے اپنے گزرا جاتا

کوئل کو نہیں قرار اک پل
ایسی کوئی تو نے کوک دی کل

شب بھر میں ہوا سماں دِگر گوں
کیا پڑھ دیا آکے تو نے افسوں

سوئے تو اساڑھ کا عمل تھا
اٹھے تو سماں ہے ماہ کا سا

لاہور میں شب ہوئی تھی لیکن
کشمیر میں پہنچے جب ہوا دن

امرت سا ہوا میں بھر دیا کچھ
اک رات میں کچھ سے کردیا کچھ

دریا تجھ بن سسک رہے تھے
اور بن تیری راہ تک رہے تھے

دریاؤں میں تو نے ڈال دی جان
اور تجھ سے بنوں کو لگ گئی شان

جن جھیلوں میں کل تھی خاک اڑتی
ملتی نہیں آج تھاہ اُن کی

جو دانے تھے خاک میں پریشان
سب آکے چڑھائے تو نے پروان

دولت جو زمین میں تھی مخفی
آگے ترے اُس نے سب اگل دی

پڑتے تھے ڈلاؤ جس زمیں پر
واں سبزہ و گل ہیں جلوہ گستر

جن پودوں کو کل تھے ڈھور چرتے
باتیں ہیں وہ آسماں سے کرتے

جن باغوں میں اڑتے تھے بگولے
واں سینکڑوں اب پڑے ہیں جھولے

تھے ریت کے جس زمیں پر انبار
ہے بیر بہوٹیوں سے گلنار

.....

کھم باغوں میں جا بہ جا گرے ہیں
جھولے ہیں کہ سو' بہ سو' پڑے ہیں

کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن
جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن

ہیں پھول رہی خوشی سے ساری
اور جھول رہی ہیں باری باری

جب گیت ہیں ساری مل کے گاتی
جنگل کو ہیں سر پہ وہ اٹھاتی

اک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے
اک گرنے سے خوف کھا رہی ہے

ہے ان میں کوئی ملہار گاتی
اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی

گاتی ہے کوئی ' کبھی ہنڈولا
کہتی ہے کوئی بدیسی ڈھولا

اک جھولے سے وہ گری ہے جا کر
سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر

ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں
تیراکوں کے دل بڑھے ہوئے ہیں

گھڑناؤ پہ ہے سوار کوئی
اور تیر کے پہنچا پار کوئی

بگلوں کی ہیں ڈاریں آ کے گرتی
مرغابیاں تیرتی ہیں پھرتی

چکلے ہیں یہ پاٹ ندیوں کے
دن بھر میں ہیں بیڑے جا کے لگتے

زوروں پہ چڑھا ہوا ہے پانی
موجوں کی ہیں صورتیں ڈراونی

ناویں ہیں کہ ڈگمگا رہی ہیں
موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں

ملاحوں کے اڑ رہے ہیں اوسان
بیڑے کا خدا ہی ہے نگہبان

منجدھار کی رو زور پر ہے
مچھلی کو بھی جان کا خطر ہے

.....

بیزار اک اپنے جان و تن سے
بچھڑا ہوا صحبتِ وطن سے

غربت کے صعوبتوں کا مارا
چلنے کا نہیں ہے جس کو یارا

غم خوار ہے کوئی اور نہ دل جو
اک باغ میں ہے پڑا لپ جو

ہیں دھیان میں کلفتیں سفر کی
آپ کی خبر ہے اور نہ گھر کی

ابر اتنے میں اک طرف سے اُٹھا
اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا

برق آ کے لگی تڑپنے پیہم
اور پڑنے لگی پھوار کم کم

آنے جو لگے ہوا کے جھونکے
تھے جتنے سفر کے رنج بھولے

سامان ملے جو دل لگی کے
یاد آئے مزے کبھی کبھی کے

دیکھے کوئی اُس گھڑی کا عالم
وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم

وہ آپ ہی آپ گنگنانا
اور جوش میں آ کبھی یہ گانا

اے چشمۂ آبِ زندگانی
گھٹیو نہ کبھی تری روانی

جاتی ہے جدھر تری سواری
بستی ہے اُسی طرف ہماری

پائے جو کہیں مری سبھا کو
دیتا ہوں میں بیچ میں خدا کو

اول کہیو ! سلام میرا
پھر دیجیو یہ پیام میرا

قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا
فرقت میں تمھاری آئی برکھا

آتا ہے تمھارا دھیان جس دم
مرغابیاں تیرتی ہیں باہم

ہم تم یوں ہی صبح و شام اکثر
تالاب میں تیرتے تھے جا کر

جب سبزہ و گل ہیں لہلہاتے
صحبت کے مزے ہیں یاد آتے

ہم تم یوں ہی ہاتھ میں دیے ہات
پھرتے تھے ہوائیں کھاتے دن رات

جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا
میں تم کو اِدھر اُدھر ہوں تکتا

آخر نہیں پاتا جب کسی کو
دیتا ہوں دُعائیں بے کسی کو

رُت آم کی آئے اور نہ ہوں یار
جی اپنا ہے ایسی رُت سے بیزار

تم بن جو ہے بوند تن پہ پڑتی
چنگاری سی ہے بدن پر پڑتی

ہے سرد ہوا بدن کو لگتی
پر ، جی میں ہے آگ سی سلگتی

پردیس میں، سچ ہے، کیا ہو جی شاد؟ جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد
نشتر کی طرح تھی دل میں چبھتی فریاد یہ دردناک اس کی
تھا سوز میں کچھ ملا ہوا ساز پکڑا دل، سن اس کی آواز
حیرت رہی دیر تک کہ آخر روڑا ہے کہاں کا یہ مسافر؟
پھر غور سے اک نظر جو ڈالی
نکلا وہ ہمارا دوست حالی

22.6.1 برکھارت کا تجزیہ

حالی نے لاہور کے مشاعرے کے لیے چار مثنویاں لکھیں۔ یہ مثنویاں کافی مقبول اور مشہور ہوئیں۔ ان میں پہلی مثنوی 'برکھارت' ہے۔ اس مثنوی میں 145 اشعار ہیں اس مثنوی میں انہوں نے تمہید باندھنے کے بعد برسات کی مختلف کیفیتوں اور رسموں کا ذکر کیا ہے۔ اس موسم سے ہندوستانیوں کی بہت سی مذہبی، نیم مذہبی اور سماجی روایات جڑی ہوئی ہیں۔ برسات سے پہلے گرمی کی شدت کی وجہ سے جانور پریشان ہیں۔ زمین و آسمان تپنے لگے ہیں جمادات و نباتات سب پژمردہ ہیں۔ حالی نے گرمی کے ان اثرات کا اچھا نقشہ کھینچا ہے اور ایک ایک کیفیت کا بیان بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ گرمی کے بعد برسات آتی ہے اور جب برسات کا ڈنکا بجا تو سبزہ لہلہا اٹھا۔ ساری فضا مست و سرشار ہوگئی۔ برسات کی خوشی میں جانوروں کی مستی و بے خودی سرسبزی و شادابی، انسانی جذبات میں شدت، پردیسیوں کو وطن کی یاد، وطن والوں کی خوشیاں، کسانوں کی مسرت، لڑکیوں کا جھولا جھولنا، حالی نے ان سب باتوں کو بڑے والہانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ کہیں بھی صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ روزمرہ کے معاملات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انہیں منظر نگاری اور واقعہ نگاری میں کمال حاصل تھا۔ حالی اس وقت لاہور میں تھے اور انہیں وطن کی یاد ستا رہی تھی۔ پیاس سے جوان کا حال تھا اس کا نقشہ بڑا پر اثر کھینچا ہے۔ کہتے ہیں:

بچوں کا ہوا تھا حال بے حال کمھلائے ہوئے تھے پھول سے گال
آنکھوں میں تھا ان کا پیاس سے دم تھے پانی کو دیکھ کرتے مم مم
ہر بار پکارتے تھے ماں کو ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زباں کو
پانی دیا گر کسی نے لاکر پھر چھوڑتے تھے نہ منہ لگا کر

اس کے بعد گھن گھور گھٹاؤں کی آمد اور مژدۂ برسات کی تصویر کشی کی ہے۔ اس مثنوی کے چار حصے ہیں ہر حصہ ایک ایک کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ آخری حصے میں ایک غریب الوطن کو وطن کی یاد آتی ہے۔ بارش کی مستیاں دوست اور وغیرہ یاد آتے ہیں:

غم خوار ہے اور نہ کوئی دلجو اک باغ میں ہے پڑا لب جو
ابر اتنے میں اک طرف سے اٹھا اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا
ساماں کیے جو دل لگی کے یاد آئے مزے کبھی کبھی کے

اس وقت وہ کالی داس کے میگھ دوت کی طرح ابر کو اپنا پیامبر بنا کر کہتے ہیں:

اول کہیو سلام میرا پھر دیجیو پیام میرا
قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا فرقت میں تمھاری آئی برکھا
پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد جب جی میں بھری ہو آپس کی یاد

دیس کی یاد بڑے دردناک انداز میں بیان کی ہے۔ نظم کے آخری بند میں مولانا حالی نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ غریب الوطن اور مصیبت

زدہ لوگ جان وتن سے بیزار تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے انہیں گنگنانے پر مجبور کردیا۔ بارش کے ایک ایک قطرے نے زندگانی کی چہل پہل میں اضافہ کردیا اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے مولانا حالی لکھتے ہیں کہ انسان کی قسمت کا لکھا۔ 'برکھارت' کی شکل میں ظاہر ہوا اور جسم کو سردی کا جھونکا لگنے کے ساتھ ہی تمام مصیبتیں دور ہوگئیں۔ جو مسائل دل میں نشتر کی طرح چبھتے تھے بارش کے آنے کے بعد وہ سب سرد پڑ گئے اور بدن کی آگ کو ایک بوند نے ہمیشہ کے لیے ختم کردیا۔ اس طرح حالی نے نظم ''برکھارت'' میں سادہ عام الفاظ کا استعمال کر کے مثنوی کو رواں دواں بنادیا ہے۔ ان کی نظم میں فارسی اور عربی کے الفاظ کم اور ہندی مقامی الفاظ کی کثرت دکھائی دیتی ہے جو موالانا حالی کے عام زبان کو فروغ دینے کے جذبے کی دلیل ہے۔ اس نظم میں حالی نے برسات اور تعلقات برسات سے متعلق الفاظ کا ایک ذخیرہ سمو دیا ہے۔ جانوروں کا ذکر آتا ہے تو ہرن' سانپ' لومڑی' چیتا' شیر' سانڈ اور بے شمار جانوروں کا ذکر کیا ہے۔ جب گرمی کا بیان ہو تو گرمی کے متعلقات جیسے لو' آگ' شعلہ' آندھی' طوفان' بگولہ اور اس کے ساتھ بادِ سموم' پنکھے اور دھوپ کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ گرما کے ذکر کے بعد جب بارش کا سماں باندھتے ہیں تو پروائی' گھٹا' سبزہ' شجر' پھول اور جل تھل کا ذکر کر کے بارش کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ بارش کے بعد ندی' نالوں کی کیفیت اور اس موسم میں پیدا ہونے والے کیڑوں کا ذکر کرتے ہیں۔ عوام میں جب بارش کا استقبال ہوتا ہے تو مختلف طبقات کی مصروفیات بیان کرتے ہیں۔ باغوں میں جھولے' ملہار' ہنڈولے' تیراکی' بگلوں کی قطاریں' مرغابیوں کی تیراکی' ہندی کے پاٹ' موجوں کی روانی' ناؤ کا ڈگمگانا' ملاحوں کی نگہبانی اور مچھلیوں کے منجدھار سے مقابلے کو پیش کر کے مولانا حالی نے نظم برکھارت کے منظر کو دوبالا کردیا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. برکھارت میں کتنے اشعار ہیں؟
2. اس مثنوی کو شاعر نے کتنے حصوں میں تقسیم کیا ہے؟

22.7 مرثیۂ دلی

صحبتیں اگلی مصور ! ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دل چسپ مُرقع نہ دکھانا ہرگز

موج زن دل میں ہیں یا خون کے دریائے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چُرانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح !
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشان بھی اب تو
اے فلک ! اس سے زیادہ نہ ستانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں، ہم بھی انھیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانا ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز

ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ !
ہم پہ غیروں کو تو ظالم ! نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہے
ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

آخری دور میں بھی تجھ سے قسم ہے ساقی !
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں !
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عیش و نشاط
نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر ! گھر تھا تمہارا دلّی
ہم کو بھولے ہو، تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مر چکی، اب زندہ نہ ہوگی یارو!
یاد کر کر کے اُسے بھول نہ جانا ہرگز

غالبؔ، شیفتہؔ، و نیرؔ، و آزردہؔ، و ذوقؔ
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومنؔ و علویؔ و صہبائیؔ و ممنونؔ کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں — نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر — اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانا ہرگز
بزمِ ماتم تو نہیں ، بزم سخن ہے حالی !
ہاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز

22.7.1 مرثیۂ دلی۔ایک تجزیہ

بیں شعر کی اس نظم میں 1857ء کے بعد دلی کی تباہی کا حاصل پیش کیا گیا ہے۔حالی کا وطن پانی پت ضرور تھا لیکن ان کے ذہنی ارتقا' ادبی شعور کی پختگی اور کردار سازی میں سب سے زیادہ اہمیت دلی کو حاصل رہی۔شیفتہ کی ملاقات سے پہلے وہ دلی میں تقریباً تین سال رہے۔اس زمانے میں ان کی تخلیقی قوتوں کی نشوونما ہوئی۔دلی میں قیام کے اس دور نے ان کی سخن فہمی و سخن سنجی کو وہ شعور بخشا کہ ادب میں کئی جہات سے ان کی اہمیت بڑھ گئی دلی کے قیام کا زمانہ حالی کی قابلیتوں کو اجاگر کرنے کا زمانہ تھا۔ان کی شاعری جب معراج کمال کو پہنچی یہیں انہوں نے نثر کے بہترین کارنامے انجام دیے۔ایک طرح سے دلی ان کا وطن ثانی بن گیا۔ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ چاہتے تھے کہ تو دلی میں رہ جائیں اور تصنیف و تالیف کے کام کو آگے بڑھائیں لیکن دلی کی علمی فضا کو پہلے 1857ء کے حالات کی وجہ سے عظیم نقصان ہوا'اس کے بعد اقتصادی بدحالی نے اسے اور برباد کردیا۔حالی مرثیہ دلی لکھ کر دلی سے وابستہ اپنی یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔پہلے دوشعر میں وہ کہتے ہیں کہ اے مصورا! ہمیں اگلی صحبتوں کے تصور نہ دکھانا' پہلے ہی سے ہم بھرے بیٹھے ہیں' دل میں خون کے دریا موجزن ہیں اور آنکھوں میں اشکوں کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔اب یہاں کوئی سیاح آئے گا بھی تو اسے کیا ملے گا اس شہر دلی کے کھنڈروں میں گوہر یکتا دفن ہیں۔یہ ان عظیم ہستیوں کا قبرستان ہے۔گویا یہ علم وفضل اور اہل علم وہنر کا مدفن نہیں بلکہ یہ علم کا خزانہ دفن ہے۔دلی ایسی اجڑی کہ اب یہاں ہمیں پہچاننے والا کوئی نہیں رہا۔یہاں اب کوئی گھرانہ نہیں رہا جسے حادثات زمانہ نے چھوا نہ ہو۔اس کے بعد حالی آسمان کا گلہ کرتے ہیں کہ تو نے ہمیں رلا تو دیا مگر ہماری بدحالی پر غیروں کو ہنسنے کا موقع نہ دے۔بھولے بسرے کسی کے چہرے پر اگر مسکراہٹ آبھی جائے تو یہ نہ سمجھنا کہ وہ خوش ہیں۔اب ان کے یہاں رونے کے لیے آنسو ہی نہیں'اب وہ نہیں روتے ان کی بدحالی اور بے بسی پر زمانہ رورہا ہے۔ایک زمانہ تھا کہ مسلمانوں نے ہندوستان پر حکومت کی تھی دلی ان کا پایہ تخت تھا۔کیسا عیش ونشاط کا عالم تھا۔اب اس دور میں عیش ونشاط کا ٹھکانہ کہاں؟ دلی کبھی علم وہنر کا گھر تھا مگر اب علم وہنر نے دلی والوں کو بھلا دیا ہے۔کیسے کیسے شاعر اس سرزمین پر پیدا ہوئے۔دلی اجڑی اور آہستہ آہستہ ان نامور شاعروں پر بساط زندگی الٹ گئی۔رفتہ رفتہ سارے ہم صفیر ایک ایک کر کے رخصت ہوئے ان میں حالی کے اساتذہ بھی ہیں اور ہم عصر شاعر بھی۔کہتے ہیں:

غالب ، شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق — اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد — شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

یہ شاعر کیسے کیسے یگانۂ زمانہ تھے۔ان یگانہ و یکتا شاعروں نے مرکر(یہاں عجز سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں) ہم جیسے شاعروں کو یگانہ بنادیا ہے۔ان کی موجودگی میں ہم میں کوئی یگانہ نہ یکتا اور نہ ان کے پائے کا تھا۔اب داغ اور مجروح باقی رہ گئے ہیں'اے زمانے والو! انہیں سن لو یہ شاعری کے بلبل ہیں پھر چمن سخن میں بلبل کے ایسے ترانے سننے کو نہ ملیں گے۔

حالی کی یہ نظم مرثیہ کا ایک نیا انداز ہے جو غزل کے فارم میں لکھی گئی ہے۔یہ مرحوم دلی کی بدحالی اور تباہی کا مرثیہ ہے۔یہ مرثیہ شہر دلی کا شہر آشوب ہے۔شہر آشوب میں تہذیبی' تاریخی' سیاسی' معاشی بدحالی کے علاوہ اخلاقی پستی پر شعر لکھے جاتے ہیں یہاں حالی نے ان تمام موضوعات پر بڑے اچھوتے انداز میں روشنی ڈالی ہے۔اس میں دلی کی سیاسی بدحالی' علمی وادبی فضا کا تکدر' معاشی وسماجی پستی سب کی طرف اشارے کیے ہیں۔دلی کی شاعری کی تباہی اس مرثیے کا خاص موضوع ہے۔

حالی کا یہ مرثیہ ان کی حکیمانہ بصیرت اور ملی درد کی نشاندہی کرتا ہے۔انہوں نے بلند خیالی' مضمون آفرینی یا نادر تشبیہات واستعاروں سے کام لینے کے بجائے سادگی اور تاثر پر زور دیا ہے۔بندشِ الفاظ اور تراکیب پر زور دینے کے بجائے عام بول چال سے لہجے کو قریب رکھا ہے۔کہیں کہیں اشاریت سے کام لیا ہے مثلاً:

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہِ خاک　　دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانا ہرگز
بخت سوے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں　　نہ ابھی نیند کے ساتوں کو جگانا ہرگز

یہ مرثیہ انہوں نے غالباً کسی مشاعرے میں پڑھا تھا اس لیے وہ کہتے ہیں:

بزم ماتم تو نہیں ' بزمِ سخن ہے حالی　　ہاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

جس انداز میں انہوں نے دلی کا حال کھینچا ہے اس میں دردوغم' محرومی وکوفت کی کیفیت واضح اور پراثر ہے۔اس میں حالتِ زمانہ پر طنز کا لطیف احساس بھی ہوتا ہے مثلاً شاعر کا یہ کہنا:

یار خود روئیں گے کیا ' ان پہ جہاں روتا ہے　　ان کی ہستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

حالی کی طبیعت میں ایک ٹھہراؤ تھا۔وہ شدید سے شدید مصیبت کو بھی انگیز کر جاتے تھے یہی توازن ان کے اس مرثیے میں بھی ملتا ہے۔ یہاں شاعری کی آواز اور لہجہ پرسوز ہونے کے بجائے درد کی ایک زیریں لہر کام کرتی نظر آتی ہے۔شعر کی نحوی ساخت اور لفظوں کے مناسب انتخاب سے مرثیہ کے میدان میں نئی امکانات کی نشاندہی کی ہے۔اس مرثیے سے اردو میں ہیئت اور اسلوب دونوں لحاظ سے ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی ہے۔شخصی مرثیوں میں مرحوم اشخاص سے کسی نہ کسی کا گہرا تعلق ہوتا ہے اپنے عزیز مرحومین کا تذکرہ اگر غم زدہ کردے تو کوئی تعجب کی بات نہیں' لیکن ایک شہر کا مرثیہ حالی نے اس انداز سے لکھا ہے کہ قاری احساس زیاں سے متاثر ہوجاتا ہے۔ یہ حالی کا کمال ہے کہ زبان کی سلاست و روانی اور اپنے بیان کی اثر آفرینی سے سننے والے کو متاثر کردیا ہے۔انہیں اس کا یقین ہے کہ ان کے بیان میں اتنا جادو ہے کہ خود تو رو ہی رہے ہیں کہیں اہل بزم بھی رونے نہ لگ جائیں اسی لیے تو کہتے ہیں:

ہاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

اپنی معلومات کی جانچ:

1. شہر آشوب کا موضوع کیا ہوتا ہے؟
2. اس مرثیے میں حالی نے دلی کے کن شاعروں کے نام گنائے ہیں۔

22.8 نظم ''شعر کی طرف خطاب''

اے شعر! دل فریب نہ ہوتو ' تو غم نہیں　　پر تجھ پہ حیف ہے ' جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام　　ہاں ' سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں　　تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تو
حُسن اپنا گر دکھا نہیں سکتا جہان کو　　آپے کو دیکھ! اور کر اپنے پہ ناز تو
تو نے کیا ہے بحر حقیقت کو موج خیز　　دھوکے کا ' غرق کرکے رہے گا جہاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری　　قبلہ ہو اب اُدھر ' تو نہ کیجو نماز تو
اہل نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز　　جو بے بصر ہیں' ان سے نہ رکھ ساز باز تو
ناک اوپری دوا سے تری گر چڑھائیں لوگ　　معذور جان اُن کو' جو ہے چارہ ساز تو
چپ چاپ اپنے سچ سے کیے جادلوں میں گھر　　اونچا ابھی نہ کر علَمِ امتیاز تو
جو نابلد ہیں' ان کو بتا چور بن کے راہ　　گر چاہتا ہے خضر کی عمرِ دراز تو

عزت کا بھید مُلک کی خدمت میں ہے چھپا — محمود جان آپ کو ' گر ہے ایاز تو
اے شعر ! راہِ راست پہ تو جب کہ پڑلیا — اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو
کرنی ہے فتح گرنئی دنیا تو لے ' نکل ! — بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے ' اپنا جہاز تو
ہوتی ہے سچ کی قدر ' پہ بے قدریوں کے بعد — اس کے خلاف ہو تو سمجھ اُس کو شاذ تو

جو قدرداں ہو اپنا ' اُسے مغتنم سمجھ !
حالی کو تجھ پہ ناز ہے ' کر اُس پہ ناز تو

22.8.1 نظم ''شعر کی طرف خطاب'' تجزیہ

1893ء میں حالی نے اپنے دیوان کا مقدمہ لکھ کر اردو شعر و شاعری کو ایک نیا رخ دیا۔ مقدمہ شعر و شاعری سے پہلے بھی اپنی اکثر نظموں اور غزلوں میں اردو شاعری کے اقسام گنائے ہیں۔ انھیں شدت سے احساس تھا کہ زمانہ رخ بدلتا جا رہا ہے اور ہماری شاعری ابھی گل و بلبل کی داستانوں میں کھوئی ہوئی ہے۔ وہ اردو شاعری کو تخیل کی دنیا سے نکال کر زندگی سے قریب لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو کچھ اردو شاعروں اور شاعری کے بارے میں انہوں نے مقدمہ میں لکھا ہے اس کا سارا نچوڑ اس نظم میں ہے۔ حالی کا نظریہ شاعری نہایت واضح رہا ہے۔ وہ جھوٹ اور مبالغے سے نفرت کرتے ہیں۔ حقیقت اور اصلیت پر زور دیتے ہیں۔ مقصد شاعری کے وہ قائل ہیں' اس لیے عقلیت پسندی اور مقصدیت کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس نظم میں وہ شعر ہی کو اپنا مخاطب بنا کر دراصل شاعروں کو جدید اور بامقصد شاعری کی طرف مائل کرتے ہیں۔ وہ شاعری میں صنعتوں کی پرواہ نہیں کرتے' کہتے ہیں اگر شعر دل موہ لینے والا یا دلفریب نہ ہو تو افسوس کی بات ہے۔ حالی کے زمانے میں شاعرانہ صنعتوں پر زور دیا جاتا تھا۔ اور اسے کمال سخن خیال کرتے تھے۔ حالی کہتے ہیں اگر سارا زمانہ صنعتوں پر جان دیتا ہو تو اے شعر! تو اس کی پرواہ نہ کر۔ سادگی اور سلاست اختیار کر۔ شعر میں راستی اور صداقت ہونا چاہیے۔ چاہے زمانہ اسے ناپسند کرے مگر راستی کو نہ چھوڑا جائے' زمانہ تجھ میں بلاغت کا حسن تلاش کرے گا۔ اس کے باوجود تو اپنے کو دیکھ اور اپنے پر ناز کر۔ وہ زمانہ گیا کہ ایمان شاعری جھوٹ تھا اب تو بحرِ حقیقت میں موجزن ہو جا۔ جھوٹ' فریب اور خام خیالی کا دامن چھوڑ دے۔ وہ زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر لوگ کہیں کہ یہی جھوٹ اور فریب' شاعری کا قبلہ ہے تو اس طرف سجدہ نہ کر۔ وہ لوگ بے بصر ہیں ناواقف ہیں' وہ ان جھوٹی چیزوں پر تکیہ کرتے ہیں۔ اہل نظر کا اب نظریہ شاعری بدل گیا ہے۔ تیری صداقت' سادگی اور اثر کو وہ عزیز رکھتے ہیں۔ اپنی سچ پر قائم رہ اور دلوں میں گھر کیے جا' بھلے ہی تو اپنا علم امتیاز بلند نہ کرے۔ جو لوگ سچائی اور صداقت سے ناواقف ہیں انہیں خاموشی سے راہ پر لا' یہی صداقت تجھے عمرِ خضر عطا کرے گی۔ آج طرزِ سخن غلامانہ ہے۔ تو اس روایتی بندشوں سے آزاد ہو کر ملک کی خدمت کر یعنی مقصدیت پیدا کر شاعری برائے زندگی کا علم بردار ہو جا۔ اے شاعر! اب تو اگر راہ راست پر آ گیا تو پھر یہ راہ نہ چھوڑ' اس راہ میں کئی نشیب و فراز آئیں گے یعنی لوگوں کے طنز سننے پڑیں گے مگر تو ان کی پرواہ نہ کر۔ تیری صداقت' دلگدازیت' سادگی اور سچائی سے تو دنیا کو فتح کر لے گا۔ دنیا میں یہی تیرا طرزِ قبول خاص و عام ہوگا۔ ہوتا یہی آیا ہے کہ سچ کی قدر ہوتی ہے مگر ناقدریوں کے بعد' اور فرض کرو کہ اس کے برخلاف اگر ہوتا تو ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے' جس سے تجھے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ جو تیرا اس زمانے میں قدرداں ہے اسے غنیمت جان۔ حالی تجھ پر ناز کرتا ہے تو بھی اس پر ناز کر کہ اس نے تجھے صداقت کا راستہ بتایا۔ اس نظم میں حالی نے اچھے شعر کے لیے ضروری سمجھا ہے کہ وہ:

1. دلگداز ہو خواہ دلفریب نہ ہو۔
2. سادہ ہو اگرچہ ساری دنیا صنعت کو پسند کرتی ہو۔
3. سچا ہو اور اپنے سچ سے لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے والا ہو۔
4. ناواقف کو چپکے چپکے راہ بتانے والا ہو' ملک کی خدمت کرنے والا ہو تا کہ عمرِ خضر پائے اور سچی عزت ملے۔
5. اگر نئی دنیا (نئی شاعری) کو فتح کرنا ہو تو دوسروں کا ساتھ چھوڑ کر اپنا جہاز لے کر نکل جا یعنی اپنی راہ آپ بنا۔ دوسرے معنوں میں روایتی سروسامان اور لوازمات شاعری کو چھوڑ کر اپنے اصول اور نظریے خود بنا اور آگے بڑھ۔
6. تیری اس دوا سے جو سڑی گلی شاعری کا علاج ہوگا اس پر لوگ ناک بھوں چڑھائیں گے لیکن تو اس کی پرواہ نہ کر۔

7. سچ کی قدر بے قدریوں کے بعد ہوتی ہے اس لیے ہمت نہیں ہارنا چاہیے اور سچائی کی طرف اوروں کو بھی مسلسل مائل کرتے رہنا چاہیے۔
8. جہاں تک حالی کا تعلق ہے وہ تجھ پر مذکورہ صفات کی وجہ سے ناز کرتا ہے تجھے بھی چاہیے کہ حالی پر تو بھی ناز کرے۔

حالی نے ان ہی نظریات پر عمل کیا۔ وہ یہ نظریہ رکھتے تھے کہ اردو شاعری کو زمانے کا ساتھ دینا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کا رخ پہچاننا ہے۔ اچھی اور مقصدیت سے معمور خصوصیات کو اپنانا اور ان اوصاف سے جو شاعری کو بے مقصد بناتے ہیں دامن بچانا چاہیے۔ شاعری کو آج صداقت، خلوص اور سادگی سے قریب تر ہونا چاہیے۔ جھوٹ، مبالغے، لفظی شعبدہ بازی، تصنع، تکلف اور نمائش سے دور رہنا چاہیے۔ اردو شاعری کو ظاہری یا خیالی حسن پر فریفتہ ہونے کے بجائے حقیقی اور فطری حسن و جمال کا شیدائی ہونا چاہیے۔

مقصد سے بھرپور اس نظم کو حالی نے بڑی سادگی کے ساتھ پیش کر کے خود اپنے نظریے کی صداقت کا ثبوت دیا ہے اور یہ بات ثابت کر دی ہے کہ وہ جو کہتے ہیں اسی پر عمل بھی کرتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. حالی شاعری میں کن باتوں سے نفرت کرتے ہیں؟
2. حالی نے اس نظم میں اچھے شعر کے لیے کن اوصاف کو ضروری سمجھا ہے؟

22.9 خلاصہ

مولانا حالی اردو کے ایک بہترین ادیب تھے ساتھ ہی کامیاب نظم نگار بھی تھے۔ انھوں نے نظم نگاری کی روایات کو جدید تقاضوں سے وابستہ کیا، وہ اردو کے پہلے جدید نظم نگار شاعر قرار دیے جاتے ہیں۔ انہوں نے روایتی مثنوی کو دور حاضر کی مسائلی مثنوی میں تبدیل کر کے مثنوی کی صنف کو ایک نئی جہت عطا کی چنانچہ ان کی مثنوی ''برکھارت'' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا حالی نے داستانوی عشقیہ، متصوفانہ اور دیگر قسم کی مثنویوں سے علحدہ انداز اختیار کرتے ہوئے قدرت کے ایک حسین منظر کو مثنوی کا موضوع بنایا۔ مولانا حالی نیچرل شاعری کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ شاعر کو سچائی اور حقیقت پسندی کی راہ پر ڈالنے والے شاعروں میں حالی کا اولین مقام ہے۔ انہوں نے مصطفیٰ علی خان شیفتہ اور مرزا غالب سے شعری تربیت حاصل کی۔ پانی پت میں پیدا ہوئے لیکن دلی میں علمی ادبی ذوق کو جلا ملی۔ سرسید احمد خاں سے وابستگی کے بعد مولانا حالی کی شعر گوئی ہی نہیں بلکہ نثر نگاری میں بھی کافی تغیر پیدا ہوا اور انہوں نے شاعری میں ''مسدس حالی'' اور نثر میں ''مقدمہ شعر و شاعری'' لکھ کر اردو ادب میں اہم اضافے کیے۔ وہ ایک ہمہ جہت نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقت پسند شاعر بھی ہیں۔ انہوں نے غزل کے علاوہ جدید مثنوی، شخصی مرثیے، موضوعاتی نظمیں، پیامی شاعری اور نیچرل شاعری کے ذریعہ اردو شاعری میں ایک اہم مقام بنایا۔ بنیادی طور پر مولانا حالی سادہ زبان استعمال کرنے کے حامی تھے چنانچہ ان کی تمام تر شاعری میں عربی فارسی کے الفاظ کم ہیں۔ حالی کا نظریہ یہی تھا کہ اردو زبان ایک ملی جلی زبان ہے اس لیے اس زبان کو معرب و مفرس زبان نہ بنایا جائے بلکہ اُسے عام بول چال کی زبان کی حیثیت دی جائے چنانچہ انہوں نے ساری زندگی اسی ملی جلی زبان میں شاعری کی۔ وہ انسانیت کے دوست، قوم پرست اور خوددار انسان تھے شاعری میں ان کی انفرادی خصوصیت نمایاں ہیں۔ ان کی فرشتہ صفتی مثالی ہے۔ انہوں نے اپنی شعری کارناموں سے ساری اردو دنیا کو متاثر کیا۔ ان کی نظموں کی لفظیات میں ارتقائی عمل اور موضوعات میں ندرت ہے۔ ان کی شاعری میں قدیم و جدید کی آمیزش موجود ہے۔ اردو شاعری کو ایک نئی زندگی دینے والا یہ شاعر 13 ستمبر 1914ء کو پانی پت کے مقام پر اس جہاں سے رخصت ہوا۔ ان کی اہمیت ان کی نظموں کی سچائی اور حقیقت پسندی، سادگی اور سلاست کی وجہ سے نمایاں ہے۔

22.10 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. مولانا حالی کے سوانحی حالات بیان کیجیے۔

2. اردو نظم نگاری میں حالؔی کا مقام و مرتبہ متعین کیجیے۔
3. شعر سے خطاب میں حالؔی نے اچھے شعر کی کیا خصوصیات بتائی ہیں؟
4. برکھارت کی منظر نگاری اپنے الفاظ میں کیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. حالؔی کی نیچرل شاعری پر اظہار خیال کیجیے۔
2. حالؔی کی شاعری کی حقیقت پسندی کا جائزہ لیجیے۔
3. مرثیۂ دہلی میں حالی نے کن خیالات کا اظہار کیا ہے؟
4. ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم کیوں کہا جاتا ہے؟

22.11 فرہنگ

الفاظ	= معنی	الفاظ	= معنی	الفاظ	= معنی
تغیر	= تبدیلی، انقلاب	مفلوک الحالی	= افلاس، تباہ حالی	تلامذہ	= شاگردی، طالب علم
اکتساب	= ذاتی محنت حاصل کرنا	اصلاح	= درستی	معاونت	= مدد، حمایت
تقلید	= کسی کے قدم بہ قدم چلنا	مبالغہ	= بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا	نظریہ ساز	= اصول بنانے والا
ہم عصر	= ایک وقت کے ایک زمانے کے	روش	= طور، طریقہ، ڈھنگ	نکھار	= اجلا پن، صفائی
پیراہن	= پوشاک، کپڑا، لباس	مدح	= تعریف، ستائش	مربوط	= بندھا ہوا، وابستہ
مرقع	= تصویروں کی کتاب۔ البم	اجتناب	= علحدگی۔ پرہیز	اوصاف	= وصف کی جمع، خوبیاں
ہئیت	= بناوٹ، شکل	خستہ	= بدحال، مفلس	رفقا	= رفیق کی جمع، ساتھی
رسم و راہ	= تعلقات، دوستی	متصوفانہ	= تصوف سے متعلق	ترجیح	= برتری، فوقیت
تشریح	= کھول کر بیان کرنا	محاسن	= خوبیاں	اقدام	= قدم کی جمع، قدم بڑھانا
استفادہ	= فائدہ حاصل کرنا	تفہیم	= سمجھانا	روایت	= کسی بات کی نقل
بٹیا	= پگڈنڈی	تمہید	= کسی بات کا آغاز، مضمون کا اٹھانا		
مافوق الفطرت	= فطرت سے ہٹ کر	جداگانہ	= الگ الگ، منفرد	تابندگی	= روشنی، چمک
مفکر	= سوچنے والا، فکر کرنے والا	سلطان	= لاہور کا ایک کنواں جس کا پانی ٹھنڈا ہوتا ہے		

22.12 سفارش کردہ کتابیں

1.	اختر انصاری	حالی اور نیا تنقیدی شعور
2.	محمد اسمٰعیل پانی پت	تذکرۂ حالؔی
3.	انور الحسن	مولانا حالؔی
4.	حمید احمد خاں	ارمغانِ حالؔی

.5	شجاعت علی سندیلوی	حالی بہ حیثیت شاعر
.6	ظہیر احمد صدیقی	تحقیقی مطالعہ حالؔی
.7	ناظر کاکوری	یادِ حالی
.8	سید محمد فاروق	حیاتِ حالؔی
.9	وحید قریشی	مطالعۂ ولؔی
.10	غلام مصطفیٰ خاں	حالؔی کا ذہنی ارتقا
.11	اردو، کراچی (اپریل 1952ء)	حالؔی نمبر (سہ ماہی)
.12	فروغ اردو، لکھنو فبروری 1959ء	حالی نمبر (ماہنامہ)

اکائی: 23 اقبال: حیات، کارنامے اور نظم نگاری

ساخت

23.1 تمہید

23.2 حیات

23.3 کارنامے

23.4 نظم نگاری

23.5 فلسفہ

23.6 شاعری کی خصوصیات

23.7 نظم ''ساقی نامہ''

23.7.1 ساقی نامہ کا تجزیہ

23.8 نظم ''شعاعِ امید''

23.8.1 شعاعِ امید کا تجزیہ

23.9 نظم ''فنونِ لطیفہ''

23.9.1 فنونِ لطیفہ کا تجزیہ

23.10 خلاصہ

23.11 نمونہ امتحانی سوالات

23.12 فرہنگ

22.13 سفارش کردہ کتابیں

23.1 تمہید

آپ نے ڈاکٹر اقبال کا نام ضرور سنا ہوگا بلکہ آپ کو ان کا کوئی نہ کوئی شعر ضرور یاد ہوگا۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال اردو اور فارسی کے عظیم شاعر تھے۔ وہ اردو کے چار بڑے شاعروں میں سے ایک ہیں۔ وہ شاعر ہی نہیں مفکر بھی تھے۔ اس اکائی میں ہم ڈاکٹر سر محمد اقبال کے حالاتِ زندگی، کارنامے اور ان کی نظم نگاری کی خصوصیات کے ساتھ ان کی منتخب نظموں کی تشریح پڑھیں گے۔ ان کے فلسفے کے بارے میں واقفیت بھی حاصل کریں گے۔

23.2 حیات

ڈاکٹر اقبال کا تعلق کشمیری خاندان سے تھا جو سترھویں صدی عیسوی میں مشرف با اسلام ہوا۔ یہ خاندان برہمن تھا۔ اپنی نیکی اور شرافت کی وجہ سے معزز تھا۔ ڈاکٹر اقبال کے جد اعلیٰ بابا صالح تھے جنھوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ ان کی اولاد 1857ء کے ہنگاموں کے بعد سیال کوٹ میں مقیم ہوئی۔ پہلے پہل علامہ اقبال کے دادا نے یہاں سکونت اختیار کی۔ ان کا نام شیخ رفیق تھا۔ ان کے دو صاحبزادے تھے ایک شیخ نور محمد، دوسرے شیخ غلام قادر۔ شیخ نور محمد کی شادی امام بی بی سے ہوئی۔ شیخ نور محمد کے یہاں دو لڑکے ہوئے شیخ عطا محمد اور شیخ محمد اقبال۔ ان کے علاوہ تین لڑکیاں بھی تھیں۔ اقبال 9 نومبر 1877ء بروز جمعہ، سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکتبہ عمر شاہ، محلہ شوالہ، سیال کوٹ کی مسجد میں ابو عبداللہ مولانا غلام حسن کے مکتب میں حاصل کی۔ بعد میں مولانا میر حسن کی خواہش پر ان کے مکتب واقع کوچہ میر حسام الدین میں اردو عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی قرآن مجید کا درس لیا۔ اقبال کی شعری

شخصیت کی تشکیل میں سید میر حسن کا فیضان شامل ہے۔ 1883ء میں سکاچ مشن اسکول سیال کوٹ میں داخلہ لیا۔ 1888ء میں پرائمری کا امتحان اور 1891ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ شعر بھی موزوں کرنے لگے تھے۔ 1893 میں میٹرک درجہ اول میں پاس کیا اسی تاریخ کو یعنی 3 مئی کو ان کی شادی گجرات (پنجاب) کے سول سرجن خان بہادر عطا محمد کی بیٹی کریم بی بی سے ہوئی۔ اقبال نے اسکاچ مشن کالج میں داخل لیا اور استاد داغؔ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ اس طرح تعلیمی سلسلہ بھی جاری رہا اور شاعری بھی..... ادبی رسائل میں کلام شائع ہونے لگا۔ 1895ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان درجہ دوم میں پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔اے میں داخلہ لیا۔

1897ء میں بی۔اے سکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔ عربی اور انگریزی میں اول آنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے دیے گئے۔ اس زمانے میں پروفیسر ٹامس آرنلڈ علی گڑھ کالج سے قطع تعلق کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اقبال کو پروفیسر آرنلڈ سے شاگردی کا موقع ملا۔ اقبال نے ایم۔اے (فلسفہ) میں داخلہ لیا اور 1899ء میں ایم۔اے تیسرے درجے میں پاس کیا۔ اورینٹل کالج کے میکوڈ عربک ریڈر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں ریسرچ اسکالر کو ریڈز کہا جاتا تھا۔ چھ ماہ بعد انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج میں کام کیا۔ 1904ء اسسٹنٹ پروفیسری کی ملازمت ختم ہوگئی لیکن اس مدت میں مزید توسیع کی گئی اور فلسفہ پڑھانے پر مامور ہوئے۔ یورپ جانے تک اسی منصب پر فائز رہے۔ 1905ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ روانہ ہوئے۔ ٹرنٹی کالج کیمبرج میں داخلہ لیا۔ 1907ء میں میونخ یونیورسٹی (جرمنی) میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے انگریزی میں مقالہ "Development of Meta Physics in Persia" (ایران میں مابعد الطبعیات کا ارتقا) کے موضوع پر داخل کیا جس پر انھیں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری دی گئی۔ 1908ء میں لنکز ان سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال ان کا مقالہ انگریزی میں شائع ہوا۔ 1910ء میں ان کا نکاح سردار بیگم سے ہوا۔ 1913ء میں مختار بیگم سے نکاح ہوا۔ 1923ء میں انھیں سر کا خطاب ملا۔ 1931ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ لندن سے اٹلی، روم، وینس، مصر، اسکندریہ، قاہرہ، فلسطین ہوتے ہوئے واپس بمبئی آئے۔ انھوں نے قصر وینس میں مسولینی سے ملاقات کی۔ 1932ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے۔ لندن سے پیرس، اسپین، میڈرڈ گئے اور براہ وینس ہندوستان واپس ہوئے۔ 1933ء میں افغانستان گئے۔

اقبالؔ کو کم عمری ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ انھوں نے داغؔ سے اصلاح لی تھی لیکن ان کی شاعری کا رنگ داغؔ سے یکسر مختلف تھا۔ انھوں نے اردو شاعری کو ایک خاص فلسفہ دیا اور فلسفیانہ گہرائیوں سے روشناس کروایا۔

اردو میں ان کی شاعری کے چار مجموعے 'بانگ درا' 'بال جبرئیل' 'ضرب کلیم اور ارمغانِ حجاز شائع ہو چکے ہیں۔ فارسی میں ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ اسرار خودی، رموزِ بے خودی، پیام مشرق، زبور عجم اور جاوید نامہ قابل ذکر ہیں۔ اقبال کا انتقال 21 اپریل 1938ء کو لاہور میں ہوا۔ مزارِ اقبال حضوری باغ کے قریب، شاہی مسجد کے جنوب مشرقی مینار کے سایہ میں واقع ہے۔ اقبالؔ کو پہلی بیوی کریم بی بی سے آفتاب اقبال اور معراج بیگم پیدا ہوئے۔ سردار بیگم سے جاوید اقبال اور منیرہ بانو پیدا ہوئے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اقبال نے کس شاعر سے شرف تلمذ حاصل کیا؟

(ا) میر حسن (ب) داغؔ (ج) امیر مینائی (د) شیخ نور محمد

2. اقبال نے جس یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اس کا نام ہے:

(ا) آکسفورڈ یونیورسٹی (ب) پنجاب یونیورسٹی (ج) میونخ یونیورسٹی (د) ایران یونیورسٹی

23.3 کارنامے

اقبالؔ جن دنوں بی۔اے میں پڑھتے تھے انھوں نے انجمن کشمیری مسلمان کے مشاعرے میں نظم ''فلاحِ قوم'' سنائی۔ عبدالکریم الجیلی کی کتاب ''نظریۂ توحید مطلق'' پر انگریزی میں ایک مضمون ''انڈین انٹی کیوری'' کے 29ویں شمارے (ستمبر 1900) میں شائع ہوا۔ 1901ء میں وہ انجمن کشمیری

مسلمان کے سکریٹری بنائے گئے۔ 23 فروری کو انجمن حیات اسلام کے سترھویں جلسے میں صدر جلسہ میاں نظام الدین نے انھیں ''ملک الشعرا'' کا خطاب دیا۔ اکتوبر 1904ء میں پہلی اردو تصنیف ''علم الاقتصاد'' لاہور سے شائع ہوئی۔ معاشیات کے موضوع پر یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ 1910ء میں انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ 1911ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ دہلی کے تیسرے اجلاس کی صدارت کی۔ 1918ء میں اورینٹل فیکلٹی کے ڈین مقرر ہوئے۔ 1920ء میں مثنوی اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ پروفیسر آر۔اے۔ نکلسن نے کیا۔ جنوری 1923ء میں سر کا خطاب ملا۔ پنجاب یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل کے رکن مقرر ہوئے۔ جون 1927ء میں پنجاب **لیجسلیٹو** کونسل کے رکن منتخب ہوئے اور 1930 تک اس سے وابستہ رہے۔ 1929ء میں 5 جنوری سے 8 جنوری تک ''خطبات مدراس'' دیے۔ 19 جنوری کو میر عثمان علی خاں سے ملاقات کی۔ مئی 1930ء میں ''خطبات مدراس'' (انگریزی) شائع ہوئے۔ نومبر 1931ء میں لندن میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ فلسطین میں اسلامی کانفرنس میں شرکت کی۔ وہاں عہدہ داروں کا انتخاب ہوا۔ چار نائب صدور میں سے ایک اقبال منتخب ہوئے۔ بیت المقدس بھی گیے۔ 1932ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ دارالعلوم کمیٹی روم میں ایک تاریخی اجلاس منعقد ہوا جس میں اقبال نے تقریر کی۔ واپسی پر لاہور میں شاندار استقبال کیا گیا۔ 1934ء میں انجمن حمایت اسلام کے صدر منتخب ہوئے۔ 1936ء میں محمد علی جناح سے ملاقات کی۔ پنجاب مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں نظم 'نغمۂ سرمدی'' پڑھی یہ آخری شرکت تھی۔ ڈاکٹر اقبال کو علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری (1929ء)' پنجاب یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری (1933ء)' ڈھاکہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری (1936ء) الہ آباد یونیورسٹی کی اعزاز ڈگری برائے ڈی لٹ (1937ء) اور عثمانیہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری (1938ء) میں عطا کی۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ کس نے کیا؟

(ا) آر۔اے۔نکلسن (ب) آرنلڈ (ج) سر عبدالقادر (د) نذیر محمد بنارسی

2. اقبال کو کن کن یونیورسٹیوں سے ڈی لٹ کی ڈگریاں دی گئیں؟

23.4 نظم نگاری

اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا لیکن اقبال کی نظموں کی تعداد غزلوں کے مقابلے میں زیادہ ہے اور ان کی شہرت بحیثیت نظم گو شاعر ہے۔ اقبال نے ہیئت کو کبھی اہمیت نہیں دی ان کی غزلوں میں تسلسل اور نظموں میں رنگِ تغزل ملتا ہے۔ اقبال کے پہلے شعری مجموعے بانگ درا میں حسن فطرت سے دلچسپی اور حب الوطنی کے جذبات نمایاں نظر آتے ہیں۔ بال جبرئیل کی شاعری میں مفکرانہ پہلو نمایاں ہیں۔ ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کی نظموں پر ڈرامائی انداز اور خطابت حاوی ہے۔ ''ہمالہ'' اقبال کی پہلی مطبوعہ نظم ہے جو مخزن لاہور کے پہلے شمارے میں ''کوہستان ہمالہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی اور بانگ درا میں ''ہمالہ'' کے عنوان سے شامل کی گئی۔ اس سے قبل انھوں نے ''فلاح قوم'' (انجمن کشمیری مسلمان کے مشاعرے میں' 1896ء) نالہ یتیم (انجمن حمایت اسلام کے پندرہویں سالانہ جلسے میں' 1900ء) اور ''دردِ دل یا یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے'' (انجمن حمایت اسلام کے سولھویں سالانہ جلسے میں 1901ء) پڑھی تھیں۔ ''ہمالہ'' نے صاحبِ ذوق حلقے کو چونکا دیا۔ اس نظم میں حسن فطرت' حب الوطنی کے ساتھ ساتھ ماضی کی بازیافت کا جذبہ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ مناظرِ فطرت سے دلچسپی بعد کی نظموں میں بھی نظر آتی ہے۔ ابتدائی دور میں اقبال نے نیچرل نظمیں لکھیں اور مناظر قدرت کے مختلف مرقعوں کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت کو فطرت کا پیام بھی دیا۔ ایسی نظموں میں ''گل رنگیں'' ابر کوہسار' آفتابِ صبح' چاند' جگنو' شمع' ماہ نو' انسان اور بزم قدرت' ایک آرزو' موجِ دریا' ابر' کنارۂ راوی قابل ذکر ہیں۔ ''ایک آرزو'' شاعرانہ مصوری کی عمدہ مثال ہے۔ شاعر دنیا کے ہنگاموں سے دور ایک پرسکون زندگی کی خواہش کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ کسی دامنِ کوہ میں چھوٹا سا جھونپڑا ہو جہاں وہ سب سے الگ تھلگ اپنے تصورات کی دنیا میں مست زندگی بسر کرے۔

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

''پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو'' ایک اچھوتا خیال اور ایک خوب صورت تجسیم ہے۔ بانگِ درا کے حصہ دوم میں حقیقتِ حسن، کلی، چاند اور تارے، انسان، ایک شام، تنہائی جیسی نظمیں فطرت کے جمال و پیام کے آئینے ہیں۔

اقبال نے تجریدی تصورات کو جیتی جاگتی شکل میں پیش کیا اور غیر مرئی اشیا کی تجسیم کر کے خوبصورت پیکر بنائے۔ ان کے افکار اور تصورات استعاروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کی خوبصورت مثال ''حقیقت حسن'' ہے۔ حصہ سوم میں ستارہ، نمودِ صبح، بزم انجم، چاند، شبنم اور ستارے، آفتاب، پھول جیسی نظمیں ہیں جس میں شاعری اور فلسفے کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ اقبال حسنِ قدرت کے مظاہر میں معنویت تلاش کرتے ہیں اور فطرت کے ساتھ انسان کی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ بے جان اشیا کو ذی روح محسوس کرتے ہیں اور ان کی زبانی اپنی بات کہتے ہیں۔ اقبال فلسفیانہ نظموں کے آغاز میں کچھ اس طرح منظر نگاری کرتے ہیں جس سے فضا سازی میں مدد ملتی ہے۔ گورستان شاہی میں وہ سوگوار فضا بناتے ہیں۔ ''خضر راہ'' کی ابتدا میں جو منظر کشی انھوں نے کی ہے وہ ایک خاص فضا کی تشکیل کرتی ہے۔ 'مسجد قرطبہ'' کے آخر میں یہ منظر نگاری اس کی معنویت بڑھا دیتی ہے:

وادیٔ کہسار میں غرق شفق ہ سحاب — لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پرسوز ہے دختر دہقاں کا گیت — کشتیٔ دل کے لیے سیل ہے عہد شباب

وطنی اور قومی شاعری میں انھوں نے حب الوطنی کے جذبات ابھارنے کی کوشش کی ہے یا قوم کو دعوت عمل دی ہے۔ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، ترانہ ملی، نیا شوالہ، وطنیت، خطاب بہ جوانانِ اسلام، ہلال عید، صدائے درد، تصویر درد، آفتاب، ترانۂ ہندی اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان نظموں میں اقبال نے قوم کو اتحاد کا پیغام دیا۔ اور خبردار کیا کہ اگر وہ متحد نہ رہیں گے تو پوری قوم کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔ اس زمانے میں اقبال نے بچوں کی نظمیں بھی کثرت سے لکھیں جن میں ایک مکڑی ایک مکھی، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک گائے اور بکری، بچے کی دعا، ماں کا خواب، پرندے کی فریاد، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت اور ہمدردی اہم ہیں۔ ان میں بعض نظمیں مشہور شعرا ایمرسن، ولیم کوپر، لانگ فیلو اور ٹینی سن کے خیالات سے متاثر ہو کر لکھیں۔

اخلاقی نظموں میں گل پژمردہ، زہد اور رندی، طفل شیر خوار، گورستانِ شاہی، شبنم اور ستارے شامل ہیں۔ ان نظموں میں انھوں نے اخلاق حسنہ پیدا کرنے کی تلقین کی ہے یا سبق آموز واقعات کو نظم کیا ہے۔

تاریخی نظموں میں ہلال، صقلیہ، غلام قادر رہیلہ، حضور رسالت مآب میں، فاطمہ بنت عبداللہ، محاصرہ اور نہ، صدیق اکبر، بلاد اسلامیہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں تاریخی واقعات نظم کیے ہیں یا مشاہیر اسلام کو موضوع بنایا ہے۔

اقبال کی ابتدائی نظموں میں تلاش، تحقیق اور تجسس کا رنگ گہرا ہے۔ اس دور میں اقبال نے حیات، ماخذ حیات، مقصد حیات، حیات بعد الموت، شعور، ذات، خودی، بے خودی، حسن و عشق کے بارے میں غور و فکر کی۔ اس دور کی نظموں میں اقبال کی فلسفیانہ شاعری کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ گل رنگیں، خفتگان خاک سے استفسار، شمع، انسان اور بزم قدرت، بچہ اور شمع، جگنو اور دل ایسی ہی نظمیں ہیں۔

1905ء میں اقبال یورپ گئے تھے اور 1908 تک وہاں رہے۔ یورپ کے قیام کے دوران ان کے خیالات میں ایک عظیم انقلاب آیا۔ وہاں کی سیاست کو انھوں نے قریب سے دیکھا۔ انھیں وہاں کی تہذیب کی حقیقت کا پتہ چلا۔ انھیں احساس ہوا کہ قومیت اور وطنیت کا نظریہ انسانوں کے حق میں مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس سے تعصب اور تنگ نظری کو تقویت ملتی ہے۔ اقبال نے دیکھا کہ مغربی تہذیب کی بنیاد مادیت پر ہے۔ وہ منکرِ خدا ہیں۔ اقبال اس نتیجے پر پہنچے کہ دنیا کی نجات اسلامی اصولوں کی تبلیغ و اشاعت میں مضمر ہے۔ 1908ء سے 1938ء تک اقبال کی نظموں میں ایک جداگانہ انقلابی رنگ حاوی ہے۔ ان کی اس تبدیلی کا مظہر ان کی نظم ''طلبہ علی گڑھ کالج کے نام'' ہے جو انھوں نے یورپ میں قیام کے دوران 1907ء میں لکھی۔ اقبال نے پہلی مرتبہ قوم کے نوجوانوں کو مخاطب کیا اور اسی نظم سے ان کے فلسفے کی بنیاد پڑی۔ 1857ء کی ناکام جدوجہد کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ مسلمانان ہند کا کوئی نصب العین نہیں تھا۔ اقبال نے انھیں عشق و عمل کا پیغام دیا۔ وہ کہتے ہیں

اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے
عشق کے درد مند کا طرزِ کلام اور ہے

اس نظم میں اقبال کے ان تصورات کے ہلکے نقوش نظر آتے ہیں جو آگے چل کر ایک منضبط فلسفے کی صورت میں ابھرے۔ اس نظم میں اقبال نے عقل اور عشق کا تقابل پیش کیا۔ اقبال نے عشق اختیار کرنے کی تلقین کی۔ انھوں نے قوم میں ولولہ اور جوش پیدا کرنے والی نظمیں لکھیں۔ 1906ء میں انھوں نے نظم ''محبت'' لکھی جس میں انھوں نے حسن نیکی اور صداقت جیسے ستیم، شیوم، سندرم کے فلسفے کو پیش کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو ان کا شاندار ماضی یاد دلایا۔ یورپ کے قیام کے دوران ان کے خیالات میں جو تبدیلی آئی اس کا احساس نظم ''عبدالقادر کے نام'' میں ملتا ہے۔ یہ نظم انھوں نے 1908ء میں اپنے دوست سر عبدالقادر کے نام لکھی تھی۔

یورپ سے واپسی کے بعد اقبال نے نظم ''صقلیہ'' لکھی۔ جزیرہ سسلی کو عربی میں صقلیہ کہتے ہیں۔ عربوں نے اس جزیرے کو تہذیب و تمدن اور علم و فضل اور صنعت و حرفت سے مالا مال کیا تھا۔ اقبال نے صقلیہ کو تہذیب حجازی کا مزار کہا۔ اس دور میں اقبال کی نظموں کا موضوع فلسفہ خودی، فلسفہ بے خودی اور عشق ہو گیا۔ انھوں نے اپنی شاعرانہ قوت کو مسلمانوں کو جگانے اور ان کے دل میں ولولہ پیدا کرنے کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے قوم کو امید و یقین کا پیغام دیا۔ اطاعت اسلام کے جذبے کو ابھارا، مغرب کی مادہ پرست تہذیب کے خطرات سے آگاہ کیا۔ خطاب بہ نوجوانان اسلام، مسلم، شعاع آفتاب، نوید صبح، شکوہ، جواب شکوہ، شمع اور شاعر، خضر راہ اور طلوع اسلام ان خیالات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ شکوہ اقبال کی پہلی طویل نظم ہے جو انھوں نے 1911ء میں لکھی۔ اس نظم میں اقبال نے مسلمانوں کے دورِ عظمت و شوکت کا حال اور موجودہ زبوں حالی کو نہایت فن کارانہ انداز میں پیش کیا۔ اردو کا شعری سرمایہ اس انداز سے بالکل نا آشنا تھا۔ یہ اس دور کے مسلمانوں کے دل کی آواز تھی۔ شکوہ بے حد مقبول ہوئی۔ شکوہ کے ڈیڑھ سال بعد اقبال نے ''جواب شکوہ'' لکھی۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسلمانوں کو مخاطب کیا۔ یہ نظم بیانیہ انداز کی ہے۔ اس میں تاسف کا اظہار بھی ہے، امید بھی بندھائی گئی۔ دعوتِ عمل بھی ہے۔ ان سب نے مل کر نظم کو منفرد بنا دیا ہے۔ ڈرامائی رنگ نے اس کی تاثیر میں اضافہ کیا۔ کہیں کہیں طنزیہ انداز سیدھا دل میں اتر جاتا ہے۔ جیسے

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو — تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر — اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر
حرم پاک بھی اللہ بھی قران بھی ایک — کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

''جواب شکوہ'' فکر و خیال کی ندرت کے ساتھ فنی اعتبار سے بھی ایک خوب صورت نظم ہے۔ تاثر کی شدت اور جذبے کی گہرائی نظم کے ہر حصے میں موجود ہے۔ نظم کا اختتام اس قدر لاجواب ہے کہ اس کی مثال پوری شاعری میں نہیں ملتی:

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

سرکار دو عالمؐ نے اقبال کی بے پناہ محبت، ان کی دوسری نظموں میں جھلکتی ہے۔ ''شمع و شاعر'' بھی ایک اہم نظم ہے۔ اقبال نے رمز، کنایہ و علامت کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ اقبال نے شاعری کی پرانی و روایتی علامتوں کو نئے معنی و مطالب عطا کیے۔ اس نظم کا موضوع قومی انحطاط، مسلمانوں کا مقام، راہِ عمل اور درخشاں مستقبل ہے۔ اقبال مسلمانوں کے انحطاط کا سبب ان کے انفرادی کردار کا خاتمہ، اخلاقی پستی، بے عملی، تن آسانی، موثر قیادت کا فقدان آپسی نفاق و انتشار بتاتے ہیں۔ اقبال مسلمانوں کو اس بات کا بھی احساس دلاتے ہیں کہ وہ ماضی میں کیا تھے:

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہانگیر و جہاں دارا، جہاں بان و جہاں آرا

اقبال مسلمانوں کے روشن مستقبل کا انحصار مغرب کی تقلید سے احتراز بتاتے ہیں۔ دوسری طرف وہ مغربی سیاست کی عیاری سے بھی باخبر کرتے ہیں۔ سلطنت عثمانیہ، سرزمین عرب کی تقسیم، اسرائیل کا قیام یہ سب کچھ مغربی چالوں کے مظہر تھے۔ اس پس منظر میں اس نظم کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اقبال کی ایک اور طویل نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' ہے۔ اس نظم میں انھوں نے فلسفہ حیات و ممات، جبر و قدر، عظمت انساں اور سوز و گداز کی اہمیت کو موضوع بنایا۔ ''خضرِ راہ'' اور ''طلوع اسلام'' میں اقبال نے مسلمانوں کو امید افزا مستقبل کا مژدہ سنایا۔

''بال جبرئیل'' 1935ء میں شائع ہوئی۔ ''بال جبرئیل'' اقبال کی اردو شاعری کا نقطۂ عروج ہے۔ ''بال جبرئیل'' سرزمین قرطبہ کے متعلق نظموں

سے شروع ہوتا ہے ''ہسپانیہ'' قید خانے میں معتمد کی فریاد' عبدالرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا درخت (سرزمین اندلس میں) طارق کی دعا (اندلس کے میدان جنگ میں)۔ان چھوٹی چھوٹی نظموں کے احساسات وسیع اور واضح ہو کر ایک بڑی نظم ''مسجد قرطبہ'' کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔ پوری نظم شاعری کا کارنامہ ہے۔ وقت مسلسل متحرک ہے' عشق لافانی ہے۔ مسجد دین اور فن کی علامت ہے' مردمومن ایک کائناتی قوت ہے۔ عصر حاضر ایک انقلابی موڑ پر ہے۔ خون جگر کے بغیر سارے نقش ناتمام ہیں۔ اقبال کے تصور عشق' فلسفہ عمل اور مردمومن پوری وضاحت کے ساتھ اس نظم میں موجود ہیں۔ اقبال کے مردمومن میں علم ومحبت' عقل وعشق میں ایک ہم آہنگی ہے جو اسے ایک عالمگیر علامت بناتی ہے۔ بال جبرئیل کی دوسری اہم نظمیں 'ذوق وشوق' اور 'ساقی نامہ' ہیں۔ اقبال نے جوابات 'شکوہ' میں اجتماعی طور پر کھلے انداز میں کہی وہی بات 'ذوق وشوق' میں انفرادی طور پر اختصار کے ساتھ اشاروں میں کی ہے۔ یہ علامتیا نداز شاعر کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ فنی اعتبار سے یہ ایک شاہکار نظم ہے۔ اس نظم کی سب سے بڑی خوبی اس کا سوز وگداز ہے۔ یہ نظم ایجاز و بلاغت کی عمدہ مثال ہے۔ ''ساقی نامہ'' بھی اقبال کی اہم نظم ہے اور یہ ایک پر جوش نظم سمجھی جاتی ہے۔ اس نظم میں اقبال کا فلسفہ ایک نغمے میں ڈھل گیا ہے اور پوری نظم مترنم اور رواں ہے۔

بال جبرئیل میں خوب صورت تمثیلی اور علامتی نظمیں ملتی ہیں۔ علامتی نظموں میں ''لالہ صحرا'' اور ''شاہین'' اہم ہیں۔ لالہ صحرا کائنات کی وسعتوں میں انسان کی تنہائی اور کارفرمائی کی علامت ہے۔ لالہ اور شاہین اقبال کی مرغوب علامتیں ہیں۔ شاہین ایک طاقت ور پرندہ ہی نہیں بلکہ اس میں فقر وغنا' غیرت وحمیت' سخت کوشی اور وسیع النظری' مردار چیزوں سے پرہیز' تازہ شکار کرنا ایسی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اقبال نے شاہین کو علامت بنایا۔ اقبال افراد کی سیرت پر لالہ صحرا کی خاموشی و دل سوزی اور شاہین کی طرح لہو گرم رکھنا چاہتے ہیں تا کہ جلال و جمال' وقار اور عمل کے امتزاج سے ایک متوازن کردار کائنات میں ہستی کی داد دے۔

تمثیلی نظموں میں ''روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے''۔ ''لینن خدا کے حضور میں''۔ 'فرشتوں کا گیت''۔ ''فرمانِ خدا''۔ ''جبرئیل و ابلیس کا مکالمہ'' قابل ذکر ہیں۔ لینن پر نظم اقبال کے فلسفہ حیات' مطالعہ تاریخ اور تجزیہ سیاست کی ترجمان ہے۔ وہ سرمایہ داری اور مادہ پرستی کے ساتھ کلیسائیت پر بھی شدید تنقید کرتے ہیں کیوں کہ مغرب کی مسخ شدہ مسیحیت اور غلط مذہبیت کے ردعمل کے طور پر کمیونزم کی بنیاد دہریت اور الحاد پر رکھی گئی ہے۔

ضرب کلیم میں چھوٹی اور متوسط نظمیں ہیں۔ ''شعاعِ امید'' سب سے مشہور اور فکر وفن کے اعتبار سے ایک اہم نظم ہے۔ یہ نظم تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں کرنوں سے سورج کا خطاب ہے۔ دوسرے حصے میں کرنوں پر خطاب کا اثر دکھایا گیا۔ تیسرے حصے میں شعاعِ آفتاب کہتی ہے کہ وہ اس وقت تک چمکتی رہے گی جب تک پورا مشرق اور سارا عالم روشن نہ ہو جائے۔ یہ 'شعاع امید' اقبال کی شاعری کے امید افزا پیام کی علامت ہے۔ ضرب کلیم کی دوسری نظموں میں علم وعشق' نگاہ' صبح چمن' لا الہ الا اللہ' معراج' مدنیت اسلام' نکتہ توحید' مرد مسلماں' سلطان ٹیپو کی وصیت' عورت' نگاہ شوق' فنون لطیفہ' ابی سینا' ابلیس کا فرمان اور مسولینی بھی اہم نظمیں ہیں:

''ارمغان حجاز' کی سب سے اہم نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' ہے۔ اس میں پانچوں مشیر دنیا کی صورت حال سے ابلیس کو آگاہ کرتے ہیں۔ پانچواں مشیر اشتراکیت کے نئے فتنے کی نشان دہی کرتا ہے۔ ابلیس اپنے خطاب میں واضح کرتا ہے کہ ابلیسی نظام کو اشتراکیت سے کوئی خطرہ نہیں اسے سب سے زیادہ خطرہ امت مسلمہ سے ہے۔

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد — یہ پریشاں روزگار ' آشفتہ مغز ' آشفتہ مو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے — جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ — کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے — مزدکیت فتنہ فردا نہیں ' اسلام ہے

ابلیس کی مجلس شوریٰ اپنی ڈرامائیت' روانی' رنگ وآہنگ کے اعتبار سے اقبال کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اقبال کی پہلی مطبوعہ نظم ہے:

(ا)فلاح قوم (ب)نالہ یتیم (ج)ہمالہ (د)ایک آرزو

2. اقبال کا کون سا مجموعہ کلام فارسی میں ہے؟

(ا)پیام مشرق (ب)بانگ درا (ج)بال جبرئیل (د)ارمغانِ حجاز

3. اقبال کی پہلی طویل نظم:

(ا)ہمالہ (ب)لالہ صحرا (ج) شکوہ (د)فنون لطیفہ

23.5 فلسفہ

اقبال کی شاعری میں جو فلسفہ ملتا ہے اس کے اہم نکات خودی، عشق، فقر، عمل اور مردِ مومن ہیں۔ اقبال کی شاعری کی بنیاد فلسفہ خودی ہے۔ اقبال نے یہ لفظ غرور کے معنی میں استعمال نہیں کیا بلکہ اس کا مفہوم احساس نفس اور تعینِ ذات ہے۔ تمام مخلوقات میں انسان سب سے برتر ہے اس لیے اس کی ذات کو خودی کا شعور ہے۔ یہی شعور اسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ انسان بھی ایک مخلوق ہے لیکن اس کی ہستی اعتباری نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ اس کے مقابلے میں عالمِ فطرت کا وجود محض اضافی ہے۔ انسانی زندگی کا آغاز اسی خودی کا شعور ہے۔ اپنی منزل پانے کے لیے وہ خود کو مستحکم کرتا جاتا ہے۔ خودی کو مستحکم کرنے کے لیے انسان غیر خود یعنی طبعی ماحول سے مسلسل جنگ کرتا رہے وہ اس طرح کہ وہ اپنے لیے نئے نئے مقاصد متعین کرتا رہے۔ اپنی راہوں کی رکاوٹوں کو دور کرنا اور مشکلات پر غالب آنا اس کا نصب العین ہو تو اس کی ذہنی اور عملی قوتیں برابر تیز ہوتی جائیں گی اس طرح خودی کی آگ بھڑکتی رہے گی۔ ایک مقصد کے حصول کے بعد دوسرے مقصد کی کوشش کرتے ہوئے وہ راہ طلب میں آگے بڑھتا رہے اسی بے قراری اور بے چینی اور اس جہد مسلسل و سعی پیہم کا نام زندگی ہے۔ سکوں خواہ بہشت کا سکون ہی کیوں نہ ہو روح انسانی کے لیے موت کا پیام ہے۔ اس کے بعد کی منزل ضبطِ نفس ہے۔ اس طرح انسان اوج کمال پر پہنچتا ہے۔ یہ نیابت الٰہی کا درجہ ہے اور اسے حاصل کرنا ارتقائے خودی کا بلند ترین نصب العین ہے۔ اسی کی تلاش میں نوع انسانی سرگرداں ہے اور اسی کے انتظار میں کائنات روزِ ازل سے بے قرار ہے۔ ان اوصاف کا حامل ''مردِ مومن'' ہے۔ اقبال اجتماعی خودی پر بھی زور دیتے ہیں۔ ملت کے احساسِ خودی کے لیے علم کائنات اور تسخیر کائنات کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی روایات اور تاریخ کی یاد تازہ رکھے۔ تاریخ، اقوام کی زندگی کے لیے قوتِ حافظہ کا حکم رکھتی ہے۔

اس خودی کے لیے ایک رہنما کی ضرورت ہے اور یہ رہنما 'عشق' ہے۔ عشق مردِ مومن یا مردِ کامل کی صفات میں سے ایک ہے جو معرفت نفس کے مدارج طے کر کے خودی کی معراج پر پہنچ گیا ہو۔ خودی کی سب سے اہم شرط فقر اور استغنا ہے۔ اقبال کے نزدیک فقر مادی لذتوں سے بے نیاز ہو کر کائنات کی قوتوں کو تسخیر کرنا، نوامیس فطرت پر حکمرانی کرنا۔ دنیا میں امن و انصاف پھیلانا مظلوموں کو ظالموں کے پنجے سے نجات دلانا ہے۔

اقبال نے عقل کے مقابلے میں عشق کو ترجیح دی۔ ان کے خیال میں علم و عقل انسان کو منزل کے قریب تو پہنچا سکتے ہیں لیکن بغیر عشق کی مدد کے منزل تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ عقل کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں جرات کی کمی ہے۔ عشق کی پشت پناہی کے بغیر عقل ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی ہے۔ عقل جہاں پس و پیش کرتی ہے وہاں عشق زندگی کے قافلے کی رہبری کرتا ہے۔ وہ سارے کارنامے جنھوں نے قوموں کی زندگی بدل دی وہ کسی جذبے کے تحت ہی انجام پائے۔ اقبال عقل کے خلاف نہیں ہیں لیکن جدید تہذیب کا عقل پرستی کی طرف جو شدید رجحان ہے اقبال اس کے مخالف ہیں۔ اس رجحان نے انسانی زندگی کو بے رنگ و بے لطف بنا دیا ہے۔ اقبال عشق کی دو منزلوں کی طرف نشان دہی کرتے ہیں پہلی منزل سوز و گداز کی ہے دوسری کیف دیدار کی ہے۔ لذت دیدار سے آشنا ہونے کے بعد بھی نفس انسانی خالق مطلق سے دور ہے۔ وہ دردِ جدائی میں تڑپتا ہے۔ یہی اس کی فطرت ہے اور یہی اس کی تقدیر ہے۔ یہ جدائی ہی اس کی خودی کی وجہ حیات ہے۔

اقبال سوز و خلوص پر بھی زور دیتے ہیں۔ اقبال جس کو خونِ جگر کہتے ہیں وہ یہی خلوص ہے جس کی پرورش جذبے کی آغوش میں ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں جب تک ساز میں صاحب ساز کا لہو رواں نہ ہو فن کا معجزہ ظہور میں نہیں آ سکتا۔ جذبہ چاہتا ہے کہ اس کی خاطر ساری صلاحیتوں کو جھونک دیا جائے۔ وہ اس کے اخلاص میں کسی کی شرکت گوارہ نہیں کرتا۔

اقبال کے کلام میں جگہ جگہ عمل کی تلقین ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں مقاصد کتنے ہی بلند ہوں عمل کے بغیر بے معنی ہوتے ہیں۔ انسان کی شخصیت عمل ہی کے ذریعہ بنتی ہے۔ نیکی کوئی بنی بنائی شئے نہیں ہے وہ ہمارے عمل سے جنم لیتی ہے علم کوئی مفرد شئے نہیں ہے جو وہ ذہنی یا خارجی عالم میں پایا جاتا ہے بلکہ اندرونی عمل کی امتزاجی کیفیت ہی علم ہے۔ عمل خودی اور زندگی کا اصل سرچشمہ ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

صحیح جواب کی نشان دہی کیجیے:

1. اقبال نے عقل کے مقابلے میں عشق کو ترجیح دی۔
2. اقبال نے عشق کو دماغ کا خلل کہا ہے۔
3. اقبال خودی اور تسخیر کائنات کے سخت مخالف تھے۔
4. اقبال کے کلام میں جگہ جگہ بے عملی کی تلقین ملتی ہے۔

23.6 شاعری کی خصوصیات

اقبال کے کلام میں زبان و بیان کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔ انھوں نے خود اپنی زبان اختراع کی۔ اقبال کے کلام میں رمزیت و علامت نگاری ملتی ہیں لیکن یہ علامتیں معمہ نہیں بنتیں۔ اقبال نے اپنی شاعری میں فلسفیانہ مضامین باندھے۔ معلمانہ انداز میں مقصدی شاعری کی لیکن اسے خشک اور بے رنگ ہونے نہیں دیا۔ اقبال جذبات و تخیل کے ساتھ امید آفرینی اور آزادی پر زور دیتے ہیں۔ اقبال نے اپنے تخیل کی بنیاد پر کئی ڈرامائی نظمیں لکھیں ان کا سب سے جاندار کردار ابلیس ہے۔

اقبال نے نادر تشبیہات 'استعارات' رمز' کنایہ' صنائع' بدائع کے استعمال میں کمال فن کا ثبوت دیا۔ اقبال کی نظموں میں خوبصورت تشبیہیں ملتی ہے۔ بعض نظموں کے مکمل بند تشبیہات پر مشتمل ہیں۔ جیسے نظم جگنو کا یہ بند

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ — یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا — غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا — ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن کا

کچھ اور مثالیں:

چرخ نے بالی چرائی ہے عروس شام کی — نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیم خام کی
ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر — فیل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

تلمیحات:

آبتاؤں تجھ کو رمز آیہ انّ الملوک — سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری

ڈاکٹر یوسف حسین لکھتے ہیں "یہ بات دعوے سے کہی جاسکتی ہے کہ اس (اقبال) نے اپنے کلام میں زندگی کی نسبت میں جس قدر تشبیہیں' استعارے اور ترکیبیں استعمال کی ہیں ان کی مثال فارسی اور اردو کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتی (روح اقبال۔ ص 126)

روح اقبال میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے تقریباً 120 تراکیب درج کی ہیں۔ اقبال نے قرآن کی بعض آیتوں اور احادیث کا خوب صورت استعمال کیا جیسے:

حکمت و تدبیر سے یہ فتنۂ آشوب خیز ٹل نہیں سکتا و قدکم بہ تستعجلون
کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر چشم مسلم دیکھ لے تفسیرِ حرفِ یسئلون

رمز وایما کی بہترین مثال نظم ''شمع وشاعر'' ہے اور سہل ممتنع کی بہترین مثال ''ساقی نامہ'' ہے۔ اقبال کے یہاں نظم نما مسلسل غزلیں بھی ہیں جس کی ایک مثال دیکھیے:

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

نظموں میں رنگ تغزل ملتا ہے جیسے نظم ''شمع وشاعر'' کے شعر:

تھا جنھیں ذوق تماشا وہ رخصت ہوگئے لے کے اب تو وعدۂ دیدار عام آیا تو کیا
آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

غزل کے اشعار لگتے ہیں:

اقبال کے کلام میں صوتی آہنگ بھی ملتا ہے۔ ان کی نظم ''ایک شام'' میں وہ خاموشی کی تصویر لفظوں سے کھینچتے ہیں:

خاموش ہے چاندنی قمر کی شاخیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش کہسار کے سبزہ پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہوگئی ہے آغوش میں شب کے سوگئی ہے

'ش' کی تکرار سے ایک خاص فضا بنتی ہے اور خاموشی کا تاثر قائم ہوتا ہے۔ اقبال کی شاعری فکری، فنی اور معنوی اعتبار سے معجزہ فن کہلانے کے لائق ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اقبال نے اپنی شاعری میں فلسفیانہ مضامین سے گریز کیا ہے۔
2. اقبال کا کلام زبان و بیان کی خوبیوں سے عاری ہے۔
3. اقبال نے اپنی شاعری کو خشک اور بے رنگ ہونے نہیں دیا۔
4. اقبال نے تشبیہات، استعارات، رمز، کنایہ اور صنائع بدائع کا بالکل استعمال نہیں کیا۔

23.7 نظم ساقی نامہ

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں
فضا نیلی نیلی، ہوا میں سرور ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی بڑے پیچ کھاکر نکلتی ہوئی
رکے جب، تو سِل چیر دیتی ہے یہ پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ
ذرا دیکھ اے ساقیِ لالہ فام! سناتی ہے یہ زندگی کا پیام
پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز

وہ مے، جس سے روشن ضمیرِ حیات — وہ مَے، جس سے ہے مستیِ کائنات
وہ مَے، جس میں ہے سوز و سازِ ازل — وہ مَے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل
اٹھا ساقیا ! پردہ اِس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے
ہُوا اِس طرح فاش رازِ فرنگ — کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری، گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے
دلِ طور و سینا وفاراں دونیم — تجلّی کا پھر منتظر ہے کلیم
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش — مگر دل ابھی تک ہے زُنّار پوش
تمدّن، تصوّف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھوگئی — یہ اُمت روایات میں کھوگئی
لبھاتا ہے دِل کو کلامِ خطیب — مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اُس کا منطق سے سلجھا ہوا — لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد — محبت میں یکتا، حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھوگیا — یہ سالکِ مقامات میں کھوگیا
بجھی عشق کی آگ، اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

شرابِ کُہن پھر پلا ساقیا — وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا — مری خاک جگنو بنا کر اُڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر — جوانوں کو پیروں کا اُستاد کر
ہری شاخِ ملت ترے نم سے ہے — نفس اِس بدن میں ترے دم سے ہے
تڑپنے، پھڑکنے کی توفیق دے — دلِ مرتضیٰ، سوزِ صدیق دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر — تمنا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر — زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوز جگرِ بخش دے — مرا عشق، میری نظر بخش دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر — یہ ثابت ہے، تو اس کو سیّار کر
بتا مجھ کو اسرارِ مرگ و حیات — کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دِل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری، آرزوئیں مری — امیدیں مری، جستجوئیں مری
مری فطرت آئینہ روزگار — غزالانِ افکار کا مرغ زار

مرا دِل مری رزم گاہ حیات — گمانوں کے لشکر و یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی ! متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں بنوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹادے ' ٹھکانے لگا دے اسے

دما دم رواں ہے یمِ زندگی — ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود — کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دور
گراں گرچہ ہے صحبت آب و گل — خوش آئی اسے محنت آب و گل
یہ ثابت بھی ہے اور سیّار بھی — عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی
یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر — مگر ہر کہیں بے چگوں ' بے نظیر
یہ عالم ' یہ بت خانۂ شش جہات — اسی نے تراشا ہے یہ سومنات
پسند اس کو تکرار کی خو ' نہیں — کہ تو مین نہیں ' اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں — مگر عینِ محفل میں خلوت نشیں
چمک اس کی بجلی میں ' تارے میں ہے — یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے
اسی کے بیاباں ' اسی کے ببول — اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول
کہیں اس کی طاقت سے کہسار چُور — کہیں اس کے پھندے میں جبریل وحور
کہیں جُرہ شاہینِ سیماب رنگ — لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ
کبوتر کہیں آشیانے سے دور
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو ' راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اِس نے دیکھے ہیں پست و بلند — سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لیے برگ و ساز — سفر ہے حقیقت ' حضر ہے مجاز
الجھ کر سلجھنے میں لذت اِسے — تڑپنے ' پھڑکنے میں راحت اِسے
ہوا جب اِسے سامنا موت کا — کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اتر کر جہانِ مکافات میں — رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج — اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج
گل اِس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے — اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات — ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات
بڑی تیز جولاں ' بڑی زود رس — ازل سے ابد تک رمِ یک نفس
زمانہ کہ زنجیرِ ایّام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

یہ موجِ نفس کیا ہے ؟ تلوار ہے — خودی کیا ہے ؟ تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے ؟ رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے ؟ بیداریِ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تاب ناک — من و تو میں پیدا، من و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے ' اَبد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے ' نہ حد سامنے
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی — ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی — دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگ گراں — پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں
سفر اس کا انجام و آغاز ہے — یہی اس کی تقویم کا راز ہے
کرن چاند میں ہے، شرر سنگ میں — یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں
اسے واسطہ کیا کم و بیش سے — نشیب و فراز و پس و پیش سے
ازل سے ہے یہ کش مکش میں اسیر — ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دِل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تِل میں ہے

خودی کے نگہباں کو ہے زہرناب — وہ ناں جس سے جاتی رہے اُس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند — رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
فرو فالِ محمود سے درگزر — خودی کو نگہ رکھ ' ایازی نہ کر
وہی سجدہ ہے لائقِ احترام — کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام
یہ عالم ' یہ ہنگامۂ رنگ و صوت — یہ عالم ' کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم ' یہ بت خانۂ چشم و گوش — جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی ہے یہ منزلِ اولیں — مسافر ! یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اِس خاک داں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے، تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
خودی شیرِ مولا ' جہاں اُس کا صید — زمیں اس کی صید، آسماں اُس کا صید
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخیِ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار — کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار
تو ہے فاتحِ عالمِ خوب وزشت — تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت
حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ — حقیقت ہے آئینہ ' گفتار زنگ
فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس — مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس

اگر یک سرِ موے برتر پرم
فروغ تجلّی بہ سوزد پرم

23.7.1 ساقی نامہ کا تجزیہ

ساقی نامہ اقبال کی اہم نظم ہے۔تمام نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ صوری و معنوی اعتبار سے یہ ایک عمدہ نظم ہے۔ یہ نظم سات بند پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں موسم بہار کے دلکش ماحول اور رومانی فضا کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ دوسرے بند میں عصر حاضر اور مسلمانوں کے انحطاط کا مرثیہ..... تیسرے بند میں حرکت .....احیائے ملت کے لیے ولولہ و عزم نو' چوتھے بند میں کائنات زندگی کی ماہیت کا بیان' پانچویں بند میں زندگی کی خصوصیات' چھٹے بند میں خودی کی طاقت اور امکانات' ساتویں بند میں خودی کی صفات' پرورشِ خودی کی تلقین ہے۔ اس بند میں انھوں نے انسان سے خطاب کیا ہے۔

پہلے بند میں اقبال بہار کا منظر پیش کرتے ہیں۔ کاروانِ بہار خیمہ زن ہوا ہے اور دامن کوہسار جنت کا نمونہ بن گیا۔ طرح طرح کے پھول کھلے ہیں۔ فضا نیلی نیلی ہے اور ہوا میں ایک سرور ہے۔ کوہستانی ندی اچھلتی کودتی پہاڑوں کو چیرتی بہہ رہی ہے۔ یہ ندی حرکت اور زندگی کی علامت ہے۔ ایسے خوب صورت منظر میں وہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ مجھے ایسی شراب پلا دے جو حجاب کے پردوں کو جلا دے۔ وہ حجابات جو انسانی عقل اور حقیقت مطلق کے درمیان حائل ہیں۔ ایسی مئے جس کو پی کر وہ حقاق کائنات سے آگہی حاصل کرے اور حیات کے راز اس پر عیاں ہوں۔ ان رازوں کے انکشاف سے عشق الٰہی سے مخمور انسان میں ایسی طاقت آ جاتی ہے کہ وہ عناصر کائنات' مظاہر فطرت اور زماں و مکاں پر قابو پا لیتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے مولا شہباز سے ٹکرائے۔ بظاہر معمولی سا انسان (مولا) اتنی بڑی کائنات (شہباز) کو تسخیر کرنے کا عزم اپنے اندر پاتا ہے۔ یہ طاقت اسے عشق الٰہی کی وجہ سے آتی ہے۔

دوسرے بند میں وہ حالاتِ حاضرہ اور مسلمانوں کے موقف کو پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہر جگہ حرکت و انقلاب ہے۔ انسان کے طرز زندگی میں عظیم تبدیلیاں آئی ہیں۔ زمانے کا انداز بدل گیا۔ شاہی دور ختم ہوا۔ سرمایہ داری کی بنیادیں ہل گئیں۔ ملوکیت سے لوگ بیزار ہو گئے اس کی جگہ اشتراکیت نے لی۔ چین جو صدیوں سے بادشاہت کی لعنت میں گرفتار تھا وہاں ایک انقلاب رونما ہو گیا' فلسطین' شام' عراق اور حجاز مغرب کے خلاف لڑتے ہوئے تائید غیبی اور معجزے کے منتظر ہیں۔ مسلمان اس میں شک نہیں کہ توحید پرست ہے لیکن اس کے تمدن میں غیر اسلامی رسوم داخل ہو چکی ہیں۔ تصوف پر ویدانت کے فلسفے کا اثر ہے جو بے عملی اور ترک دنیا کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے' شریعت یعنی عقائد و عبادات پر بھی اسلامی باتیں اثر انداز ہو رہی تھیں جنھیں بعض جوازوں کے ساتھ قبول کیا جا رہا ہے۔ مسلمان فضول مسائل میں الجھ کر اپنا وقت اور طاقت برباد کر رہے ہیں۔ غیر اسلامی عقائد و افکار کی بنا پر مسلمان قوم اسلام کی روح یعنی عشق رسول سے بیگانہ ہوتی جا رہی ہے۔ عشق کی آگ سرد پڑ گئی ہے اور مسلمان راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئے ہیں۔

تیسرے بند میں اقبال پہلے تو یہ دعا کرتے ہیں کہ انھیں عشق رسول عطا ہو۔ پھر ملت کے جوانوں کے لیے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ انھیں حرکت و عمل کی توفیق دے' پھر وہ کہتے ہیں ان کے اندر جو عشق کی آگ ہے' جو بے خوابیاں ہیں' جو امنگیں جو آرزوئیں' جو امیدیں' جو جستجو' جو بے تابیاں ہیں یہی ان کا سب کچھ ہے۔ یہی ان کی دولت ہے اور اس دولت کو اپنی قوم پر لٹانا چاہتے ہیں تا کہ ان میں بھی وہ ساری خوبیاں پیدا ہو جائیں۔ وہ اپنی قوم کے لیے مٹ جانے کو تیار ہیں۔

چوتھے بند میں اقبال کہتے ہیں کہ زندگی ہر دم متحرک ہے۔ ہر شے میں ارتقائی عمل جاری ہے۔ اللہ نے زندگی اور کائنات دونوں کو ترقی پذیر بنایا ہے جس طرح شعلے میں دھوئیں کی موج چھپی ہوئی ہے اسی طرح زندگی کی وجہ سے جسم کا وجود ہے اور وہ نمو پا رہا ہے۔ جسم کے بغیر زندگی بھی ترقی نہیں کر سکتی۔ اقبال کہتے ہیں کہ زندگی ثابت بھی ہے اور سیار بھی ..... یعنی اس میں دو متضاد خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یعنی متحرک بھی ہے اور غیر متحرک بھی ..... زندگی عناصر میں گرفتار ہے اس لیے اس سے بیزار ہے۔ آب و گل یعنی مٹی اور پانی کی صحبت اسے گراں بھی گزرتی ہے لیکن پانی اور مٹی سے وہ محنت کر کے بہت کچھ پاتا بھی ہے۔ وحدت حیات کثرتِ مظاہر میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ دنیا جسے وہ بت خانہ شش جہت کہتے ہیں۔ حیات کی وجہ سے وجود میں آیا ہے۔ زندگی نے ہی عالم کے اس بت (سومنات) کو تراشا ہے۔ یعنی عالم ایک ایسا بت ہے جسے زندگی نے تراشا ہے۔ زندگی تکرار کو پسند نہیں کرتی۔ کوئی فرد کسی سے ملتا جلتا نہیں ہے۔ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ زندگی میں اتنا تنوع ہے۔ زندگی انجمن بھی ہے اور محفل میں خلوت نشیں بھی ہے۔ افراد کبھی انجمن بن جاتے ہیں کبھی بھیڑ میں تنہا ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے کئی رنگ ہیں۔ زندگی ہر شئے میں ہے بجلی' تارے' چاندی' سونے' پارے' بیاباں' ببول' کانٹے' پھول' کہسار' چڑیل' مور' شاہین' چکور' کبوتر سب کے سب زندگی کے مختلف مظاہر ہیں۔

پانچویں بند میں بھی وہ زندگی کی صفات بیان کرتے ہیں۔ وہ حرکت و عمل کا فلسفہ پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر شئے میں حرکت ہے اور ہر وجود نئی نئی شکلیں اور صورتیں اختیار کرتا ہے۔ یہ تغیر بھی حرکت کی دین ہے۔ جو لوگ زندگی کی حقیقت سے بے خبر ہیں وہ اسے ایک راز سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ

ہے کہ ذوق پرواز ہی زندگی ہے۔ زندگی ہر وقت سفر میں رہتی ہے اور مختلف منزلیں طے کرتی جاتی ہے۔ وہ کبھی حضر نہیں کرتی۔ حضر (قیام کرنا) سفر کی ضد ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ زندگی حضر میں ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ زندگی تصادم، ہنگامہ اور ٹکراؤ میں لذت محسوس کرتی ہے۔ زندگی اپنے ماحول سے جنگ کرتی ہے۔ مشکلات سے مقابلہ کرتی ہے۔ زندگی کی سب سے بڑی مخالف موت ہے۔ لیکن زندگی نے موت پر بھی بڑی حد تک قابو پالیا۔ یعنی ایسے خطرات جو موت کا باعث بن سکتے ہیں (جیسے درندے، زہریلے کیڑے، موسم کی سختیاں، امراض وغیرہ)۔ انسان کے پاس مذاق دوئی یعنی نر اور مادہ کا امتیاز بھی ہے، اس طرح اس نے زوج سے فوج تیار کرلی۔ زندگی بے ثبات نہیں ہے ایک نقش مٹتا ہے تو دوسرا ابھرتا ہے۔ یعنی کوئی مرتا ہے تو کوئی پیدا ہوتا ہے اس طرح زندگی جاری وساری رہتی ہے۔ زمانہ جسے کہتے ہیں وہ دراصل شب وروز کی ایک زنجیر ہے اسی طرح زندگی بھی دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے۔

چھٹے بند میں اقبالؔ خودی کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ زندگی کا سب سے اعلیٰ روپ خودی ہے۔ زندگی اگر تلوار ہے تو خودی تلوار کی دھار ہے۔ جس طرح دھار کے بغیر تلوار بے مصرف ہے۔ اسی طرح خودی کے بغیر زندگی بے معنی ہے۔ خودی کے بغیر کائنات بیدار نہیں ہوسکتی۔ کائنات کی خودی انسان یعنی اشرف المخلوقات ہے۔ انسان کو اپنی خودی پہچاننے کے لیے مراقبے یا دھیان گیان کی ضرورت ہوتی ہے جو صرف خلوت یعنی تنہائی ہی میں ممکن ہے۔ اس کے لیے مظاہر کائنات سے اپنا تعلق توڑ کر پوری توجہ اپنی ذات پر مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ انسان ایک بوند کی طرح ہے اور خالقِ کائنات سمندر ہے۔ پانی کی ایک بوند میں سمندر نظر آنے لگتا ہے پھر اندھیرے اجالے، میں اور تو کا فرق مٹ جاتا ہے اور سارے پردے جو درمیان میں حائل ہیں وہ ہٹ جاتے ہیں۔ خودی اگر درجہ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو پھر ساری حدیں مٹ جاتی ہیں۔ خودی زماں ومکاں کی قید میں رہ کر ترقی کرتی ہے اور جب نقطہ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو زماں ومکاں سے ماوراہو جاتی ہے لیکن اس نقطہ کمال کو پہنچنے کے لیے اسے کئی معرکے سر کرنے پڑتے ہیں۔ مسلسل سفر اسے قوت اور استحکام بخشتا ہے اور جب وہ قوت حاصل کرلیتی ہے تو پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرسکتی ہے۔ خودی کئی صورتوں میں موجود ہے لیکن اس کی کوئی صورت نہیں ہے وہ غیر مادی ہے۔ کبھی وہ چاند میں کرن بن کر، کبھی پتھر میں چنگاری بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ خودی ازل سے ارتقائی منزلیں طے کرتی آرہی ہے۔ آخر کار وہ خاک آدم میں صورت پذیر ہوئی۔ یہ سوال ذہن میں آسکتا ہے کہ خودی اگر لامحدود ہے تو پھر وہ کیسے انسان کے دل میں سما سکتی ہے؟ اقبال بڑی خوبصورت مثال دیتے ہیں۔ جس طرح آنکھ کی تل میں فلک سما سکتا ہے۔ اسی طرح انسان کے دل میں خودی سما سکتی ہے اور یہی اس کا نشیمن ہے۔

ساتویں بند میں اقبال پہلے چار اشعار میں خودی کی نگہبانی کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں خودی کی حفاظت کے لیے اکل حلال ضروری ہے۔ جس طرح زہر کھانے سے آدمی مرجاتا ہے اسی طرح لقمہ حرام کھانے سے خودی کی موت واقع ہوتی ہے۔ خودی کے استحکام کی دوسری شرط غیر اللہ کی غلامی سے پرہیز کرنا ہے۔ مسلمان صرف اللہ کو سجدہ کرے پھر اسے دوسروں کے سامنے سجدہ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ اللہ کے سوا دوسرے کو سجدہ کرنا حرام ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں یہ دنیا کے ہنگامے عارضی ہیں۔ یہ عالم جہاں زندگی کا مقصد صرف خورد ونوش (کھانا اور پینا) ہے۔ یہ کائنات خودی کی پہلی منزل ہے۔ یہ مستقل ٹھکانہ نہیں ہے۔ تو اس خاک دان سے آگ حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ دنیا تیرے لیے پیدا کی گئی ہے تو دنیا کے لیے نہیں پیدا کیا گیا۔ یہ کائنات اس لیے بنائی گئی ہے کہ تو اس کی تسخیر کرے۔ وہ کہتے ہیں کہ کائنات پر فتح حاصل کرکے آگے بڑھنا چاہیے۔ اور جہاں بھی ہیں جنھیں دریافت کرنا ہے ان پر یلغار کرنا ہے۔ اس کائنات میں جتنی چیزیں ہیں، جیسے رات اور دن، موسموں کی تبدیلی، نظام شمسی وغیرہ صرف اس لیے ہیں کہ تو اپنی خودی کی قوتوں کو استعمال کرکے اپنی چھپی ہوئی صلاحیتوں سے باخبر ہوکر اپنا مقام حاصل کرے۔ اقبالؔ انسان کو اس کی حقیقت بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو فاتح عالم ہے۔ تیری حقیقت کی وضاحت کے لیے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ حقیقت ایک آئینہ کی طرح ہے اور الفاظ زنگ کی طرح ہیں۔ تیری حقیقت بیان کرنے کی طاقت لفظوں میں نہیں ہے اگرچہ میں اسے سمجھ سکتا ہوں۔ اقبالؔ کا مقصد یہ ہے کہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہونا ہے تو خود اپنے من میں ڈوب جا۔ یعنی خدا کو دیکھنا چاہتے ہو تو خودی کو دیکھ لو..... اگر تو اپنی جستجو کرے گا تو وہ (خدا) تجھے مل جائے گا۔ **من عرف نفسه فقد عرف ربه**۔ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے گویا اپنے رب کو پہچان لیا

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ساقی نامہ میں کتنے بند ہیں؟

(ا) چھ (ب) سات (ج) پانچ (د) آٹھ

2. اقبال نے کس بند میں خودی کے بارے میں وضاحت کی؟

(ا) پہلے (ب) تیسرے (ج) دوسرے (د) چھٹے

3. خودی کی نگہبانی کے لیے کیا ضروری نہیں ہے؟

(ا) اکلِ حلال (ب) غیر اللہ کی غلامی سے پرہیز (ج) تسخیر کائنات (د) ابلیس کی پیروی

23.8 نظم شعاعِ امید

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز، کبھی صبح، کبھی شام
مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریِ ایام
نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ و آرام
پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیاباں و در و بام

.....

آفاق کے ہر گوشے سے اٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذتِ نظارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالم لاہوت ہے خاموش
پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپالے
اے مہرِ جہاں تاب! نہ کر ہم کو فراموش

.....

اک شوخ کرن، شوخ مثال نگہِ حور
آرام سے فارغ، صفتِ جوہرِ سیماب
بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پروین ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک، کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غوّاصِ معانی
جن کے لیے ہر بحرِ پرآشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بے گانۂ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلمانِ تہہِ محراب

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

23.8.1 شعاعِ امید کا تجزیہ

اقبال کی یہ نظم تمثیلی ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے یہ ایک رجائی نظم ہے۔ اس نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ مایوسی اور ناامیدی سب سے بڑا گناہ ہے۔ تاریکی ہمیشہ نہیں رہتی ایک نئی صبح ضرور آتی ہے۔ اس نظم کو اقبال نے ڈرامائی انداز میں پیش کیا۔ یہ نظم مکالماتی انداز میں لکھی گئی ہے۔ سورج نے اپنی شعاعوں سے یہ کہا کہ اگرچہ تم عرصہ دراز سے دنیا والوں کو فیض پہنچا رہی ہو لیکن وہ تمھاری کوئی قدر نہیں کرتے۔ دنیا والے تمھارے ساتھ بے مہری کا سلوک کر رہے ہیں۔ نہ ریت کے ذروں پر چمکنے سے کوئی راحت ہے نہ پھولوں کا طواف کرنے سے کوئی آرام ہے اس لیے تم ان باغوں، بیابانوں کو چھوڑ دو اور واپس میرے دل میں سما جاؤ۔ اس حصے میں سورج کی ناامیدی کا اظہار ہے۔

دوسرے بند میں شعاعیں سورج کے حکم کی تکمیل کرتی ہیں۔ وہ سورج میں سما جاتی ہیں۔ ساری دنیا میں ایک شور اٹھتا ہے۔ ہر طرف مایوسی اور ناامیدی ہے کہ مغرب سے اجالے کی توقع رکھنا بیکار ہے کیونکہ مغرب والوں نے خدا سے منھ موڑ کر صرف مادی ترقی کو مقصدِ حیات بنالیا ہے۔ سارا مغرب مشینوں کے دھویں میں ڈوبا ہوا ہے۔ یعنی صنعتی ترقی کا غلام ہو کر رہ گیا ہے۔ انسان اور انسانی جذبات کی کوئی قدر نہیں ہے۔ ادھر مشرق کا حال بھی کچھ اچھا نہیں ہے۔ یہاں خدا پر ایمان اور مذہب کی اہمیت ضرور ہے لیکن موت کی خاموش چھائی ہوئی ہے کوئی حرکت وعمل نہیں ہے۔ مغربی اقوام ایمان کی حرارت سے اور مشرقی قومیں حرکت وعمل سے محروم ہیں۔ اس لیے شعاعیں کہتی ہیں کہ ان حالات میں ہمارا چمکنا بے معنی ہے۔ اے جہاں کو روشن کرنے والے آفتاب ہمیں اپنے سینے میں چھپالے۔

جب شعاعوں نے آفتاب کی خدمت میں عرض حال رکھا تو ایک شوخ کرن جو حور کی طرح خوب صورت اور پارے کی طرح چنچل تھی بولی کہ مجھے آزاد ہی رکھیے۔ جب تک مشرق کا ذرہ ذرہ نہ چمکنے لگے میں ہند کی تاریک فضا کو نہیں چھوڑوں گا۔ جب تک ہند کے لوگ خواب غفلت سے بیدار نہ ہوں گے میں اپنی روشنی بکھیرتی رہوں گی۔ مشرقی ممالک کی امیدوں کا مرکز یہی ہند ہے اسی ہند کو اقبالؔ نے اپنے اشکوں سے سیراب کیا ہے۔ یعنی اس ملک کی فکر میں آنسو بہائے ہیں۔ اس قوم کو جگانے کے لیے سارا زور صرف کیا ہے۔ اسی کی خاک سے چاند و پروین کی آنکھیں روشن ہیں۔ اس کی خاک کا ہر سنگریزہ کسی نایاب موتی سے کم نہیں ہے۔ اسی خاک سے کئی بڑے بڑے مہاتما' فلاسفر اور حکما پیدا ہوئے۔ اس سرزمین پر مذہب کا ساز بڑی دلکشی سے بجتا تھا۔ اس کے نغموں سے دلوں میں حرارت تھی۔ یعنی ہندوستان میں مختلف مذاہب آئے۔ یہاں کے لوگوں نے مذاہب کا احترام کیا۔ اپنے مذہب کے سچے پیرو ثابت ہوئے۔ دلوں میں خوف خدا تھا۔ اب یہ حالت ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں اپنے فرائض کو بھول گئے۔ ایک طرف برہمن بت خانے کے دروازے پر سو رہا ہے تو دوسری طرف مسلمان مسجد میں اپنی تقدیر پر رو رہا ہے۔ ایک غافل ہے تو دوسرا عمل وحرکت سے بے گانہ ہے۔ نتیجے میں غیروں کی غلامی کر رہا ہے۔ اس صورت حال کے باوجود اقبالؔ مایوس نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نہ مشرق سے بے زار ہونے کی ضرورت ہے اور نہ مغرب سے دور بھاگنے کی..... جس طرح ہر شب کے بعد سحر ہوتی ہے۔ ہر تاریکی کے بعد روشنی ہوتی ہے اس طرح مغرب و مشرق دونوں راہ راست پر آجائیں گے۔ اقبالؔ اس نظم میں ہندوستان سے غیر معمولی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ساری دنیا کو سلامتی حرکت وعمل کا پیغام دینے والے ہندوستان سے ہی اٹھیں گے۔ ہندوستان ہی ساری دنیا کی رہنمائی کرے گا اور دنیا کو تاریکی کے غار سے نکالے گا۔ اقبالؔ کے یہاں مشرق اور مغرب کی بھلائی کی توقع کے ساتھ مذہبی رواداری بھی ملتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

اس نظم کا مرکزی خیال

1. مادی ترقی کو مقصدِ حیات بنانا ہے۔
2. خدا پر ایمان اور مذہب کی اہمیت سے انکار ہے
3. مایوسی اور ناامیدی سب سے بڑا گناہ ہے
4. مشرقی ممالک کی امیدوں کا مرکز ہندوستان نہیں ہے۔

23.9 نظم فنونِ لطیفہ

اے اہلِ نظر! ذوقِ نظر خوب ہے' لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے' وہ نظر کیا؟

مقصودِ ہُنر' سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس' یا دو نفس' مثلِ شرر کیا؟

جس سے دِلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں! وہ صدف کیا؟ وہ گُہر کیا

شاعر کی نوا ہو' کہ مغنّی کا نَفَس ہو
جس سے چمنِ افسردہ ہو' وہ بادِ سحر کیا؟

بے معجزہ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا' وہ ہُنر کیا؟

23.9 فنون لطیفہ کا تجزیہ

علامہ اقبال نے ایک مختصر سا مضمون لکھا تھا جس کا عنوان ''رسول اللہ صلعم فن شعر کے مبصر کی حیثیت میں'' (مطبوعہ ستارہ صبح' کرم آباد' مورخہ 8 اگست 1917ء) اس مضمون میں آپ نے یہ حقیقت واضح کی کہ حضورؐ نے وقتاً فوقتاً اپنے عہد کی عربی شاعری کے متعلق جن ناقدانہ خیالات کا اظہار فرمایا وہ مسلمانوں کے لیے ہمیشہ ادبی نصب العین کی دلیل راہ رہیں گے۔ اس مضمون میں اقبالؔ نے لکھا کہ حضور صلعم کے نزدیک آرٹ' حیات انسانی کا تابع ہے۔ جو آرٹ انسان کو کاہلی' جمود' عیاشی سے نفرت دلا کر محنت و مشقت اور اکلِ حلال کی ضرورت کی طرف متوجہ کرتا ہے وہی آرٹ قابل قدر ہے۔

اس نظم میں اقبالؔ نے آرٹ کے بارے میں اپنے نظریے کو پیش کیا ہے۔ وہ کہتے کہ فن کی تحسین تو بہت خوب ہے۔ ذوق نظر پیدا کرنا بھی بہتر بات ہے لیکن اگر یہ نظر شئے کی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتی تو بے کار ہے۔ ہنر کا مقصد سوز حیات ابدی ہے۔ یعنی ایسا ہنر جو ابد تک قائم رہ سکے۔ ایسا نہیں کہ چنگاری کی طرح چمکا اور ایک دو سانس لے کر ختم ہو گیا۔ ایسا فن اسی وقت پیدا ہو سکتا جب وہ حیات انسانی کا تابع ہو۔ فن کا مقصد خودی کو پختہ رنگ دینا ہونا چاہیے۔ اقبالؔ اس بات کے قائل ہیں کہ دل دریا میں تلاطم پیدا ہو۔ یعنی دلوں میں ولولہ اور جوش پیدا کرنے والا ہنر ہو۔ کہا جاتا ہے کہ جب بارش ہوتی ہے تو سیپ اپنا منہ کھول دیتی ہے اور قطرہ نیساں اس میں پہنچتے ہی وہ بند ہو جاتی ہے۔ اور سمندر کی تہہ میں بیٹھ جاتی ہے۔ وہ قطرہ' صدف بنتا ہے۔ اقبالؔ ایسے صدف اور گہر کے قائل نہیں ہیں۔ وہ فن کی خوبصورتی کے نہیں مقصدیت کے حامی ہیں۔ وہ ایسا فن چاہتے ہیں جو دلوں میں طوفان پیدا کرے۔ شاعری ہو کہ موسیقی وہ انسان میں جدوجہد کا جذبہ پیدا کرے۔ ایسی ہوا جو چمن کو افسردہ کرتی ہو وہ اس کے خلاف ہیں۔ ایسی شاعری ایسی موسیقی جو تھپک تھپک کر سلادے اور دلوں میں افسردگی پیدا کرے اقبالؔ اس کے سخت خلاف ہیں۔ جب تک قومیں کوئی معجز نہیں کر دکھاتیں انھیں سربلندی عطا نہیں ہو سکتی۔ یعنی ناممکن کو ممکن کر دکھانا ضروری ہے۔ ایسا ہنر جو ضرب کلیمی کی طاقت رکھتا ہو' وہی اصل ہنر ہے۔ اقبالؔ چاہتے ہیں کہ ہنر میں وہ رنگ پیدا ہو کہ راستے کے جس پتھر پر اپنا عصا مارے اس سے ہزاروں چشمے پھوٹ نکلیں۔ سنگلاخ زمینوں سے چشمے نکالنا مقصود ہنر ہو۔ اور یہ اس وقت ممکن ہے جب انسان خودی میں ڈوب کر اپنی مخفی صلاحیتوں کو بروے کار لائے۔ اقبال اپنی بات کہنے کے لیے تخلیقی زبان کا استعمال کرتے ہیں وہ شرر' دریا' تلاطم' قطرہ نیساں' صدف گوہر' چمن' بادِ سحر اور ضرب کلیمی کو بالکل نئے معنی دیتے ہیں۔ اپنی بات کو انھوں نے مختلف انداز سے بار بار پیش کیا ہے:

ہزار چشمے ترے سنگ راہ سے پھوٹیں
خودی میں ڈوب کر ضربِ کلیم پیدا کر

غرض اقبالؔ ایسے ہنر کی تخلیق کے قائل ہیں جسے حیات ابدی حاصل ہو جو دلوں میں ولولہ پیدا کرے۔ وہ چمک دمک و خوب صورتی کے نہیں بلکہ تلاطم کے طرف دار ہیں۔ وہ افسردگی کے نہیں امید افزا جدوجہد چاہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جب تک قومیں کوئی معجزہ نہیں دکھاتیں۔ دنیا میں ان کا نام نہیں ہوتا۔ جس طرح موسیٰ نے اپنے عصا کے ذریعہ معجزے دکھائے تھے۔ اسی طرح قوم بھی اپنی مخفی صلاحیتوں کو پہچان کر عصا کی طرح معجزے دکھائے۔ اقبالؔ خودی کی پہچان' حرکت' عمل اور جدوجہد کا پیغام دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہنر کا مقصد بھی یہی پیغام ہو۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. خانہ پُری کیجیے۔

الف۔ اے.....ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ.....وہ نظر کیا

ب۔ مقصود ہنر.....حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس.....کیا

ج۔ شاعری.....ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ.....کیا

د۔ بے معجزہ دنیا میں.....نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں.....وہ ہنر کیا!

23.10 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال کی حیات کے بارے معلومات حاصل کیں۔

اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ایم۔اے (فلسفہ) پاس کیا اور میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی۔ انھیں سر کا خطاب دیا گیا۔

اقبال نے تین شادیاں کیں۔ اردو میں ان کی شاعری کے چار مجموعے بانگ درا، بال جبرئیل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز شائع ہوئے۔ فارسی کے شعری مجموعوں میں اسرار خودی، رموز بے خودی، پیام مشرق، زبور عجم اور جاوید نامہ قابل ذکر ہیں۔

اقبال کے پہلے شعری مجموعے بانگِ درا میں حسن فطرت سے دلچسپی اور حب الوطنی کے جذبات نمایاں ہیں۔ بال جبرئیل میں مفکرانہ، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کی نظموں پر ڈرامائی رنگ اور خطابت حاوی ہے۔

اقبال کی شاعری میں جو فلسفہ ملتا ہے اس کے اہم نکات خودی، عشق، فقر، عمل، ہیں۔ اقبال کا تصوراتی انسان ''مردِ مومن'' ہے اقبال سوز و خلوص پر بھی زور دیتے ہیں اسے وہ خون جگر سے تعبیر کرتے ہیں۔

اقبال کے کلام میں فلسفے کے ساتھ ساتھ فن شاعری کی ساری خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کو خشک اور بے رنگ ہونے نہیں دیا۔ نادر تشبیہات، رمز، کنایہ، صنائع و بدائع کے استعمال میں انھوں نے کمالِ فن کا ثبوت دیا ہے۔ اقبال نے جتنی تراکیب استعمال کی ہیں اس کی مثال کسی اور اُردو شاعر کے یہاں کم ہی ملتی ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں قرآنی آیتوں اور احادیث کا بھی خوبصورت استعمال کیا ہے۔

''ساقی نامہ'' اقبال کی ایک اہم نظم ہے۔ اس میں اقبال کا پورا فلسفہ سمٹ آیا ہے۔ ''شعاع امید'' تمثیلی نظم ہے۔ اس نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ مایوسی اور ناامیدی سب سے بڑا گناہ ہے۔ ہر تاریکی کے بعد روشنی ضرور آتی ہے۔

23.11 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس سطروں میں دیجیے۔

1. اقبال کی حیات اور کارنامے قلم بند کیجیے۔
2. اقبال کی نظم نگاری کا احاطہ کیجیے۔
3. اقبال کی شاعری میں جو فلسفہ ملتا ہے اس کی وضاحت کیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. اقبال کی شاعری کی خصوصیات تحریر کیجیے۔
2. نظم ''شعاع امید'' کی تشریح کیجیے۔
3. نظم ''ساقی نامہ'' کا مرکزی خیال کیا ہے؟

23.12 فرہنگ

الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی
اَبد	=	انتہا۔ ہمیشہ کے لیے	اِرم	=	خوبصورت باغ۔ شداد کی جنت	اَزَل	=	ابتدا۔ آغاز
بے نمود	=	ظاہر نہ ہونا	بے مہریٔ ایام	=	دنوں کی بے رحمی	بیابان	=	جنگل

پَرم = بہترین، افضل، عمدہ پُرآشوب = فتنہ انگیز۔فساد سے بھرا ہوا پایاب = حاصل کرنا

تجلی کدۂ دل = دل، جہاں نور رہتا ہے تقویم = قائم کرنا تنویر = روشنی، نور، چمک

تلاطم = موجوں کا زور، جوش، ولولہ بپا کرنا چشم وگوش = دیکھنا اور سننا چنگ = ایک قسم کا ساز

حرہ = عرب میں وہ علاقہ جن میں سیاہ ٹوٹے ہوئے پتھر پائے جاتے ہیں خاور = مشرق

حضر = سفر کی ضد۔اپنے گھر یا شہر میں مقام کرنا حیات ابدی = ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی خوب وزشت = اچھا و برا

ناصبور = بے چین درو بام = دروازہ و اونچائی (چھت) درناب = قیمتی موتی

رمِ زندگی = زندگی سے بھاگنا ریگ رواں = ریت

زنار = وہ دھاگا جو ہندو گلے میں اور بغل کے نیچے پہنتے ہیں، وہ دھاگا جو عیسائی، یہودی اور مجوسی کمر میں باندھتے ہیں

زہرناب = کاٹنے والا زہر زوج = جوڑا۔بیوی خاوند میں سے کوئی ایک

سوزجگر = جگر کی آگ سنگ گراں = بھاری پتھر سرنوشت = ابتدائی تحریر

سیماب = پارہ شرر = چنگاری شہباز = ایک پرندہ

صبا = مشرقی ہوا صدف = سیپ صید = قید

ضرب کلیمی = موسیٰ کا عصا سے چوٹ لگانا طیور = پرندے طوف = طواف کرنا۔گرد پھرنا

عالم لاہوت = عالم ذات الٰہی جہاں سالک کو مقام فنا فی اللہ حاصل ہوتا ہے غزالاں = ہرنیاں

غواص = غوطہ خور فرنگی = یورپ کا باشندہ گراں خواب = غافل۔گہری نیند سونے والا

گہر = موتی متاع = جائیداد مرغزار = کھیت

مضراب = وہ لوہے کا مثلثی ٹکڑا جس سے ستار بجایا جاتا ہے مغنی = گویا

معجزہ = وہ کام کرنا جو انسانی قوت سے باہر ہو مہ وپروین = چاند اور ستارہ

مملہ = ایک چھوٹا پرندہ جس کے پیٹ پر کالی دھاریاں ہوتی ہیں نفس = سانس۔دم۔لمحہ

مئے پردہ سوز = ایسی شراب جو پردوں کو جلا دے نالہ نیم شب = آدھی رات کو کی جانے والی دعا نوا = آواز، صدا

23.13 سفارش کردہ کتابیں

1. شاعر (بمبئی) اقبال نمبر
2. مولانا عبدالمجید سالک ذکر اقبال
3. ڈاکٹر یوسف حسین خاں روحِ اقبال
4. خلیفہ عبدالحکیم فکرِ اقبال

اکائی: 24 اختر شیرانی۔ حیات، کارنامے اور نظم نگاری

ساخت

24.1 تمہید

24.2 اختر شیرانی کا عہد

24.3 اختر شیرانی کے حالات زندگی

24.3.1 شخصیت

24.4 اختر شیرانی کی غزل گوئی

24.5 اختر شیرانی کی نظم نگاری

24.5.1 مذہبی اور اخلاقی نظمیں

24.5.2 تاریخی، سماجی اور اصلاحی نظمیں

24.5.3 قومی و سیاسی نظمیں

24.5.4 بچوں اور عورتوں کے لیے نظمیں

24.6 اختر شیرانی کی نظموں کا فنی جائزہ

24.6.1 اختر شیرانی کی جمالیات پرستی

24.6.2 اختر شیرانی کی فطرت پرستی

24.6.3 اختر شیرانی کی نظموں کی لفظیات

24.6.4 اختر شیرانی کی نظموں کی ہیئت

24.6.5 ماہیا

24.6.6 گیت

24.7 نظم: اے عشق کہیں لے چل

24.7.1 نظم اے عشق کہیں لے چل کا جائزہ

24.8 نظم: او دیس سے آنے والے بتا

24.8.1 نظم او دیس سے آنے والے بتا کا جائزہ

24.9 نظم: آخری امید

24.9.1 نظم آخری امید کا جائزہ

24.10 خلاصہ

24.11 نمونہ امتحانی سوالات

24.12 فرہنگ

24.13 سفارش کردہ کتابیں

24.1 تمہید

شاعری کی مختلف اصناف میں نظم نگاری کو ایک اہم صنف کا درجہ حاصل ہے۔اس صنف پر مختلف تحریکات کے اثرات مرتب ہوئے۔مولانا حالی کے دور میں اردو نظم پر نیچرل شاعری کا اثر رہا۔جس کے بعد ترقی پسند تحریک نے نظم کو متاثر کیا۔اردو نظم کو فروغ دینے والے ایسے شاعروں کے کارناموں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جنھوں نے شاعری کی نمائندگی کرتے ہوئے نظم نگاری میں رومانویت اور جمالیات کو شامل کیا۔اردو کی رومانوی تحریک سے وابستہ شاعروں میں اختر شیرانی کا شمار ہوتا ہے۔یہ اردو کے نامور محقق حافظ محمود شیرانی کے بیٹے تھے جنہوں نے اردو نظم نگاری میں بہ حیثیت رومانوی شاعر اختر شیرانی کے نام سے شہرت حاصل کی۔ان کی شاعری رومانویت اور حسن و جمال پرستی کی مظہر ہے۔وہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے بے باکی کے ساتھ اپنی محبوباؤں کے نام سے نظمیں لکھیں۔رومانوی جذبات کی عکاسی میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔نظم نگاری کو مختلف بند اور ہیئتوں سے وابستہ کر کے اختر شیرانی نے نظم میں گیت کا حسن پیدا کیا ہے۔

24.2 اختر شیرانی کا عہد

اختر شیرانی کے دور میں اکثریت کے غیر معمولی دباؤ کے زیر اثر 1911ء میں حکومت نے تقسیم بنگال کا اقدام واپس لے لیا۔1914ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔لاکھوں ہندوستانی جبری طور پر فوج میں بھرتی کر کے محاذ پر بھیج دیے گئے۔برطانوی اقتدار میں صنعتوں کو فروغ حاصل ہوا اور کسانوں کی بدحالی کا آغاز ہوا۔ان حالات نے ہندوستانیوں میں بے چینی پیدا کردی۔1917ء میں ''ہوم رول لیگ'' کے نام سے دو جماعتیں وجود میں آئیں۔ایک کی قیادت مسز اینی بیسنٹ کر رہی تھیں جب کہ دوسری جماعت کے رہنما بال گنگا دھر تلک تھے۔ہوم رول ہندوستان کی آواز بن گئی۔نومبر 1918ء میں پہلی جنگ کا خاتمہ ہوا۔1918ء میں رولٹ ایکٹ کے اصولی نفاذ کی ابتدا کی گئی۔ہندوستانی اب برطانوی وعدے کی تکمیل کے منتظر تھے۔جنگ کے بعد کے مراعات عطا کرنے کے بجائے رولٹ ایکٹ مسلط کیا گیا۔12،اپریل کو جلیان والا باغ کا حادثہ پیش آیا۔برطانیہ نے ترکوں کے سامنے ذلت آمیز شرائط رکھ کر وعدہ خلافی کی جس کی وجہ سے مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی نے خلافت تحریک شروع کردی۔مہاتما گاندھی نے اس تحریک کی حمایت کا اعلان کیا۔31 اگست 1920ء کو ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی جس کے ذریعہ سرکاری خطابات' کونسل اور عدالتوں کا بائیکاٹ کیا گیا۔پہلی جنگ عظیم کے بعد کامریڈ لینن کی سرکردگی میں روس کے مارکسسٹ نظریات رکھنے والوں نے زار شاہی کا خاتمہ کیا۔اور اشتراکی تحریک کے نظریات ہندوستان میں قدم جمانے لگے۔خلافت تحریک کی ناکامی کے بعد ہندوستان میں کانگریس اور اشتراکی نظریات کا دور دورہ رہا۔کانگریس نے ملک میں سیول نافرمانی کی تحریک چلائی۔نمک کے قانون کو توڑا گیا۔1930 میں کانگریس کی قیادت میں یوم آزادی منایا گیا۔کانگریس قائد گرفتار ہوئے۔مہاتما گاندھی نے ہریجنوں کو ہندوؤں سے وابستہ رکھنے کی تحریک چلائی۔1935ء میں انڈیا ایکٹ نافذ ہوا۔دوسری جنگ عظیم کا آغاز یکم ستمبر 1939ء کو پولینڈ پر ہٹلر کے حملے سے ہوا۔امریکہ۔روس اور برطانیہ نے اس کی مخالفت کی۔ہندوستان میں کانگریس نے ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک چلائی۔غرض کئی قربانیوں کے بعد 1947ء میں ملک کو آزادی حاصل ہوئی۔آزادی کے فوری بعد ملک میں فسادات پھوٹ پڑے۔ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔اختر شیرانی نے اپنے عہد میں ان تمام سماجی' سیاسی اور معاشرتی حالات کا مقابلہ کیا۔جس کا اثر ان کی شاعری پر ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. پہلی جنگ عظیم کب شروع ہوئی اور کب ختم ہوئی؟
2. زار شاہی کا خاتمہ کب ہوا؟
3. دوسری جنگ عظیم کب شروع ہوئی؟

24.3 اختر شیرانی کے حالات زندگی

اختر شیرانی کا پورا نام محمد داؤد خاں تھا۔ان کے والد حافظ محمود شیرانی اردو کے صاحب طرز ادیب اور لسانیات کے ماہر تھے۔ان کا خاندان پٹھانوں

کے مشہور قبیلے شیرانی سے تعلق رکھتا تھا۔ سرحدی پٹھانوں کا یہ قبیلہ ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے متصل جنوبی وزیرستان میں آباد تھا۔ حافظ محمود شیرانی کے والد ریاست ٹونک کے ملازم تھے۔ اختر شیرانی 4 مئی 1905 کو ٹونگرہ نامی گاؤں میں پیدا ہوئے جو ریاست ٹونک کا ایک حصہ تھا۔ محمد داؤد خاں شیرانی کی پیدائش کے وقت حافظ محمود شیرانی انگلستان میں تھے۔ ان کی پرورش داستانوی انداز میں شہزادوں جیسی ہوئی۔ کم عمری میں شاعری کی طرف راغب ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم قرآنِ شریف کی تلاوت سے گھر پر شروع کی۔ بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ ابتدا میں صابر علی شاکر سے کلام پر اصلاح لی۔ لڑکپن سے ہی وہ عاشق مزاج اور حسن پرست واقع ہوئے تھے۔ جس کا مکمل اظہار ان کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔ ان کی ابتدائی زندگی امیرانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ گزری۔ 1921ء میں اپنے والد کے ساتھ لاہور منتقل ہوئے۔ علامہ تاجور نجیب آبادی سے مشورہ سخن کیا۔ اختر شیرانی نے لاہور آنے کے بعد 1921ء میں اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ اسی سال منشی فاضل کا امتحان اچھے نمبروں سے کامیاب کیا۔ اگلے سال اسی کالج سے ادیب فاضل میں کامیابی حاصل کی۔ بعد میں میٹرک بھی کر لیا۔ کوئی اعلیٰ سند نہ ہونے کے باوجود انھیں انگریزی ادب میں اچھی دستگاہ حاصل تھی۔ اردو کے رومانوی شاعروں میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ ساری زندگی مے نوشی رومانی اور جمالیاتی خیالات کی پیش کشی کے لیے وقف کر دی۔ ان کی شاعری رومانوی احساسات کی نمائندہ ہے۔ ان کی نظموں میں فریفتگی کا نرالا انداز اور وارفتگی کا حسین طرز دکھائی دیتا ہے۔ ان کے آٹھ شعری مجموعے اور خطوط کا ایک مجموعہ یادگار ہیں۔ ان کے شاعری کے مجموعے: (1) شعرستان (2) صبح بہار (3) نغمۂ حرم (4) طیور آوارہ (5) اخترستان (6) شہنور (7) لالۂ آوارہ (8) شہناز کے نام شائع ہو چکے ہیں۔ رومانوی شاعری کے چراغ جلا کر اختر شیرانی نے 1948ء میں بمقام لاہور اس دار فانی سے کوچ کیا۔

24.3.1 شخصیت

حافظ محمود شیرانی کے گھر میں پیدا ہونے والے اختر شیرانی کی پرورش شاہانہ انداز میں ہوئی۔ پیدائش سے لے کر سات سال کی عمر تک ان کے والد انگلستان کے دورے پر رہے۔ ابتدائی تعلیم مذہبی انداز سے ہوئی۔ حافظ محمود شیرانی جب ہندوستان لوٹے تو پہلی جنگ عظیم کی شروعات ہو چکی تھی۔ محمود شیرانی نے وطن ٹونک لاہور منتقل ہونے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اختر شیرانی اپنے والد کے ساتھ لاہور منتقل ہوئے۔ انھیں لاہور سے بے انتہا محبت رہی۔ گھریلو ماحول میں مذہبی پابندیوں نے انھیں مجبور رکھا اور جب باہر کی دنیا کو آنکھیں کھول کر دیکھا تو آزادانہ روش نے متوجہ کیا۔ بچپن ہی سے رومان پرست واقع ہوئے تھے۔ آزادانہ ماحول میں مے نوشی کو شغل بنا لیا۔ کئی خواتین سے اپنی ذات کو وابستہ کیا۔ سلمٰی سے محبت میں ناکامی کے بعد اختر شیرانی نے کئی عشق کیے۔ سب میں ناکام رہے۔ ان کی شخصیت میں چھپا ہوا حسن کار شاعری کے اندر نمودار ہونے لگا۔ سلمٰی سے پہلے عشق کی یاد ان کی شاعری میں جگہ جگہ اثر دکھاتی ہے۔

عورت کے حسن اور اس کی جمالیات کا بیان اختر شیرانی کی کمزوری ہے۔ وہ سلمٰی کے حوالے سے نسوانی حسن میں ڈوب کر جو جوہر دکھائے ہیں، وہ ملاحظہ ہو:

تم چاند سے بڑھ کر روشن ہو، زہرہ کی قسم تاروں کی قسم
تم پھول سے بڑھ کر رنگیں ہو، فطرت کے چمن زاروں کی قسم
تم سب سے حسیں ہو دنیا کی، دنیا کے حسیں نظاروں کی قسم
دنیا سے نفرت کرتا ہوں، میں تم سے محبت کرتا ہوں

جمالیات میں خاص طور پر عورت کے حسن کی تعریف اور بے باکانہ طور پر خواتین کا نام لے کر عشق کا اظہار اختر شیرانی کا وصف ہے۔ بے شمار خواتین سے اپنے جذباتی اظہار کو نمایاں کرتے ہوئے اختر شیرانی نے ''عذرا'' کے حسن کو اس طرح پیکر میں ڈھالا ہے:

بہار و خواب کی تنویر مرمریں عذرا — شراب و شعر کی تفسیر دل نشیں عذرا
دل و دماغ کو سرشار کر دیا تو نے — شباب و عشق کو بیدار کر دیا تو نے
میری حسیں، مری ناز آفریں عذرا

اختر شیرانی کی شخصیت میں افلاطونی عشق اور جنسی محبت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ہر عورت کو ٹوٹ کر چاہنے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اپنی شخصیت کو اختر شیرانی نے عشق کی سرمستی سے وابستہ رکھا۔ ان کی شاعری پر شخصیت کا پرتو اس قدر ہے کہ وہ اپنی تمام تر شاعری کو حسن نسوانی، حسن کی تحسین، ماورائیت، جوشِ عشق، دنیا سے بیزاری اور خیالی بہشتوں کی تعمیر کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری پر جمالیات پرست شخصیت کا غلبہ رہا۔ ان کی شاعری میں جمال پرست فنکار اپنی شخصیت کا رنگ بھر کر شاعری کو زندگی کا عکاسی بنا دیتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اختر شیرانی کے حالات بیان کیجیے۔
2. اختر شیرانی کے مجموعوں کے نام بتائیے۔
3. اختر شیرانی کی شخصیت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

24.4 اختر شیرانی کی غزل گوئی

اختر شیرانی کو رومانی نظم نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی لیکن ان کے شعری مجموعوں میں غزلوں کی کمی نہیں۔ اگر چند رباعیوں اور کچھ ماہیوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو ان کا شعری مجموعہ ''طیور آوارہ'' صرف غزلوں پر مشتمل ہے۔ ''شہناز'' اور ''شہزوو'' میں بھی قابل ذکر تعداد میں غزلیات موجود ہیں۔ اختر شیرانی کی غزلوں میں روایتی مضامین جابجا دکھائی دیتے ہیں اور بیشتر نظموں میں باندھے گئے مضامین بھی غزلوں میں در آتے ہیں۔ نظموں کے مقابلے میں ان کی غزلیات میں خمریات کا نمایاں حصہ ہے۔ غزل میں شراب کا ذکر وہ بڑی سرمستی کے عالم میں کرتے ہیں بلکہ چند مکمل غزلیں تو شراب اور اس کے متعلقات و کیفیات کے بیان پر مشتمل ہیں۔ ان کی غزلوں کے مصرعے ''مستانہ پیے جا یونہی مستانہ پیے جا''، ''عید آئی ہے کہ آ کہ ساقی عید کا ساماں کریں''، ''پلائے جا، پیے جا خوب ساقی'' وغیرہ غزلیں ساری کی ساری خمریات پر مشتمل ہیں۔ دوسری غزلوں میں بھی کثرت سے جابجا ساقی، مے اور میخانہ کا ذکر ملتا ہے۔ اختر جب غزل میں شراب کا ذکر کرتے ہیں تو ان پر ایک از خود وارفتگی کا عالم چھا جاتا ہے۔ شراب کی طلب میں بے صبری، اعجازِ مے کا اعتراف اور اس میں ڈوبے رہنے کی آرزو ان کی خمریات کی خصوصیات ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

دو چاند ہیں پہلو میں، اب چاند کہیں کس کو — ساقی کو اگر کہیے، پیمانے کو کیا کہیے

.....

میکدہ میں اب بھی ذکر آتا ہے مے نوشی کے وقت — کیا خبر تھی، اختر اتنا پارسا ہو جائے گا

.....

بجا کہ ہے پاسِ حشر ہم کو کریں گے پاسِ شباب پہلے — حساب ہوتا رہے گا یارب! منگا دے ہم کو شراب پہلے

زندگی کی مسرتوں کو سینے میں بھر لینے اور فرصتِ مختصر سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونے کی آرزو اختر شیرانی کی غزلوں میں جابجا نظر آتی ہے:

کچھ اڑا لو مزا جوانی کا — کیا بھروسہ ہے زندگانی کا

آج ہی آج کے دم سے ہے بہار ہستی
فکرِ فردا نہ کر، اندیشۂ انجام نہ کر

نہ چھیڑ اے زہدِ ناداں شراب پینے دے — شراب پینے دے خانہ خراب پینے دے

میں جانتا ہوں چھلکتا ہوا گناہ ہے یہ — تو اس گناہ کو بے احتساب پینے دے

مرے دماغ کی دنیا کا آفتاب ہے یہ — ملا کے برف میں یہ آفتاب پینے دے

اختر شیرانی کی غزلوں میں لذتوں کی بہرہ اندوزیوں کی تڑپ بھی ہے اور جسمانی آنچ بھی رومانی طرز فکر کو نمایاں کر دیتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہو:

اے ابر لے سنبھال ! کہ ہم ہاتھ سے چلے　　اے توبہ ! الوداع ' دن آئے بہار کے

زاہد کو زندگی ہی میں کوثر چکھا دیا
رندوں سے آج یہ بھی کرامات ہوگئی

شان میں مئے کی زاہد اس کے سوا میں کیا کہوں　　میرے لیے حلال ہے تیرے لیے حرام ہے

اختر شیرانی کی غزلوں میں عام فضا شگفتہ اور مترنم ہے لیکن نظموں کے مقابلے میں حزن و یاس کی فضا غزلوں میں زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نہ وہ عمر ہے نہ مسرتیں' نہ وہ عیش ہے نہ وہ عشرتیں　　نہ وہ آرزو نہ حسرتیں' نہ خوشی کا نام و نشاں رہا
نہ وہ رنگِ باغ جہاں رہا' نہ وہ کیفِ عمر جواں رہا　　نہ وہ ذوقِ بزم مغاں رہا' نہ وہ شوقِ عشق بتاں رہا
وہ نسیم صبح چمن نہیں ' وہ شمیم زلف سمن نہیں　　وہ نشاطِ باغ چمن نہیں' وہ کہاں رہیں یہ کہاں رہا

.....

تازہ بہ تازہ نو بہ نو' جلوہ بہ جلوہ چھائے جا　　پھولوں میں مسکرائے جا! تاروں میں جگمگائے جا
نہ تمہارا حسن جواں رہا' نہ ہمارا عشق جواں رہا　　نہ وہ تم رہے' نہ وہ ہم رہے' جو رہا تو غم کا سماں رہا

.....

مجھے ذوقِ باغ و چمن نہیں' مجھے شوقِ سرو و سمن نہیں　　میں کروں تو کیا کروں ہم نشیں' کہ نسیم صبح وطن نہیں

.....

دل مرا مقامِ غم ' غم کا مقام ہے جہاں　　نالۂ صبح ہے یہاں ' گریۂ شام ہے یہاں

اختر شیرانی کی غزلوں میں حسن و عشق' رند مشربی' مے پرستی' معاملہ بندی' حیات و کائنات کے مسائل' مظاہر فطرت کی حکمتوں اور زندگی کی پیچیدگیوں کے علاوہ یاس' افسردگی اور بے بسی بھی نمایاں ہوتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اختر شیرانی کی غزل گوئی کی خوبیاں بیان کیجیے۔
2. اختر شیرانی کی غزلوں میں خمریات کی نشاندہی کیجیے۔

24.5 اختر شیرانی کی نظم نگاری

اردو کے جمالیات پرست شاعر کی حیثیت سے اختر شیرانی نے نظم نگاری کو کئی نئے انداز سے پیش کیا ہے۔ ان کی نظم نگاری روایتی انداز کی نشاندہی کرتی ہے اور پابند نظم کے ذریعے انھوں نے شاعری کے جوہر دکھائے ہیں۔ حسن و عشق کی بھرپور تصویر کشی کے علاوہ اختر شیرانی کی نظموں میں تاریخی' سماجی' اصلاحی اور اخلاقی نظموں کی کمی نہیں۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے پسماندہ اور مظلوم طبقات سے ہمدردی اور مزدور پیشہ سے وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی سیاسی اور قومی نظموں میں سرمایہ دار طبقے کی مخالفت اور مجاہدین کے سرفروشانہ کارناموں کی حمایت نمایاں ہے۔ مناظر قدرت کی نمائندگی اور عورتوں اور بچوں کی حمایت میں ان کی نظم نگاری اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ بچوں کی نظموں کا مجموعہ ''پھولوں کے گیت'' لاہور سے 1936ء میں شائع ہوا۔ عورتوں اور بچوں کے لیے نظموں پر مشتمل مجموعہ ''نغمہ حرم'' مکتبہ اردو لاہور سے 1939ء میں شائع کیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر شیرانی کی نظمیں ہر موضوع کا احاطہ کرتی ہیں۔

24.5.1 مذہبی اور اخلاقی نظمیں

اختر شیرانی کی کلیات میں مذہبی اور اخلاقی نظموں کی کمی نہیں۔ چند مذہبی اور اخلاقی نظموں سے منتخب اشعار بطور نمونہ پیش ہیں

الٰہی مجھ کو ایسی نالہ سامانی عطا کردے — جو بزمِ دہر میں ہنگامۂ محشر بپا کردے
اگر تیرے سوا بھی مدعا ہوسکتا ہے کوئی — تو میرے دل کو یکسر بے نیاز مدعا کردے
سوادِ عالمِ حسرت میں ہوں گمراہ مدت سے — مرے پائے طلب کو اب تو منزل آشنا کردے

اس مناجات سے اختر شیرانی کی مذہبی میلان کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اختر شیرانی کے آخری دور کی شاعری میں مذہبی، اخلاقی اور سماجی عناصر زیادہ نظر آتے ہیں۔ زندگی کی ہزار تلخیوں کے نچوڑ کے ساتھ اپنی بے عملی کا اعتراف کرتے ہوئے اختر شیرانی لکھتے ہیں:

مسندِ عیش سے اٹھ، منزل پُرخار میں آ — بزم جم کو چھوڑ کے بزمِ رسن و دار میں آ
عشرتِ کوہ کنی سے نہیں واقف پرویز — کہدو یہ لطف اگر چاہے تو کہسار میں آ
تابکے بندگیِ ساغر و مینا اختر — اب کے اللہ کے بندے صفِ احرار میں آ

نصرتِ خداوندی پر اختر شیرانی کا کامل یقین بھی ان کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

اگرچہ راہ کٹھن ہے قدم بڑھائے چل — خدا کے آسرے سے آس تو لگائے چل
نہ ہار حوصلہ منزل بھی آنے والی ہے — نہ رو، نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے

اختر شیرانی کی مذہبی شاعری میں نعت کا تقدس بھی ملتا ہے۔ وہ نعت کے ذریعے جس عقیدت کا اظہار کرتے ہیں، اس کا اندازہ ملاحظہ ہو:

دنیائے ہست و بود کی زینت تمہیں سے ہے — اس باغ کی بہار کے ساماں تمہیں تو ہو
روشن ہے جس کی ضو سے شبستانِ زندگی — وہ ماہِ نیم، ماہ شبستاں تمہیں تو ہو
دنیا کی آرزوئیں، فنا آشنا ہیں سب — جو روحِ زندگی ہے، وہ ارماں تمہیں تو ہو
صبحِ ازل سے شامِ ابد تک ہے جس کا نور — وہ جلوہ زارِ حسنِ درخشاں تمہیں تو ہو
شادابیِ صنوبر و نسریں تمہیں سے ہے — بوئے گل و بہارِ گلستاں تمہیں تو ہو
اختر کو بے نوائیِ دنیا کی فکر کیا — ساماں طرازِ بے سرو ساماں تمہیں تو ہو

مذہبی منظومات کے علاوہ انھوں نے اخلاقی اقدار کو بھی نظموں میں پیش کیا ہے۔ وہ دنیا میں اخلاق، مروت، خلوص، محبت اور انسانیت جیسے اعلیٰ اقدار کی حکمرانی چاہتے ہیں۔ وہ انسانیت دوست ہیں۔ اعلیٰ اقدار کی پامالی پر وہ افسردہ ہوجاتے ہیں۔ ان کی نظم کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

ساز دہر سے جاری حرص کے ترانے ہیں — فسق کے فسانے ہیں
مٹ گیا ہے ہستی سے ذوقِ پاک دامانی — نقشِ کیف روحانی

انسان کی حیوانیت سے حیاتِ انسانی کی پامالی کا نقشہ بھی ان کی نظموں میں نمایاں ہوتا ہے ایک نظم کے چند اشعار پیش ہیں:

تمنائیں تڑپتی ہیں، جہاں معصوم روحوں کی — مرادیں تلملاتی ہیں جہاں مغموم روحوں کی
جہاں ہر سمت آفت ہے، مصیبت ہے اذیت ہے — یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنت ہے